قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جون 2018 قیمت ₹15

ماہنامہ

اُردو دُنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

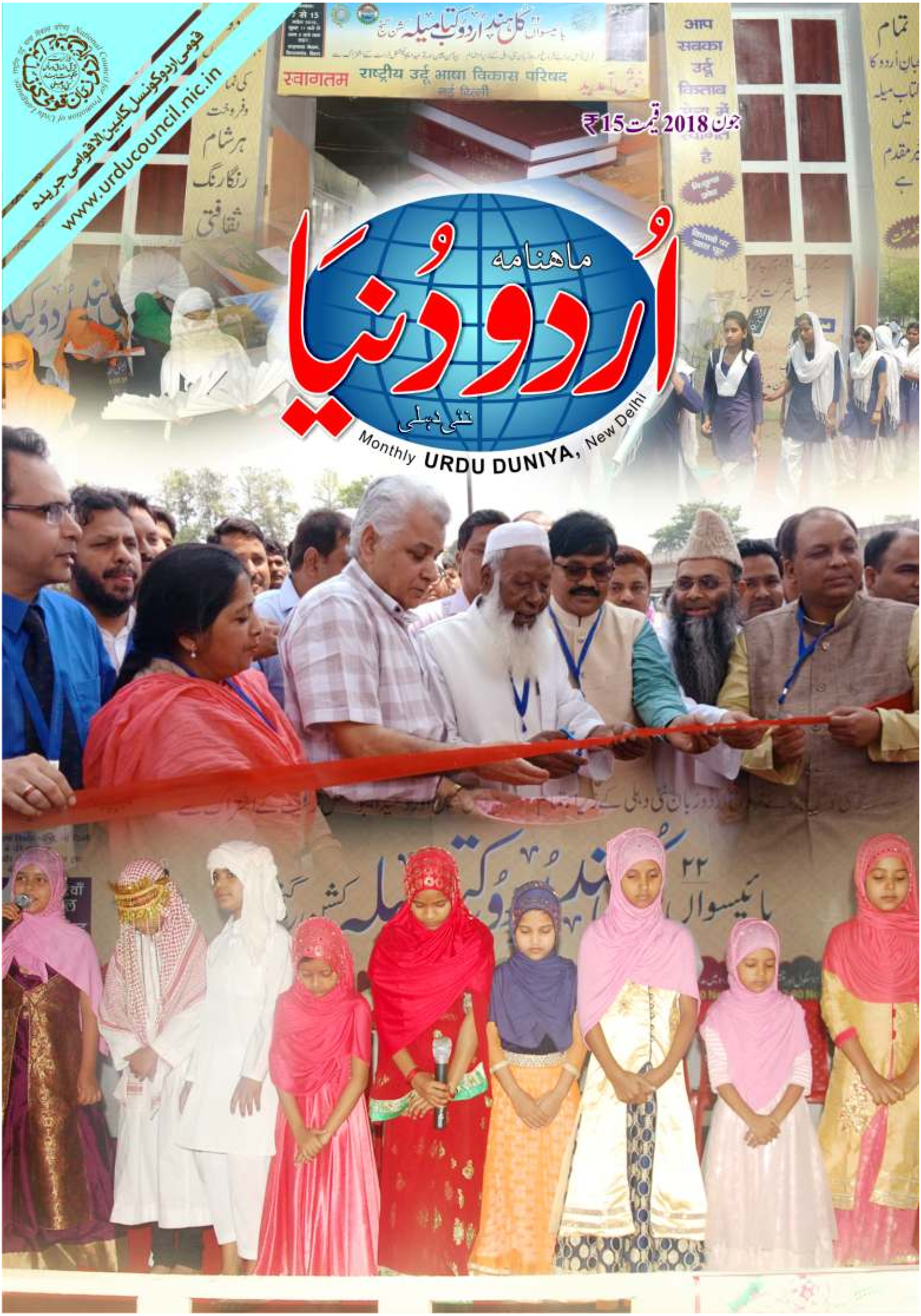

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

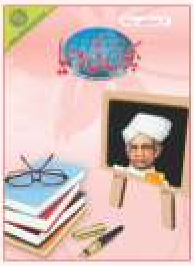

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ◆ اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

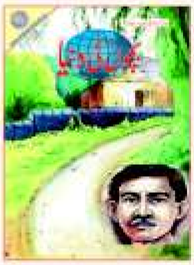

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:20، شمارہ:06، جون 2018

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-2441519

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

انٹرویو
ترجمہ سے اردو زبان و ادب کا دامن وسیع تر ہوا ہے: اسلم مرزا معین الدین عثمانی 7

رپورٹ
گلشن گنج کتاب میلہ توقیر راہی 11

جون کے جواہر
شبلی کی ہیئت پسندی سرسید تحریک کے تناظر میں ممتحنہ اختر 21
سیماب اکبرآبادی اردو کا ایک نظریہ ساز شاعر محمد کلام 25
خواجہ احمد عباس بحیثیت افسانہ نگار محمد شواق خان 27
امن و یکجہتی کا پیامبر: شمیم کرہانی قمر جہاں 31
بلونت سنگھ: رومان سے لے کر حقیقت نگاری تک ثاقب انور 34
وہاب اشرفی کے ادبی کارنامے فہیم اشرف 37
فکشن تنقید کا سپہ سالار: وارث علوی آس محمد صدیقی 39

نقد و نگاہ
غالب کی ایک اردو غزل فارسی ادب کے تناظر میں مہتاب جہاں 42
مرتضیٰ اظہر رضوی: مرثیہ گوئی کی فلسفیانہ روایت فرحت نادر رضوی 44
آگرہ بازار تجمل بلہ پوری 46

زکی کیفی اور ان کی شعری کیفیات ندیم احمد انصاری 49
علامتی افسانہ: تخلیقی مضمرات ریاض توحیدی 52

ماحولیات اور ادب
اردو افسانہ میں پانی کی قلت کا مسئلہ سید احمد قادری 55
ماحولیات کا تحفظ اور ہماری ذمے داری پرویز اشرفی 59
گلوبل وارمنگ اور اس کے نتائج ساجدہ شروانی 61

شخصیت
اندھیروں کو مات دینے والی ہیلن کیلر سید نوشاد بیگم محمود 63

دیگر زبانوں سے
اندھیرے کا دھواں مترجم محمود عالم صدیقی 65

سائنس / ٹیکنالوجی
اردو مشینی ترجمے کا آغاز و ارتقا اے ایم کے صدیقی 67
جھوٹ کی تفتیش نسیم سعید 70

کمپیوٹر
نوٹ پیڈ 72

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ ادارہ 77

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں ادارہ 86

ہماری بات

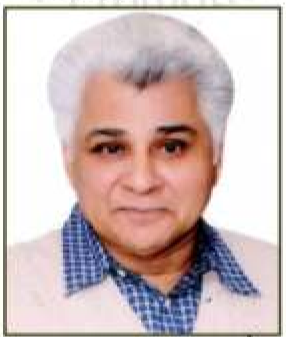

صلاحیتیں اور ذہانتیں صرف چند مراکز یا دبستانوں تک ہی محدود نہیں ہوتی ہیں بلکہ ان علاقوں میں بھی صلاحیتوں اور ذہانتوں کی کمی نہیں ہے جن کے پاس وسائل اور مواقع نہیں ہیں۔ پیدائشی صلاحیت تو ہر انسان میں ہوتی ہے۔ حالات اور مواقع ان کی صلاحیتوں کو سمت اور رفتار دیتے ہیں۔ جہاں تک مراکز اور دبستانوں کا تعلق ہے تو وہاں تخلیقی صلاحیتوں کے نکھارنے کے لامحدود ذرائع ہیں۔ بہت سے پلیٹ فارم ہیں جہاں صلاحیتوں کے مظاہرے کا مکمل موقع ملتا ہے۔ مگر ہندوستان میں کچھ ایسے پسماندہ علاقے بھی ہیں جہاں کے افراد میں بے پناہ صلاحیتیں تو ہیں مگر ان صلاحیتوں کی تراش وخراش کے مواقع کم ملتے ہیں جس کی وجہ سے یہ صلاحیتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ خاص طور پر دیہی علاقوں کے بچوں میں ذہانتیں اور صلاحیتیں بھی ہیں، وہ مختلف میدانوں میں اچھا کام بھی کر سکتے ہیں۔ مگر مواقع اور وسائل کی کمی کی وجہ سے ان کی صلاحیتیں نکھر نہیں پاتیں۔ یہ بہت ہی المناک صورت ہے کہ نہ تو ہم ان صلاحیتوں کی جستجو کر پاتے ہیں اور نہ ہی انھیں ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج بیرونِ ممالک میں بہت سی ایسی تنظیمیں اور ادارے ہیں جہاں مخفی صلاحیتوں کو ابھارنے کی نہ صرف کوشش کی جاتی ہے بلکہ ان کے لیے بہتر انتظامات اور مواقع بھی پیدا کیے جاتے ہیں۔ ان کے جذبات، احساسات اور صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے لیے نئے تکنیکی وسائل کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ ان کے ذوق کے مطابق مختلف سطحوں پر مقابلوں کا انعقاد ہوتا ہے اور انھیں عوامی پلیٹ فارم بھی دیا جاتا ہے۔ ان کے اندر ترسیلی مہارت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انھیں ہر طرح کا تعاون دیا جاتا ہے تاکہ ان کے اندر کی صلاحیتیں سامنے آئیں۔ ہندوستان میں بھی بہت سے علاقے ایسے ہوں گے جہاں صلاحیتیں موجود ہیں مگر انفراسٹرکچر کی کمی کی وجہ سے ان صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس ذیل میں ان دیہی علاقوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے جہاں کے بچوں میں صلاحیتیں تو ہیں مگر وہ مراکز اور دیگر وسائل سے دور ہونے کی وجہ سے اپنے فن کا مظاہرہ نہیں کر پاتے۔ آج ضرورت ہے کہ ایسی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے، انھیں پلیٹ فارم اور مواقع دیے جائیں، ان کے لیے مباحثے اور مذاکرے کا انعقاد ہو، جس فن یا آرٹ میں ان کی دلچسپی ہو، اس کے متعلق ان کی صحیح تربیت کی جائے تو یقینی طور پر یہ صلاحیتیں سامنے آئیں گی اور ہندوستانی آرٹ اور فن کو ایک ارتقائی صورت بھی میسر ہوگی۔ جن علاقوں میں یہ چھپی ہوئی صلاحیتیں موجود ہیں ان علاقوں کے افراد متحرک ہوں اور وہاں کی تنظیمیں اور ادارے صلاحیتوں کو نکھارنے کے لیے پروگراموں کا انعقاد کریں، ان کی حوصلہ افزائی کریں اور ان کے اندر چھپے ہوئے فنکار کو باہر نکالنے کی کوشش کریں، تو یہ بہت ہی مفید کام ہوگا۔ اردو کی تنظیموں اور ادارے بھی سرگرم ہوں تو اردو سے جڑے ہوئے طلبا کی صلاحیتیں بھی سامنے آئیں گی۔

قومی اردو کونسل مختلف علاقوں میں کتاب میلے اور دیگر ثقافتی پروگراموں کا انعقاد کرتی رہی ہے جس میں شمولیت زیادہ تر علاقائی افراد اور بچوں کی ہوتی ہے تو اس کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے کہ علاقائی سطح پر جو صلاحیتیں ہیں انھیں نکھرنے کا موقع ملے۔ ان کے آرٹ اور فن کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر صحیح طور پر ان کی تراش خراش اور تربیت کی جائے تو یہی افراد اور بچے آگے چل کر مختلف میدانوں میں اپنی ہنرمندی اور فنکاری سے ملک کا نام روشن کر سکتے ہیں۔ شہری علاقوں میں تو اس طرح کے بہت سے ادبی وثقافتی پروگرام ہوتے رہتے ہیں مگر ہمیں دیہی علاقوں میں چھپی ہوئی صلاحیتوں اور ذہانتوں کی جستجو کرنی چاہیے کہ ان کے اندر بھی ذہانتوں اور صلاحیتوں کا خزانہ ہے بس ذرا اسے نکھارنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس سطح پر سنجیدگی سے کام کیا جائے تو اس کے بہت مفید نتائج برآمد ہوں گے۔ ہندوستان کا بیشتر حصہ دیہات میں بستا ہے اس لیے ہمیں دیہی علاقوں پر مرکوز اس طرح کے پروگرام مرتب کرنے چاہئیں تاکہ ہم ان صلاحیتوں کو شہروں اور مراکز سے متعارف کرا سکیں اور اس طرح دیہی علاقوں کا مرکز سے رشتہ قائم ہوگا تو صورت حال میں بہت حد تک تبدیلی آسکتی ہے۔ ہمیں شہروں میں محصور رہ کر دیہی علاقوں کے لعل وگہر کو نظرانداز کرنے کی روش کو ختم کرنا ہوگا تبھی ہم ان چھپی ہوئی صلاحیتوں کے ذریعے اپنے ملک کی تعمیر وترقی میں نمایاں کردار ادا کر پائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے ارباب فکر ونظر اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کریں گے اور یقیناً اس غور وفکر کا جو نتیجہ ہوگا وہ ہمارے پورے ملک کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہوگا!

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

ماہ مئی کا شمارہ نہایت خوبصورت تصاویر سے آراستہ وجاذب نظر ہے۔ یوسف رامپوری صاحب کا لوک ادب کے تحفظ و بازیافت سے متعلق مضمون ازحد معلوماتی ہے۔ ادب کی یہ صنف ہمیشہ سماجی واقعات کے حقائق کے ضمن میں صحیح ہوا کرتی ہیں۔ اختر شیرانی صاحب کی شاعری کا رومانیت کے زاویے سے تجزیہ وتنقید بھی قابلِ مدح ہے۔

صفحہ 42 پر درج شعر میں 'بہار آنے' الفاظ میں بموجب ردیف 'آئے' فعل درکار تھا۔ مزید، اسی صفحہ پر درج دوسرے شعر کے تحت 'کم خواب فارسی زبان کے اس صفت لفظ کا تصرف یکسر غلط ہوا ہے اور بیشتر ادبا یہی غلطی کرتے رہتے ہیں۔ محمد مصطفی خاں مدح کے موقر 'اردو ہندی شبد کوش' کے ص 100 پر اس لفظ کا یہ معنی درج ہے ''کم سونے والا (شخص) جبکہ فارسی زبان کے ہی اسم مذکر لفظ کا صحیح املا ہے 'کمخاب'۔ معنی 'ایک طرح کا بیش قیمت کپڑا۔'' یہ کپڑا سونے اور چاندی کے تاروں سے بنا ہوتا ہے۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' اپریل کا شمارہ بھی کونسل سے شائع دیگر 3 مجلوں کے ساتھ دستیاب ہوا ہے۔ اس شمارے میں جناب انیس امروہی کا مضمون مشہور فلمی اداکار بلراج ساہنی کی سوانح حیات، فلمی وڈرامائی کارکردگیوں کو بخوبی نشان زد کرتا ہے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر ناشر نقوی کا وقیع مضمون لائقِ ستائش ہے۔ سکھ مذہب کے لاکھوں لوگوں کو 'جپ جی صاحب' کا مول منتر زبان زد رہا ہے۔ لہٰذا اس کا متن لفظ بہ لفظ صحیح ہونا چاہیے۔ صفحہ 43 پر اول سطر میں منتر 'اک اونکار' الفاظ سے شروع ہونا چاہیے تھا۔ آگے بھی 'سے بھنگ گر پرشاد' کی بجائے 'سے بھم گر پرساد' صحیح ہے۔ اگلے ص 44 پر اول کالم میں 3 بار 'ن' لفظ کی بجائے 'نہ' لفظ درکار تھا۔ اس سے نیچے آخری سطر کے تحت 'جے وڈ' کی جگہ 'جے وڈ' الفاظ درکار تھا۔ عربی لفظ 'رسم' مونث اسم کی جمع 'رسوم' ہے اور اس لفظ کا 'رسومات' (ص 44) تحریر کرنا

درست نہیں ہے۔ مزید فارسی لفظ 'پروا' کا املا 'پرواہ' لکھنا بھی عجلت میں چلا گیا لگتا ہے۔ بہ ایں ہمہ ان چند اغلاط کی درگزری کریں تو یہ ایک معیاری واحسن مقالہ گردانا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر سی اقبال کا مضمون علامہ اقبال کی شاعری کو ماحولیاتی شعور کے نئے زاویے سے پیش کرنے میں قابل مدح ہے۔ اس میں ص 33 کے اول کالم میں 'سمندروں اور ساگروں' ان مترادف الفاظ کا استعمال کرنا بھی متنازع فیہ ہے۔ دیگر ادبا کو بھی ایسے مترادف الفاظ کے تصرف کا دفاع کرنا بھی ناگزیر ٹھہرتا ہے۔

جناب ندیم رائی مرادآبادی نے اپنے شہر کو دنیا بھر میں مقبولیت دلانے والے شہرۂ آفاق شاعر جگر صاحب کی شاعری کے اہم نکات کو کوزے میں سمندر 'مقید کرنے کے ضرب المثل اپنے مقالے میں نشان زد کیا ہے۔ ص 39 پر 'دل میں کسی کی...' فقرے کو 'دل میں کسی کے...' ہونا چاہیے تھا۔ آخر میں 'ہمارے لیے' 'تبرک' نہیں ہے'' اس فقرے کی درستگی بھی صحیح نہیں لگتی ہے اورنگ آباد سے متواتر شائع ہو رہے ایک موقر اردو جریدے کے مدیر، ادیب و ناقد یوسف صابر صاحب نے نہ جانے کیوں ہندی اور پنجابی زبانوں کے بلند پایہ و مایہ ناز کوی اور سنت کبیر داس کو فقط اردو زبان تک ہی محدود کرنے کی سعی کی ہے؟ ویسے ان کا مقالہ بھی دیگر تمام تر مقالوں کی ہی مانند ایک اعلیٰ وبلند پایہ تنقیدی وتحقیقی تحریر کہی جائے گی۔

٭ **ڈاکٹر کرشن بھاوک** : کوٹھی نمبر A-201، گوردوا نگ، پٹیالہ

مکتوب نگار کے لیے رسائل و جرائد کے مدیران حضرات کو مکتوب رقم کرتے وقت اداریہ کی بابت دو چند باتوں کا ذکر دیانتی نقطۂ نظر سے ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ مدیر کا محنت اور لگن سے لکھا گیا اداریہ کسی بھی شمارے کا صدر دروازہ ہوا کرتا ہے، داخل مکان کے وقت آنے والے کو اگر دروازے پر دلکش وولپزیر خوشبو کا احساس ہوگا تو مختصر ہی سہی آنے والا اس کا ذکر خیر کرے گا، سال 2018 کے اپریل کے اردو دنیا کا اداریہ بھی بیحد خوشبودار، معطر، معلوماتی نیز مبنی برحقیقت ہے۔ حکومت ہند اردو کے فروغ کے لیے قابل ستائش ہے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان محض ایک فعال ادارہ نہیں بلکہ یہ ایک ادبی، لسانی، تہذیبی اور تکنیکی دنیا کا تحریری، تاریخ ساز اور دستاویزی کارخانہ ہے جس کا موضوعاتی پروڈکشن تاقیامت کارآمد ثابت ہوتا رہے گا، اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی کسی کا قدم کسی ادارے کے لیے انتہائی سعد ثابت ہوتا ہے اور یہ سعادت این سی پی یو ایل کے تعلق سے پروفیسر سید علی کریم المعروف ارتضیٰ کریم صاحب کے حصے میں بھی آئی ہے ناچیز شکیل سہسرامی موصوف کو صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہے۔ محبوب خاں اصغر صاحب کی مضطر مجاز صاحب سے کی گئی گفتگو ازحد معلومات افزا اور دل پذیر ہے۔ شعیب رضا فاطمی صاحب اور کریم صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ بے نظیر

شخصیت ایس خاں پٹھان سے اردو دنیا کو روشناس کرایا میں اس کے لیے اردو دنیا شکریہ ادا کرتا ہوں اور التماس گزار ہوں کہ جب تک یہ سلسلہ چل سکے ضرور چلایا جائے کیونکہ رئیس خان پٹھان صاحب صرف محسن اردو نہیں ہیں بلکہ یہ اردو کے کسان ہیں موصوف کو حق پسند اداروں کی طرف سے بڑے سے بڑا اعزاز ملنا چاہیے۔

❖ **شکیل سہسرامی**: پٹنہ، بہار

شمارہ اپریل 2018 کا شمارہ مع سرورق پر تینوں رسالوں کی سرورق کی تصویر شائع ہوئی ہے قاری و ناظر کو دیکھتے ہی سمجھ میں آجائے گا کہ NCPUL چار رسالے شائع کررہا ہے۔ ہماری بات میں مدیر نے دانش مندی، ادبی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے اردو اداروں کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ زبان و ادب کے فروغ میں کردار کو موضوع بحث بنایا ہے۔ قومی اردو کونسل اردو داں طبقے میں کمپیوٹر کی تعلیم عام کررہا ہے۔ اس کے کئی مراکز ملک میں قائم ہیں۔ اردو عوام NCPUL کی خدمات سے بھرپور استفادہ کریں خاص کر طلبہ کا طبقہ اپنا مستقبل سنوار سکتا ہے بہ شرط کہ وہ ایک اشاعتی مواد سے استفادہ کرسکیں۔ مظفر مجاز کا انٹرویو ادبی اور شعری معلومات سے مزین ہے۔ انھوں نے حقائق کا اظہار کردیا ہے۔ دوٹوک بے باک کہہ دیتے ہیں۔ آپ اردو کے خاموش خدمت گزار ہیں۔ محمد غلام ربانی نے نصرتی کی شاعری خاص کر مثنویوں کا اچھا تجزیہ ومحاکمہ پیش کیا ہے۔ مظفر حسین سید نے سرسید احمد کو بہ حیثیت افسانہ نگار ظاہر کرنے کے لیے مختلف دلیلیں پیش کی ہیں اور ان کے مضمون گزرا ہوا زمانے کو افسانہ ثابت کرنے کے لیے تکنیکی انداز سے بحث کی ہے اس کے دلائل ان کے مضمون سے پیش کیے ہیں۔ ادبی دانش وروں کے لیے اتنی بات ہے اس پر غور کریں۔ اردو ناول کا سفر میں ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر آج تک مختلف ناول نگاروں کا تعارف اور ان کے ناولوں کا محاکمہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ معلومات سے بھرپور مضمون ہے۔ سلیمان اریب اب تک ادبی حلقوں میں صحافی اور نثر نگار کی حیثیت سے مقبول تھے لیکن اردو دنیا کا یہ مضمون انھیں شاعر بھی تسلیم کرواتا ہے۔

❖ **ڈاکٹر محمد ناظم علی**: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، تلنگانہ

اپریل کا شمارہ ملا۔ ایک ہی نشست میں پورا پرچہ پڑھ گیا۔ سارے مضامین اچھے ہیں۔ جگر پر ندیم راعی مرادآبادی کا مضمون اچھا ہے۔ 'اقبال کی ایک مغالطہ آمیز

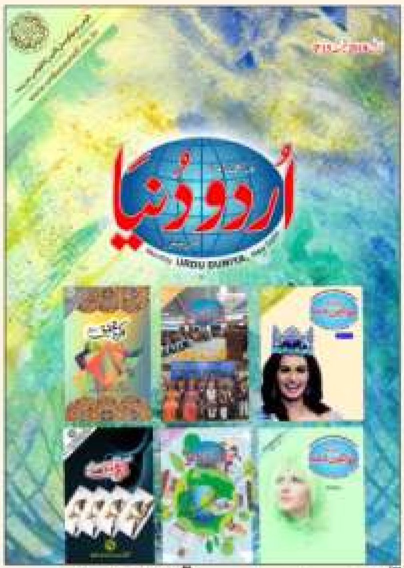

تلمیح' میں جمال عبدالواجد نے تحقیق کا حق ادا کردیا ہے جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ بلراج ساہنی کے حوالے سے انیس امروہوی نے اچھی گفتگو کی ہے۔ ساری تحریروں نے متاثر کیا ہے۔

❖ **محمد فاروق ...... عثمانی**:......

'اردو دنیا' اپریل کے شمارے میں ندیم راعی کا مضمون جگر کا سدابہار غزلیہ سفر نظر نواز ہوا، اس کے آخر میں انھوں نے جگر کے انتقال اور تدفین کا ذکر کیا ہے جو حقیقت سے دور ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں کہ جب جگر کے انتقال کی خبر لکھنؤ پہنچی تو خیال تھا کہ ان کے پرستاروں کا ایک ہجوم گونڈہ پہنچ جائے گا مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے صرف وہ (علی میاں) مفتی رضا انصاری اور محکمہ اطلاعات کے ایک افسر صبغت اللہ انصاری کے علاوہ کوئی نہیں آیا۔ نماز جنازہ کے لیے مولانا کا انتظار تھا چنانچہ مفتی رضا انصاری نے نماز جنازہ پڑھائی اور چند مقامی لوگوں کی موجودگی میں تدفین عمل میں آئی۔ ملک میں صف ماتم تو دور کی بات گونڈہ میں ہی انھیں نظر انداز کردیا گیا۔

❖ **شارق علوی**، C-8، وگیانپوری، ماہ نگر، لکھنؤ، یوپی

رسالوں کا معیار ان کے مشمولات کی وجہ سے قائم ہوتا ہے اور 'اردو دنیا' کا اپنا ایک معیار ہے۔ اپریل 2017 کا شمارہ آن لائن پڑھنے کا اتفاق ہوا، بھی مشمولات عمدہ اور لائق توجہ ہیں، البتہ زاہدہ خاتون شیروانیہ سے متعلق ایک مضمون نظر سے گزرا جس میں واضح طور پر کچھ غلطیاں ہوئیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ "ز۔خ۔ش حیات وشاعری کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ" یہ تحقیقی کام اسلم فرخی کی نگرانی میں پاکستان کی شاعرہ فاطمہ حسن کا ہے نہ کہ انیس فاطمہ کا، جس صفحہ پر یہ مضمون شائع ہوا ہے اسی صفحہ پر ادارہ نے ز۔خ۔ش سے متعلق کتابیں چھپاں کی ہے اس میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے۔ دوسری بات 'نکتہ راز' کو شان الحق حقی کا مضمون کہا گیا ہے اور انیسہ ہارون شیروانیہ کی کتاب 'حیات ز خ ش' میں اس مضمون کی شمولیت کی بات کہی گئی ہے جو کہ درست نہیں 'نکتۂ راز' شان الحق حقی کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں ز خ ش سے متعلق مضمون شامل ہے اور اسی مضمون کے نیچے اس کا سن اشاعت 1958 درج ہے۔

❖ **عاتکہ ماہین**: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، یوپی

مارچ کے شمارے میں بہت ساری دلچسپ باتیں ہیں مثلاً 'ہماری بات' میں عبارت ملاحظہ فرمائیں ''پرانے زمانے میں اسی مقصد کے تحت بہت سی لائبریریوں کا قیام عمل میں آیا تھا اور ان لائبریریوں نے سماجی، تعلیمی بیداری پیدا کرنے میں اہم کردار بھی ادا کیا ہے مگر وہ کتب خانے اور لائبریریاں اب دم توڑ رہی ہیں۔ ایسے میں ضرورت ہے کہ ان لائبریریوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے اور انھیں تمام وسائل مہیا کرائے جائیں تاکہ ان لائبریریوں کی وجہ سے ہندوستان میں شائع ہونے والی کتابیں اور رسائل وہاں تک پہنچیں اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاسکیں۔''

درج بالا الفاظ نقل کرنے کے بعد مجھے یہ کہنا ہے کہ طلبہ کے مطالعے کے لیے جو اور جتنی کتابوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہ دکانوں سے خریدنا اور پبلشروں سے بلانا محال ہے۔ اردو کی کتابوں کے لیے اردو کتاب میلہ ایک اچھا وسیلہ ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ طلبہ اپنے اساتذہ یا سرپرستوں کے ساتھ 'اردو کتاب میلہ' میں دور جانا ہو تو اسکول کی پڑھائی کے دوران جا نہیں سکتے۔ جہاں تک میرا خیال ہے شاید چھٹیوں میں اردو میلوں کا انعقاد نہیں ہوتا۔ شخصیت معتبر ہو یا باوقار شعر کا عمدہ ہونا فن سخنوری کے شعری محاسن پر منحصر ہے، شعر کہنے والے کے پی ایچ ڈی یا ایم بی بی ایس ہونے پر نہیں۔ واجدہ تبسم فکشن نگاری کا ایک عمدہ اور عظیم نام ہے۔ کل ہند مشاعرہ کی روداد میں یہ دو شعر پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔

مختلف مذہب کے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں
ایک ملک ہے ایسا جس کو ہند کہتے ہیں
تمھارے آنے کی دن بھر تو آس رہتی ہے
پھر اس کے بعد طبیعت اداس رہتی ہے

(سریندر شجر)

❖ **اشفاق کارنجوی**: جی این آزاد اردو ہائی اسکول، مہاراشٹر

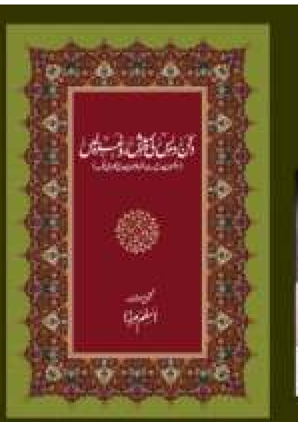

معین الدین عثمانی

ترجمے سے اردو زبان و ادب کا دامن وسیع تر ہوا ہے: اسلم مرزا

معین الدین عثمانی: خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ بتائیے۔

اسلم مرزا: ہمارا خاندان تقریباً تین سو برس سے احمد نگر (مہاراشٹر) میں آباد ہے۔ میرے اجداد ایرانی النسل سپاہی اور تجارت پیشہ تھے۔ خاندانی شجرہ اور سینہ بہ سینہ چلی آرہی روایات کے مطابق مرزا ہاشم بیگ، ایران سے اپنے قبیلے کے ساتھ پنجاب اور اطراف کے علاقوں میں آباد ہوگئے تھے۔ یہ فوجی ملازمتوں میں تھے۔ ان کی اولادوں میں سے ایک مرزا منوچہر بیگ نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں مالوہ آکر مراٹھا سردار دولت راؤ شندے کی ملازمت اختیار کی تھی اور اس کی افواج کے ساتھ احمد نگر (دکن) آئے۔ دولت راؤ شندے نے ان کی کارگزاریوں سے خوش ہوکر احمد نگر کے محلہ بیلداران (اب یہ بیلدار گلی کے نام سے معروف ہے) میں ایک چھوٹی حویلی وسیع و عریض 'باڑے' کے ساتھ عطا کی تھی جہاں مرزا منوچہر بیگ اپنے قبیلے کے ساتھ رہائش پذیر ہوئے۔ مرزا منوچہر بیگ کی چوتھی پشت میں میرے دادا حاجی مرزا احمد بیگ ہیں جو 1885 میں پیدا ہوئے۔ میرے والد کیپٹن مرزا محمد اسماعیل کی پیدائش محلہ بیلداران کی اسی حویلی میں 1916 میں ہوئی تھی۔ اس کے چند برسوں بعد بعض ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے یہ پشتینی جائیداد ہمارے خاندان کے ہاتھوں سے نکل گئی اور یہ 'مرزایان ایران' رہائش کی تلاش میں پراگندہ ہوگئے۔ لیکن میرے دادا نے چند برسوں بعد اسی محلے میں اپنی ذاتی آمدنی سے ایک مکان خریدا اور اپنی اولاد کے ساتھ یہاں رہنے لگے۔ یہ مکان اب میرے چچا ایڈوکیٹ مرزا عبدالعزیز بیگ کے حصے میں دیا گیا جہاں ہم سب جاتے رہتے ہیں۔

م ع: زبان و ادب سے قربت کیسے میسر آئی؟

اسلم مرزا: دراصل ہمارے گھر کے اکثر و بیشتر مرد اور خواتین تعلیم یافتہ رہے ہیں۔ دادا مرحوم عربی، فارسی، اردو اور مراٹھی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ انھیں مطالعے کا بھی شوق تھا اور باقاعدگی سے 'مولوی'، 'دین و دنیا' اور 'آستانہ' وغیرہ رسالے خریدتے تھے۔ بیلدار گلی کے اس مکان کی ایک دیوار میں دو چوبی الماریاں بنی ہوئی تھیں جن میں دادا کی کتابیں رکھی رہتی تھیں۔ مکان کی چھت، اس زمانے کے مطابق چوبی شہتیروں پر مٹی اور اس کا 'گلاوہ' کرکے بنائی جاتی تھیں۔ بارش کا پانی دیواروں میں اتر آتا تھا۔ آہستہ آہستہ الماری میں رکھی کتابیں سیلن کی وجہ سے خستہ ہوگئیں، پھر کچھ عرصے بعد دیمک کی مہربانی سے بے شمار کتابیں ضائع ہوگئیں۔ میرے حصے میں 5 کتابیں آئی ہیں، ان میں زیادہ تر مطبع نولکشور لکھنؤ کی ہیں۔ جیسے مولانا رومی کی مثنوی کا اولین منظوم ترجمہ 'مثنوی پیراہن یوسفی'، واقدی کی 'فتوح الشام' کا اردو ترجمہ جو 1886 اور 1890 کے درمیان شائع ہوئی تھیں۔ سعدی کی 'گلستان' کا ایک قلمی نسخہ بھی ہے۔ دادا حضرت ایک اچھے قاری، نعت اور مرثیہ خواں کی حیثیت سے شہر اور مضافات میں مشہور تھے۔ میرے والد مرحوم کو بھی شعر و سخن کا نہایت ستھرا ذوق تھا۔ وہ اپنی مترنم آواز میں اساتذہ کا کلام سناتے تھے۔ انھیں ڈراموں کا شوق تھا۔ اداکاری اور ہدایت کاری بھی کرتے۔ والد صاحب اور ان کے ہم عصر دوستوں نے مل کر ایک ڈرامہ کمپنی قائم کی تھی جس نے احمد نگر، پونے اور دیگر مقامات پر آغا حشر کے لکھے تین تین گھنٹوں کے ڈرامے اسٹیج کیے تھے۔ فوج کی ملازمت کے دوران بھی جہاں جہاں ان کی پوسٹنگ ہوتی وہاں وہاں انھوں نے ڈرامے ترتیب دے کر پیش کیے۔ میرے ماموں اسماعیل قیصر شاعر تھے۔ ماہنامہ شاعر، پیام مشرق، نگار، شاہراہ، بیسویں صدی اور شمع وغیرہ باقاعدگی سے خریدتے تھے۔ بچوں کے لیے 'کھلونا' آتا تھا۔ 1953 میں والد صاحب نے میرے نام 'فوجی اخبار' نامی رسالہ جاری کیا تھا۔ میں بھی اپنے بڑوں کی تقلید میں تمام رسائل پڑھتا تھا۔ یعنی کم عمری سے زبان و ادب سے رشتہ استوار ہوا۔ کیا سمجھتے تھے یہ مت پوچھیے، بس پڑھنے سے سروکار تھا۔ میرے ماموں کا رسم الخط بہت اچھا تھا، انھوں نے مکان کی چھت، جن بڑی بڑی شہتیروں پر کھڑی تھی (ان کو ہم 'ناٹ' کہتے تھے) ان پر چاک سے غالب، اقبال، امیر مینائی، جلیل مانکپوری، سیماب اکبرآبادی اور دیگر شعرا کے اشعار بڑے بڑے حروف میں لکھ رکھے تھے۔ ہم سب بچے اکثر چلتے پھرتے یہ اشعار پڑھتے رہتے تھے۔ شاید تیسری یا چوتھی جماعت تک پہنچتے پہنچتے وہ تمام اشعار مجھے یاد ہوگئے تھے اور اب تک یاد ہیں۔ پرائمری اسکول میں جو تقریبات منعقد ہوا کرتی تھیں، اس کے لیے میں ماموں سے موقع محل کی مناسبت سے نظمیں لکھوا لیتا تھا اور انھیں یاد کرتا، ماموں پڑھوا کر سنتے، پھر اس زمانے کے مشہور فلمی گیتوں کی دھنوں پر وہ نظمیں اسکول کے پروگرام میں گاتا تھا۔ دادا اکثر و بیشتر اپنی گفتگو میں فارسی

اور اردو کے اشعار برمحل استعمال کرتے جنھیں بار ہا سننے کی وجہ سے وہ بھی میرے حافظے کا حصہ بنتے گئے۔ ہمارے گھرانے میں شادیوں کے مواقعوں پر والدصاحب مشاعروں کا اہتمام کرتے تھے۔ بمبئی، مالے گاؤں اور پونے سے شعرا حضرات کو مدعو کیا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان میں ادیب مالیگانوی، منیر الہ آبادی، محشر احمد نگری نے شرکت کی تھی۔ والدصاحب قوالی کی محفلیں بھی منعقد کرتے، جس میں ہمیشہ ماسٹر حبیب نظامی موجود رہتے۔ گھر میں برپا ہونے والی ان تمام محفلوں میں میں شریک رہتا تھا۔ 1956-57 میں ہمارے محلے میں احمد نگر کی ناگوری مسلم مسگر جماعت ٹرسٹ نے ایک لائبریری شروع کی تھی۔ یہاں ایک مفت دارالمطالعہ بھی تھا جہاں ہندوستان کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والے کئی رسائل اور اخبارات آتے تھے۔ میں اس کتب خانے کا رکن تھا۔ پہلے اردو رسائل اور پھر آہستہ آہستہ ناول پڑھنا شروع کیے۔ ہم خیال دوستوں کی صحبت میں شاعری سے رغبت ہوئی تو تک بندی کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد باقاعدہ شاعری شروع ہوئی۔ آٹھویں، نویں جماعت میں مَیں نے مضامین اور کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ یہ ممبئی سے شائع ہونے والے اخبارات میں بچوں کے لیے مختص ہفتہ واری صفحات میں شامل رہتے تھے۔ یہ سب حالات تھے اور بھی ہیں جن کی وجہ سے زبان و ادب سے قربت میسر آئی۔ پرائمری اسکول اور ہائی اسکول کے اساتذہ کا بھی بڑا حصہ تھا جنھوں نے مجھے صحیح اردو لکھنے پڑھنے اور بولنے کی تربیت دی۔ عمدہ ادبی کتابیں مہیا کیں اور میری رہنمائی کی۔ اس طرح زبان وادب سے قربت ہوئی۔

م ع: دکن کے تہذیبی رویے کے آپ کی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

اسلم مرزا: نظام شاہی سلطنت کے پہلے فرماں روا احمد شاہ بحری نے 1490 میں احمد نگر شہر کی بنیاد رکھی۔ یہ ایک بڑی سلطنت تھی۔ یہاں ایران، توران، خراسان، عربستان، افغانستان اور دیگر ممالک کے بے شمار سنی اور شیعہ خاندان آکر آباد ہوئے۔ بقول مورخ فرشتہ احمد نگر اس وقت بغداد اور مصر کی ہمسری کررہا تھا۔ نظام شاہوں کا تعمیر کردہ قلعہ، شاندار مساجد، محلات، مقابر اور باغات سے یہ شہر مزین رہا ہے، لیکن اب کھنڈرات کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ نظام شاہی سلطنت کے عہد میں دکنی شعر و ادب کے اولین شاہکار جیسے اشرف بیابانی کی رثائی مثنوی 'نوسرہار'، حسن شوقی کی رزمیہ 'فتح نامہ نظام شاہ' اور شوقی نیز خواجہ دہدار فانی کی غزلیں آج بھی موجود ہیں۔ نظام شاہی سلطنت کا علاقہ چونکہ مراٹھی بولنے والوں کا علاقہ تھا اس لیے یہاں سنسکرت اور مراٹھی کے سنتوں اور عالموں کا بھی غلغلہ رہا ہے۔ نظام شاہی سلطنت ہند، لمانی تہذیب کا خوبصورت نمونہ تھی۔ 1490 عیسوی میں قائم ہوئی یہ سلطنت 1635 میں مغلوں کی مسلسل یورش کے باعث اپنے اختتام کو پہنچی۔ چونکہ نظام شاہی سلطنت کے کم وبیش تمام بادشاہ اہل تشیع تھے اس لیے یہاں شیعیت کا اثر زیادہ رہا۔ محرم میں تعزیہ داری ہوتی۔ فارسی اور دکنی میں مرثیہ نگاری ہوتی۔ ایک طویل عرصے تک یہاں کے عوام پر ایرانی اور تورانی تہذیب کے اثرات رہے، جن میں ان کی بود و باش، لباس، رہن سہن، خورد ونوش وغیرہ کے ساتھ ساتھ شعروادب بھی شامل ہیں۔ یہاں ہندو اور اسلامی تہذیب ساتھ ساتھ پروان چڑھتی رہی۔ میرے دادا، والد اور دیگر رشتہ دار شیروانی زیب تن کرتے، صافہ باندھتے۔ سروں پر مختلف اقسام کی ٹوپیاں پہننا لازمی تھا۔ ہمارے گھر کی خواتین شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں دکنی گیت بڑے چاؤ سے گاتی تھیں۔ ہم تمام بچے بھی بغیر ٹوپی پہنے گھر سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ بزرگوں کا احترام لازم تھا۔ خواتین پردے کا سخت اہتمام کرتی تھیں۔ ہمارے بعض عزیز اور رشتے دار ملحقہ ضلع بیڑ کے متوطن تھے۔ یہ علاقہ اس وقت آصف جاہی کا حصہ تھا۔ وہاں بھی دکنی تہذیب کے آثار تھے۔ ہمارے پڑوس میں ہندو مراٹھا خاندان آباد تھا جن سے ہمارے قریبی دوستانہ مراسم رہے۔ دکن کی یہی تہذیبی شناخت ہے۔ یوں میں ایک ملی جلی تہذیب کا پروردہ ہوں۔

م ع: اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں آپ نے افسانہ نگاری کی، پھر شاعری، مگر اب تحقیق کا دامن تھام لیا ہے، اس کی وجہ؟

اسلم مرزا: دراصل ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا، پھر کہانیاں اور افسانے لکھنے لگے۔ ان کی اشاعت کی جانب بھی توجہ رہی۔ تحقیقی کام سے میری دلچسپی شروع سے رہی ہے۔ جن دنوں ممبئی میں انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویشن کررہا تھا اس وقت انٹر کالج اور انٹر یونیورسٹی کے تحریری مقابلوں کے لیے بے شمار تحقیقی مضامین لکھے، انعامات حاصل کیے لیکن چونکہ وہ مضامین زیادہ تر اکیڈمک سطح کے تھے۔ ان کی اشاعت کا کوئی اہتمام نہیں ہوسکا۔ تحقیق کی جانب سنجیدگی سے رجوع کس طرح ہوا یہ سن لیجیے۔ کئی سال پہلے مراٹھی/اردو کے نامور محقق اور ناقد دیوی سنگھ چوہان کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا اس میں ایک مضمون حسن شوقی کی مشہور زمانہ رزمیہ مثنوی 'فتح نامہ نظام شاہ' کے بارے میں تھا۔ دیوی سنگھ چوہان کے مطابق یہ مثنوی 1639 تا 1651 کے درمیان لکھی گئی ہے۔ مجھے اس تحقیق سے اتفاق نہیں تھا۔ میں نے چھان بین کی تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ مثنوی 1565 میں لکھی گئی تھی۔ میں نے ایک طویل مضمون لکھا اور مستند تاریخی حوالوں سے اپنا موقف پیش کیا۔ میں نے یہ مضمون ماہنامہ 'سب رس' حیدرآباد کو بھیجا۔ مرحوم مغنی تبسم نے اپنے خصوصی نوٹ کے ساتھ یہ مضمون 'سب رس' جون 2001 کے شمارے میں شائع کیا۔ اس کے بعد اورنگ آباد کے ایک صاحب کی کتاب پڑھی جس میں ولی اورنگ آبادی کے متعلق بے سروپا تحقیق نظر آئی۔ میں نے اس کتاب کے رد میں 12 مضامین لکھے اور اپنی کتاب 'ولی اورنگ آبادی (بعض حقائق)' شائع کی۔ اس کے بعد تحقیقی کاموں کا سلسلہ چل نکلا۔ اس کام میں مجھے لطف آتا ہے اور طمانیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ویسے شاعری اور ترجمہ نگاری ساتھ ساتھ چل رہے ہیں لیکن اس سفر میں افسانہ نگاری کہیں بہت دور رہ گئی جس کا مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔

م ع: تحقیق میں آپ نے علاقائی تہذیبی ورثے کو اپنی ترجیحات کا موضوع بنایا ہے۔ ایسا کیوں؟

اسلم مرزا: علاقائی تہذیبی ورثے سے مراد اگر آپ دکن کے بارے میں پوچھ رہے ہیں تو میں اس سے انکاری نہیں ہوں۔ دراصل دکنی تہذیب وتمدن کی تاریخ قدیم ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ علاقائی تعصب کی وجہ سے بیشتر محققین نے دکن کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ دکن کا تہذیبی ورثہ یعنی یہاں کے شعروادب کے بارے میں بہت کم کم لکھا گیا۔ دکن کی عہد وسطیٰ کی تاریخ پر بھی اگر میں یہ کہوں کہ اہل شمال نے سنجیدگی سے کچھ نہیں لکھا، تو آپ مجھے معاف کریں۔ میں تو شکر گزار ہوں ڈاکٹر معین الدین قادری زور، حکیم شمس اللہ قادری، نصیر الدین ہاشمی، مولوی عبدالحق، شیخ چاند، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر سید محمد، عبدالحفیظ قتیل، مبارزالدین رفعت، پروفیسر اکبرالدین صدیقی، ہارون خان شیروانی، سید اصغر بلگرامی، ڈاکٹر محمد علی اثر، ڈاکٹر سیدہ جعفر، گیان چند جین، ڈاکٹر مسعود حسن خان، پروفیسر نذیر احمد، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر نسیم الدین فریس، ڈاکٹر نورالسعید اختر، ڈاکٹر راہی فدائی اور ڈاکٹر حبیب نثار اور کئی دیگر محققین کا جنھوں نے دکنی شعروادب پر اعلیٰ پایے کا تحقیقی کام کیا اور کررہے ہیں۔ اس کے باوجود بے شمار موضوعات اب بھی توجہ طلب ہیں۔ میں بھی اپنی ادنیٰ سی کوشش کرتا رہتا ہوں لیکن یہ کہنا کہ میں صرف دکن کے تہذیبی ورثے کو ترجیح دیتا ہوں، مناسب نہیں ہے۔

م ع: تخلیق کو ترجمہ پر مقدم مانا جاتا ہے پھر بھی آپ نے ترجمہ نگاری میں اپنی صلاحیتیں صرف کیں۔ اس بارے

میں آپ کیا کہتے ہیں؟

اسلم مرزا: عام طور پر سمجھا جارہا ہے کہ تخلیق ہمیشہ ترجمہ سے مقدم ہے لیکن آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف ترجمہ نگاری میں صرف کررہا ہوں۔ میرا شعری سفر جاری ہے۔ میری نظمیں اور غزلیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ تحقیقی اور تنقیدی مضامین کیا تخلیقی کام نہیں ہیں؟ کیا ترجمہ نگاری میں تخلیقیت کا کوئی عنصر نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے۔ ہاں افسانے نہیں لکھتا۔ آپ حضرات لکھ رہے ہیں تو پڑھتا ہوں اور محظوظ ہوتا ہوں۔

م ع: ترجمے کو اصل کی حد تک لے جانا کیا ترجمہ کے ساتھ ناانصافی نہیں ہے؟ 'لکنت' کے تراجم اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔

اسلم مرزا: یہ دیکھیے، ترجمہ کو اصل کی حد تک لے جانا چاہیے یا نہیں اس پر متضاد آرا ہیں۔ میں فی الحال اس بحث میں نہ الجھتے ہوئے یہ واضح کردوں کہ ملیالم زبان کے قدآور شاعر پروفیسر کے۔ سچیدانندن کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ Stammer (لکنت) انھوں نے اپنی ملیالم نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ تمام نظمیں مجھے پسند تھیں، میں نے انگریزی سے ترجمہ کیا۔ ترجمہ کرتے ہوئے میں ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ زبانِ مبدا کے شاعر کے اسلوب، لفظیات کے حسن ورنگ، ان کی کھنک اور روح کو اپنے ترجمے میں قائم رکھوں، لیکن شعوری طور پر میں نے کبھی بھی ترجمہ کو اصل سے بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے 'لکنت' میں شامل نظموں کو ان کی معنوی اور فنی اہمیت کے پیش نظر پوری دیانت داری سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم آپ نے سچیدانندن کی انگریزی نظمیں پڑھیں یا نہیں۔ شاید میرے اردو ترجمے پڑھ کر آپ نے یہ تاثر قائم کیا ہے۔ بات طویل ہوگی لیکن میں آپ کو ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ اورنگ آباد کے معروف اردو شاعر جناب عبدالوہاب جذب کو میں نے 'لکنت' کی ایک جلد پیش کی تھی۔ جذب صاحب اورنگ آباد کے ایک کالج میں تقریباً 25 برس تک انگریزی کے پروفیسر رہے ہیں۔ 'لکنت' پڑھنے کے بعد ایک دن انھوں نے مجھ سے سچیدانندن کی 'اسٹیمر' (انگریزی نظموں کا مجموعہ) طلب کی، سو میں نے انھیں وہ مجموعہ دے دیا۔ کچھ عرصے بعد 'لکنت' پر جذب صاحب کا تبصرہ شائع ہوا۔ اس تبصرے میں انھوں نے لکھا ہے کہ: ''میں نے 'لکنت' میں شامل تمام نظموں کے اصل انگریزی متن نہایت دلچسپی سے پڑھے۔ اسلم مرزا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے سچیدانندن کی نظموں کا ایسا رواں دواں ترجمہ کیا کہ وہ بالکل طبع زاد معلوم ہوتا ہے، میں اعتراف کرتا ہوں کہ 'اسٹیمر' کی بعض نظموں کا ترجمہ اتنا مشکل ہوتا کہ میں اسے بھاری پتھر سمجھ کر چوم کر چھوڑ دیتا، مگر اسلم مرزا نے یہ منزل ہفت خواں نہ صرف آسانی سے طے کی بلکہ اپنے قاری کو بھی انگلی پکڑ کر اس پل صراط سے آسانی سے پار کرایا۔'' میں انگریزی کے علاوہ مراٹھی، فارسی اور ہندی شاعری کے بھی ترجمے کرتا رہتا ہوں اور دیانت داری سے انھیں اصل کی حد تک لے جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری دانست میں ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے تاکہ ترجمہ کا نیا قاری اصل کے شعری رنگ وحسن سے محظوظ ہوسکے۔

م ع: اردو زبان وادب کا دامن وسیع تر ہے، ترجموں کی پیوندکاری سے اس میں کیا اضافہ ہوسکتا ہے؟

اسلم مرزا: محترم اردو زبان و ادب کا دامن تو ترجمہ کی پیوندکاری سے ہی وسیع تر ہوا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ جہاں تک ترجمے کا سوال ہے تو اس کی جڑیں تاریخ کے قدیم دور میں پیوست ہیں۔ ترجمے کی وجہ سے نہ صرف شعروادب بلکہ سائنسی، لسانی، فلسفیانہ، ثقافتی اور عملی نظریات کا ایک ذخیرہ اردو میں دیگر زبانوں سے در آیا ہے۔ چند مثالیں دلچسپی کا باعث ہوں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ دکن میں اردو قدیم (جسے دکنی کہنا زیادہ مناسب ہے) کا عہد بہمنی سلطنت کے آغاز سے ہوتا ہے۔ احمد شاہ ولی بہمنی (1421 تا 1435) کے عہد حکومت میں اردو کی پہلی معلوم مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' (مصنف فخر دین نظامی) میں مراٹھی کے بے شمار محاورے اور ضرب الامثال ترجمہ ہوکر اردو میں شامل ہوئے۔ ملک خوشنود نے امیر خسرو کی فارسی مثنویوں کا دکنی اردو میں ترجمہ کیا جن میں 'یوسف زلیخا'، 'بازار حسن' اور 'ہشت بہشت' شامل ہیں۔ کمال خان رستمی نے فارسی شاعر حسامی کی 'خاور نامہ' کو دکنی میں منتقل کیا۔ کلیات قلی قطب شاہ میں حافظ شیرازی کی کم وبیش پچاس غزلیں قدیم اردو میں ترجمہ کی ہوئی موجود ہیں۔ لاتعداد مثالیں ہیں۔ 1750 میں شاہ تراب چشتی نے مشہور شاعر رام داس کی 'مناچے شلوک' کا مراٹھی سے اردو ترجمہ 'من سمجھاون' کے نام سے کیا ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں انگریزی ادبیات کے اردو تراجم کا دور شروع ہوا۔ دراصل ترجمہ دو زبانوں میں سفیر کا کام انجام دیتا ہے۔ ایذرا پاؤنڈ نے لکھا ہے کہ ''ادبی تخلیق کا ایک عظیم دور ہمیشہ ترجمے کا بھی عظیم دور ہوتا ہے یا پھر نتیجے کے طور پر فوراً پیدا ہوتا ہے۔'' دراصل دوسری زبانوں کی تکنیک، اسلوب، ہیئت، مواد اور موضوعات ہمیشہ اردو زبان و

تعارف

خاندانی نام : مرزا محمد اسلم بیگ، **ادبی نام** : اسلم مرزا، ولادت: 10 اکتوبر 1944، **پیشہ** : لیبر لاز کنسلٹنٹ

تعلیمی قابلیت : بی۔اے (آنرز)، ایم۔ایل۔ڈبلیو (بمبئی یونیورسٹی)

اشاعت کتب : (1) آئینۂ معنی نما (ولی اورنگ آبادی۔ بعض حقائق) (اکتوبر 2003)، (2) گیلے پتوں کی مسکان (شعری مجموعہ) (جون 2004)، ہم جزیروں میں رہتے ہیں (پروفیسر کے۔ سچیدانندن کی انگریزی نظموں کے اردو تراجم) (اگست 2004)، لکنت (پروفیسر کے سچیدانندن کی انگریزی نظموں کے اردو تراجم) (نومبر 2007)، عطر گل مہتاب (عزلت سورتی پر چند مضامین) (مئی 2008)، گلدستۂ خوش باس (اعتراف وتحسین ولی اورنگ آبادی) (دسمبر 2009)، سلاطین دکن کے عہد میں شادیاں (تاریخی، تحقیقی) (فروری 2010)، پشتو کے عوامی نغمے (لندیوں کے اردو تراجم فارسی اور انگریزی سے) (مارچ 2011)، نظام شاہی توپ ساز محمد بن حسن رومی خان (تاریخی، تحقیقی) (جون 2013)، سلاطین دکن کے عہد میں شادیاں (ترمیم واضافہ شدہ دوسرا ایڈیشن) (2016)، دکن دیس کی پیش رو غزلیں (سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک) (تحقیق وتالیف) (اکتوبر 2016)، مور پنکھ (کوی پرشانت اسارے کی مراٹھی نظموں کا اردو ترجمہ) (اکتوبر 2017)، پیاری اتو (کوی اویناش سالاپورکر کی 12 مراٹھی نظموں کا اردو ترجمہ) (دسمبر 2017)، (نوٹ: 1985 تا حال، مختلف ادبی اور تاریخی موضوعات پر تقریباً پچاس تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے علاوہ انگریزی اور مراٹھی زبانوں کی نظموں اور افسانوں کے اردو تراجم کی ادبی رسائل میں اشاعت)

انعامات و اعزازات : سینٹ زیویرس اردو گولڈ میڈل (بمبئی یونیورسٹی۔ برائے اردو۔ 1965)، 'آئینۂ معنی نما' پر مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کا تحقیقی زمرے میں اول انعام (2005)، اردو ساہتیہ پریشد۔ پونے۔ ادبی شخصیت ایوارڈ (2009)، ولی دکنی قومی ایوارڈ (عمومی ادبی خدمات کے لیے) مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی (2011)، ستیو مادھو پگڑی ریاستی انعام (برائے مراٹھی۔ اردو ترجمہ نگاری) مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی (2014)، ڈاکٹر عصمت جاوید ایوارڈ (برائے نثر) ادارۂ ادب اسلامی (حلقہ مہاراشٹر) (2017)

ادب میں اضافے کا باعث ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا ہے کہ ''ترجمے کے بغیر آج کوئی زبان جدید اور ترقی پذیر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔'' جمیل جالبی نے کیا خوبصورت بات کہی ہے کہ: ''ترجمے کے ذریعے ایک زبان کی تہذیب دوسری زبان کی تہذیب کے ساتھ مل کر نئے نئے گل کھلا سکتی ہے۔'' دراصل ترجمہ پیوندکاری نہیں ہے بلکہ دو زبانوں اور دو قوموں کے درمیان لسانی اور ثقافتی سفارت کار کا کام انجام دیتا ہے۔ تراجم سے ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ دیگر زبانوں میں کیا لکھا جارہا ہے، کیسے اور کیوں لکھا جارہا ہے اور ان کے ادب کی سمت و رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ دیگر زبانوں کی جمالیاتی کیفیات اور شعریت کے گہرے اثرات اردو پر مرتب ہوئے ہیں۔

م ع: تخلیقی سطح پر نیز فروغ اردو کی خاطر آپ کے مستقبل کی پیش بندی کیا ہے؟

اسلم مرزا: فروغ اردو زبان کے تعلق سے خوب جم کر صرف گفتگو ہوتی رہتی ہے، عملی جدوجہد کا فقدان ہے۔ میں آپ کو حیدرآباد کی فعال تنظیم عابد علی خان ایجوکیشن ٹرسٹ اور محبوب حسین جگر ایجوکیشن کی مثال دینا چاہتا ہوں۔ میری ناقص معلومات کے مطابق مندرجہ بالا ٹرسٹ گزشتہ 24 برسوں سے اردو دانی، زبان دانی اور انشاء کے تحریری امتحانات منعقد کررہی ہے۔ اب تک تقریباً سات لاکھ افراد نے اپنے ذوق وشوق کے ساتھ ان تحریری امتحانات میں شرکت کی اور کامیابی حاصل کی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان میں تقریباً بیس ہزار غیرمسلم افراد ہیں جن میں آئی پی ایس، آئی اے ایس اور دیگر عہدیداران شامل ہیں۔ اس مشن میں کئی مدارس کے ارباب مجاز، پرنسپلز، اساتذہ، سماجی کارکنان، عوامی نمائندے اور محبان اردو رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات اور تعاون دے رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہندوستان کے تمام بہی خواہان اردو کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔ اگر تمام شہروں میں اس قسم کی تحریک چلائی جائے تو یقیناً فروغ اردو کے لیے اس کے مثبت اثرات رونما ہوں گے۔ اب دوسری بات آپ تخلیقی سطح کی کررہے ہیں تو جناب تخلیق کا معاملہ تو وہبی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کسی کو تخلیقی صلاحیت ودیعت کرتا ہے۔ ہاں جو نئے قلمکار ہیں ہمیں ان کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرنا چاہیے۔

م ع: اچھا اب یہ بتائیے کہ اردو کو طرزِ حیات اور طرزِ فکر بنانے کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا؟

اسلم مرزا: سب سے پہلے ہمیں طرزِ حیات اور طرزِ فکر کا مفہوم اور اس کا دائرہ متعین کرنا ہوگا۔ اردو کا طرزِ حیات گزشتہ سات، آٹھ صدیوں سے کاسموپولیٹن رہا ہے۔ اردو کا دائرہ بہت وسیع ہے اس میں بلاامتیاز مذہب و ملت لاتعداد اہل قلم گزرے ہیں اور آج بھی موجود اور فعال ہیں۔ میں ان سب کا احترام کرتا ہوں، زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اردو کسی مخصوص مذہبی اکائی کی زبان نہ پہلے کبھی تھی نہ آج ہے۔ یہ اپنے آپ میں بڑی کشادہ، بڑی سیکولر زبان ہے۔ ایک ایسا گلشن جس میں بے شمار جاذب رنگ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کی اپنی اپنی شناخت اور انفرادیت ہے۔ ہمیں اسے قائم رکھنا ہوگا۔ اردو داں والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ایسے تعلیمی اداروں میں شریک کروائیں جہاں نصاب تعلیم اردو میں ہو۔ یہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ تعلیم مادری زبان میں ہی ہونا چاہیے۔ اگر والدین اس پر راضی نہیں ہیں تو انھیں چاہیے کہ کم از کم اپنے گھروں میں ہی اپنے بچوں کو اردو سکھانے کا نظم کریں۔ اسی طرح غیراردو داں حضرات تک پہنچئے، انھیں اردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے کی طرف راغب کیجیے۔ اردو کے اساتذہ اپنے اپنے علاقوں میں اردو سکھانے کے لیے کلاسیز شروع کرسکتے ہیں۔ اردو کا وطن ہندوستان ہے۔ یہ زبان ہمیشہ قومی یکجہتی اور اتحاد و اتفاق کی روشن مثال رہی ہے اور اسی جذبہ، اسی فکر کو ہمارا طرزِ حیات بنانا چاہیے۔

م ع: آج کی شاعری کے تناظر میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

اسلم مرزا: آپ جانتے ہیں کہ ہر عہد میں شاعری اور فکشن، سامع اور قاری کے جذبات اور احساسات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اگر اردو شاعری کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ متاخرین سے لے کر آج کے عہد تک کے تمام شعرا نے ہر سطح پر اپنے اپنے عہد کے حالات کو اپنے ذاتی تجربات کی آنچ میں پگھلا کر شعری پیراہن عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج غزل کے موضوعات بہت وسیع ہوچکے ہیں اور ہم عصر شاعری کی تمام اصناف میں، موضوعات کا تنوع، لہجہ، لفظیات، اظہار کے قرینے، ترکیب سازی علامات، استعارے، تشبیہات، پیکرتراشیاں وغیرہ ایک نئے ذائقے سے ہمیں لطف اندوز کررہے ہیں۔ عصری میلانات اور حسیت، نہایت تہہ داری اور رمزیت کے ساتھ آج اردو شاعری کا نشانِ امتیاز ہے۔ یہاں مثالیں دینے کا موقع نہیں ہے۔ آج کی شاعری میں فنی پختگی اور نئے مفاہیم کا خوش رنگ منظرنامہ موجود ہے۔ ہر عہد میں کمزور اور کمزورترین شعرا گزرے ہیں آج بھی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجموعی طور پر آج شاعری اچھی ہورہی ہے۔ خصوصاً غزل پر بہار ہے۔

م ع: آج افسانہ تو لکھا جارہا ہے مگر یاد رہ جانے والی تحریروں کا فقدان ہے۔ ایسا کیوں ہورہا ہے؟

اسلم مرزا: کم کم ہی سہی، یاد رہ جانے والی تحریریں تو ہمارے درمیان موجود ہیں۔ یہ صورتِ حال ہر عہد میں رہتی ہے۔ اس وقت کئی افسانے جو مجھے یاد آرہے ہیں میں اپنی بات کی تائید میں پیش کرسکتا ہوں۔ اچھے اور یاد رہ جانے والے افسانوں کا فقدان نہیں ہے۔ میں فہرست پیش کروں اور بعض نام رہ جائیں تو آپ مجھ پر جانبداری کا الزام لگائیں گے اور ویسے بھی یہاں یہ محل نہیں ہے کہ میں ان افسانوں کی فہرست سازی کرتا بیٹھوں جو میری یادداشت کے نہاں خانوں میں محفوظ ہیں۔ آج بے شمار عمدہ افسانہ نگار ہمارے درمیان موجود ہیں اور بہترین افسانے تخلیق کررہے ہیں۔

م ع: یہ بتائیے کہ افسانے کے متعلق مہاراشٹر کی صورتِ حال کیا ہے؟

اسلم مرزا: مہاراشٹر کی صورتِ حال اطمینان بخش نہیں ہے۔ مقدر حمید، علی امام نقوی، مظہر سلیم، مشتاق مومن، ساجد رشید اور م۔ ناگ اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ سلام بن رزاق، انور قمر، نورالحسنین، عارف خورشید، احمد عثمانی، اسلم خان، معین الدین عثمانی، بانو سرتاج، صادقہ نواب سحر، ایم مبین، عظیم راہی، اشتیاق سعید، وکیل نجیب، سلیم خان، محمد یحییٰ جمیل، محتشم اکبر، حبیب ریتھ پوری، شاداب رشید وغیرہ وقفے وقفے سے اپنے ہونے کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ الیاس شوقی اور اقبال نیازی اب رسائل میں نظر نہیں آتے۔ اور بھی چند نام ہیں اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں۔ نئے افسانہ نگار بھی آرہے ہیں۔ یہ کتنی دور تک چلتے ہیں وقت ہی بتائے گا۔

م ع: نئی نسل کے قلم کاروں کو آپ کیا مشورہ دینا چاہیں گے؟

اسلم مرزا: نئی نسل کے قلم کاروں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اردو کے کلاسک ادب کو اپنے مطالعے کا حصہ بنائیں۔ لکھنے کی مشق جاری رکھیں۔ کسی بزرگ اور معتبر قلم کار کو اپنی نگارشات دکھائیں اور مشورہ کریں، اس کے بعد ہی اپنی تخلیق کی اشاعت پر غور کریں۔ تنقید سے دل برداشتہ نہ ہوں بلکہ اپنی اصلاح کرتے رہیں۔ اپنی کوتاہیوں پر دھیان دیں۔ ہندوستان کی صوبائی زبانوں میں جو ادب تخلیق ہورہا ہے اسے ترجمے کے ذریعے پڑھیں، انھیں ہضم کریں۔ زبان و بیان کے معیار پر نظر رکھتے ہوئے اپنے اسلوب کو نکھارنے کی سعی کرتے رہیں۔

■

Moinuddin Usmani
264 Shahu Nagar
Jalgaon - 425001 (MS)

رپورٹ

توقیر راہی

کشن گنج کتاب میلہ

رنگارنگ تقریبات میں طلبہ، اساتذہ اور محبان اردو کی بے پناہ دلچسپیوں نے میلے کو بنایا یادگار

ہندوستان کی مسلم اکثریتی آبادی سیمانچل کے تعلیمی اداروں، اہم شخصیات اور اردو زبان و ادب کے شائقین کے شدید اصرار پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے اپنا 22 واں کل ہند اردو کتاب میلہ سیمانچل کے کشن گنج میں منعقد کیا۔ کشن گنج کے تاریخی روئی دھاسہ میدان میں منعقد ہونے والا کل ہند اردو کتاب میلہ 7 اپریل سے 15 اپریل تک محبین اردو اور شائقین کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ اس دوران کتابوں کی خرید و فروخت، علمی و ادبی سرگرمیاں، مختلف موضوعات پر سیمینار و سمپوزیم اور شعری نشست و مشاعروں کا دور چلتا رہا۔ مجموعی طور پر یہ کتاب میلہ نہایت کامیاب رہا اور سیمانچل کی سرزمین کے لیے ایک یادگار بن گیا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کا ایک ایسا ادارہ ہے جو اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے عالمی سطح پر معروف ہے، کونسل اردو زبان کے فروغ اور اردو کتابوں کی اشاعت و ترسیل کا کام مختلف طریقے سے انجام دیتی ہے اور اردو کتاب میلہ اس کی ایک نہایت مقبول اسکیم ہے جس کے تحت اردو کتابوں کو گھر گھر پہنچانے کی اس کی مہم نہایت کامیاب رہی ہے۔ عام طور پر کونسل اردو کتاب میلہ بڑے شہروں میں منعقد کرتی رہی ہے جس کے ذریعے اردو تہذیب کے فروغ کے ساتھ ساتھ اردو کتابوں کے ناشرین کو تجارتی منفعت بھی حاصل ہوتی رہی ہے لیکن یہ کونسل کی تاریخ میں پہلی بار ہوا ہے کہ کشن گنج جیسے دور دراز اور چھوٹے شہر میں یہ کل ہند کتاب میلہ منعقد کیا گیا، اس سے قبل بہار میں صرف دارالحکومت پٹنہ کے گاندھی میدان میں یہ کتاب میلہ منعقد ہوا ہے۔ ظاہر ہے ناشرین اور اردو کونسل کے بعض احباب کو بھی یہ خدشہ تھا کہ تجارتی اعتبار سے میلہ ناکام ہو سکتا ہے مگر قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے جب یہاں کتاب میلے کے انعقاد کا فیصلہ کیا تھا تو ان کے ذہن میں تھا کہ کشن گنج و اطراف میں کثیر اردو آبادی ہے جہاں کتاب میلے کے ذریعے ہم اردو اور اردو تہذیب کے فروغ کا کام انجام دے سکتے ہیں اور جو چراغ یہاں جلایا جائے گا اس کی روشنی دور تک پھیلے گی۔ چنانچہ یہ خوش آئند بات ہے کہ کشن گنج میں اردو کتاب میلہ نہ صرف علمی و ادبی اعتبار سے مفید ثابت ہوا بلکہ تجارتی اعتبار سے بھی ناشرین کو مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کونسل کے ڈائرکٹر اور دوسرے ذمے داران کی نگاہ میں دراصل یہ خیال گردش کر رہا تھا کہ بلاشبہ اردو زبان ہی ایسی زبان ہے جو ملک کے ہر حصے میں پڑھی، لکھی اور بولی جاتی ہے لیکن ملک میں کچھ ایسے مخصوص خطے ہیں جہاں کثیر اردو آبادی ہے، اردو آبادی کے ایسے چھوٹے بڑے پاکٹس ملک کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں جن کو سامنے رکھ کر انتخابی حکمت عملیاں تو طے کی جاتی ہیں لیکن وہاں کی زبان، وہاں کی تہذیب، وہاں کے روایتی مسائل اور وہاں کے لوگوں کی خواہشات و مطالبات کو سامنے رکھ کر کوئی حکمت عملی نہ اردو ادارے طے کرتے ہیں اور نہ سماجی تنظیمیں۔ ایسی کثیر اردو آبادی میں اردو اسکولوں، اردو مکاتب و مدارس کی بھی تعداد قابل ذکر ہے مگر بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے کہ ایسی ہی آبادیوں میں اردو کے فروغ کی راہ میں زیادہ رکاوٹیں حائل ہیں۔ جبکہ ایسی اردو مرکوز آبادیوں کو اردو زبان و ادب کے فروغ کا مرکز اور شائقین اردو کے لیے نمونہ بن کر ابھرنا چاہیے۔ ایسے علاقوں کے اسکول، مدارس و مکاتب اور دیگر تعلیمی و تحریکی اداروں سے

اردو زبان وادب کا فیض اس طرح عام ہونا چاہیے کہ اس کی روشنی میں اردو کے وہ شائقین بھی راہ عمل طے کر سکیں جو اکثریت میں نہ ہو کر بھی اس زبان کی چاشنی سے سماج کو بہرہ ور کرنا چاہتے ہیں۔

قومی اردو کونسل کا یہ خیال تھا کہ کتاب میلے میں اردو زبان سے وابستہ قائدین، اردو خطوں کے نمائندوں اور ماہرین زبان وادب کو ایک جگہ جمع کیا جائے اور مختلف خطوں کے الگ الگ مسائل اور ان کے حل پر غور وفکر کیا جائے۔ چنانچہ کل ہند اردو کتاب میلہ کشمیر کے بعد ہندوستان کی سب سے بڑی اردو آبادی بہار کے سیمانچل خطہ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ وہ خطہ ہے جہاں کثیر اردو آبادی ہے، یہاں کی دو کمشنریوں میں تقریباً 80 لاکھ مسلمان آباد ہیں جن میں سے اکثریت کی مادری زبان اردو ہے۔ پورنیہ کمشنری اور کوسی کمشنری کے تحت سات اضلاع ہیں۔ پورنیہ کمشنری میں کشن گنج، پورنیہ، ارریہ اور کٹیہار جیسے کثیر اردو آبادی والے اضلاع ہیں جبکہ کوسی کمشنری میں سہرسہ، مدھے پورہ اور سپول آتے ہیں۔ ان تمام اضلاع میں کثیر اردو آبادی ہے جن کی علمی، لسانی اور معاشرتی تہذیب یکساں ہے۔ اس خطے میں شاعروں، ادیبوں، قلمکاروں، صحافیوں اور اردو زبان کے بلند پایہ مصنفین ومدرسین کی بڑی تعداد ماضی میں بھی رہی ہے اور فی زمانہ بھی ایک بڑی تعداد ہے جو اردو زبان وادب کی آبیاری میں مصروف ہے۔ ودیا دھر، پھنیشور ناتھ رینو کی علمی وادبی سرزمین کی نمائندگی ماضی میں مولوی سلیمان (پلامنی)، قاضی نجم ہری پوری (امور)، علامہ عیسیٰ فرتاب (ارریہ)، علامہ عبدالوحید ثاقب نعمانی (ارریہ)، پروفیسر طارق جمیلی (پورنیہ)، شاہ ولی الہی (کٹیہار)، اکمل یزدانی (کشن گنج) کر رہے تھے تو موجودہ عہد میں طارق جمیلی، احمد حسن دانش، علامہ کبیرالدین فوزان (پورنیہ)، عبدالرقیب (کٹیہار)، زبیرالحسن غافل (ارریہ)، حقانی القاسمی (ارریہ)، پروفیسر منصور عالم، کشن گنج اور انور ایرج (کٹیہار)، دین رضا اختر (ارریہ) کر رہے ہیں۔

اس علاقے کی سیاسی نمائندگی سید شہاب الدین، جمیل الرحمٰن، ایم جے اکبر، سید شاہنواز حسین اور سیمانچل گاندھی کے نام سے مشہور محمد تسلیم الدین کرتے رہے ہیں اور اس وقت طارق انور، محبوب علی قیصر، مولانا اسرارالحق قاسمی، راجیش رنجن عرف پپو یادو جیسے بڑے قد کے سیاسی لیڈران وہاں کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

یہی وہ علاقہ ہے جہاں سیکڑوں اردو اسکول، ہزاروں مدارس ومکاتب اور درجنوں اعلیٰ تعلیمی ادارے ہیں جن میں کٹیہار میڈیکل کالج، گجری ماتا میڈیکل کالج کشن گنج، ملیہ گروپ آف انسٹی ٹیوشنز پورنیہ، اے ایم یو کشن گنج، توحید ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ، ملیہ کالج ارریہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مشہور مدارس میں توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ کے تحت چلنے والے جامعۃ الامام بخاری کشن گنج، دارالعلوم بہادر گنج، دارالعلوم رحمانی زیرو مائل ارریہ، جامعہ دعوۃ القرآن ارریہ، جامعہ صدیقہ ڈگروا پورنیہ، جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول، دارالعلوم حسینیہ کشن گنج، انجمن اسلامیہ کشن گنج وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سیمانچل میں اردو زبان وادب کے روشن امکانات کی راہ میں حائل رکاوٹیں بھی کم نہیں، چنانچہ یقین ہے کہ کل ہند اردو کتاب میلہ سے جو مثبت پیغام وہاں گیا ہے اور جو اردو کی کتابوں کو پڑھنے وفروغ دینے کا ماحول بنا ہے اس کا فائدہ دیر تک نظر آئے گا اور اردو کے فروغ کی راہ میں یہ میلہ ایک نیا سنگ میل ثابت ہوگا۔

سیمانچل اقتصادی، تعلیمی اور سماجی اعتبار سے ہندوستان کا نہایت ہی پسماندہ علاقہ ہے۔ یہ صوبہ بہار کے شمالی مشرقی علاقے میں وقوع پذیر ہے جو دامن ہمالیہ میں نیپال سے جنوب، گنگا کے زرخیز میدانی علاقے میں 4994 مربع میل پر پھیلا ہوا ہے۔ دارجلنگ جو خطۂ کشمیر سے مشابہ ہے، یہاں سے بہت قریب شمال مشرق کی جانب واقع ہے۔ جاڑے کے ٹھٹھرا دینے والی راتوں میں دارجلنگ پہاڑی پر جلنے والی آگ سیمانچل کے ملحق علاقوں سے صاف نظر آتی ہے۔ نیز جاڑے کی صبح میں پیام مسرت لانے والا آفتاب اپنی زریں کرنوں سے سب سے پہلے جس کو منور کرتا ہے وہ ہمالیہ کی سربلند وبالا اور فلک بوس چوٹی ہی ہے جو سیمانچل کے ہر گوشے سے صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔ جنوب میں دریائے گنگا اور پورب میں جلپائی گوڑی، دیناج پور اور مالدہ کے اضلاع ہیں اور ناگرندی جو مملکت بنگلہ دیش کا نشان سرحد ہے اس کی حد بندی کرتا ہوا مہاندی سے جا ملتی ہے۔ پچھم میں دریائے کوسی اور بھاگل پور کا وہ شمالی حصہ واقع ہے جو دریائے کوسی کے نظرِ عتاب کا ہمیشہ شکار رہتا ہے۔ یہ علاقہ کنکائی اور مہاندی کے درمیان کا علاقہ ہے۔

شمال کی طرف پتھریلے علاقے اور مشرق کی طرف دریاؤں اور قدرتی ذرائع سے بنے کبھی نہ سوکھنے والے دلدلی علاقے اور مغرب کی طرف سینڈی گھاس کے میدان ملتے ہیں۔ گنگا کے علاوہ کوسی، مہانندا اور پنار ندیاں بہتی ہیں۔ مشرق کی طرف کہیں کہیں شاندار جلوڑھ مٹی ملتی ہے۔ بارش جلد شروع ہوتی اور زوردار ہوتی ہے۔ سالانہ بارش کی اوسط 71 انچ ہے۔ زراعت میں دھان کے علاوہ دالیں، تیل کے بیج اور تمباکو وغیرہ کی کاشت کی جاتی ہے۔ جانور چھوٹے اور کمزور ہوتے ہیں۔ یہاں موٹے کپڑوں کی صنعت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جوٹ یعنی پٹ سن کی

بڑے پیمانے پر کاشت ہوتی ہے۔

پورنیہ ضلع میں بریجان گڑھ، اسوڑھ گڑھ، بینوگڑھ، جلال گڑھ جیسے بہت سے ویران قلعے ہیں۔ یہاں کی مشہور صنعتوں میں کپڑے، چٹائی، کمبل کی صنعت کا قدیم رواج ہے۔

کٹیہار اور کشن گنج سیمانچل کے دو بڑے ریلوے اسٹیشن ہیں جو شمال مشرقی ریاستوں کو جوڑتے ہیں۔ یہاں سے ملک بھر میں تقریباً تمام ہی ریاستوں کے لیے ٹرینیں مل جاتی ہیں اور ہر قسم کی ٹرینیں یہاں رکتی ہیں۔ سیمانچل کے ضلع کٹیہار کی سرحد جہاں جھارکھنڈ اور مغربی بنگال سے ملتی ہے تو کشن گنج کی سرحد مغربی بنگال اور نیپال سے ملتی ہے، اسی طرح ارریہ اور سپول ضلع کی سرحد بھی نیپال کے ایک بڑے علاقے سے جا ملتی ہے، جبکہ سیمانچل کے پورنیہ، مدھے پورہ اور سہرسہ جیسے اضلاع اس سے متصل ہیں اور ان کی سرحدیں دوسرے اضلاع سے ملی ہوئی ہیں۔ اس پورے خطے کے باشندوں کا رہن سہن یکساں ہے۔ یہاں کئی قومیں اور کئی زبانیں پائی جاتی ہیں۔ ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی اور بودھ دھرم کے ماننے والے بھی یہاں ہیں مگر زیادہ تر یا تو مسلمان ہیں یا ہندو۔ زیادہ تر حصے میں مسلمانوں کی آبادی ہے اور مسلمانوں میں زبان اور رہن سہن کی وجہ سے کئی طبقات پائے جاتے ہیں۔ کچھ شیر شاہ آبادی کہلاتے ہیں، کچھ سرجاپوری تو کچھ کلہیا اور سیکھڑا نام سے جانے جاتے ہیں۔ جبکہ شیخ صدیقی، پٹھان، سید بھی ذات سے تعلق رکھنے والے یہاں آباد ہیں۔ ایک بڑی تعداد بنگلہ، بھوجپوری اور میتھلی زبان بولنے والوں کی بھی ہے۔ مگر گاؤں گھروں میں بولنے والی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان زیادہ تر مسلمانوں کی مادری زبان ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اس علاقے کو مالدار تصور کیا جاتا تھا، کیونکہ یہاں اناج پیدا کرنے والی نہایت قیمتی زمینیں تھیں مگر جب کسانی ناکام ہوتی چلی گئی تو لوگوں نے روزی کمانے کے لیے بڑے شہروں کا رخ کر لیا۔ یہاں پہلے اکثر مکانات گھاس پھونس اور مٹی کے ہوا کرتے تھے لیکن گزشتہ دو دہائی سے اب پختہ عمارتیں کافی زیادہ بننے لگی ہیں۔ یہاں کے لوگ اپنے کھیتوں سے پیدا کردہ چاول پر انحصار کو قابل فخر تصور کرتے ہیں اور زیادہ تر گھروں میں چاول کا استعمال ہوتا ہے۔

یوں تو سیمانچل اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت سے متعلق سرگرمیوں کی وجہ سے ماضی میں علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے، لیکن حال کے دنوں میں اردو زبان پڑھنے والوں کی مسلسل گھٹتی تعداد اہل علم اور شائقین اردو کے لیے تشویش کی بات ہے۔ اگر جلد اس جانب توجہ نہیں دی گئی تو اردو کا نقصان ہو سکتا ہے۔ اردو زبان کو درپیش مسائل کے ضمن میں ہمارے گھروں سے اردو کی تعلیم کا اٹھتا رواج بڑا نقصان دہ ہے۔ گھر اور محلے کی سطح پر اردو عربی کی تعلیم کے لیے چلنے والا مکتب اور اس کا معاشرتی نظام بھی زوال پذیر ہے۔ گارجین یہاں بچوں کو داخل کرنے سے پرہیز کرنے لگے ہیں اور سرکاری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی قلت ہے اور جہاں بحال ہیں وہاں بھی اساتذہ اور بچے اردو پڑھنے پڑھانے میں دلچسپی نہیں دکھاتے ہیں۔ اردو زبان میں بچوں کی دلچسپی کے مطابق پرکشش مواد کا دستیاب نہ ہونا بھی دل کو کھٹکتا ہے اور اس جانب جینوئن قلمکار کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اخبارات کسی بھی زبان سے جڑنے کا ذریعہ ہوتے ہیں اور اس کے ذریعے اس زبان کا ذوق و شوق بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ لیکن آج اردو اخبارات بیشتر اردو آبادی تک نہیں پہنچ پاتے ہیں لہٰذا اس سطح پر بھی اردو پیچھے رہ جاتی ہے۔ اردو کے ذریعے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے افراد کو روزگار نہ مل پانا بھی نئی نسل میں اردو کی تعلیم سے بیزاری کا سبب بنا ہوا ہے۔

حیرت انگیز پہلو تو یہ ہے کہ بڑے بزرگ کی سطح پر نئی نسل کی ذہن سازی نہیں کی جا رہی ہے۔ عموماً ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ اکثر اردو ادب میں شناخت قائم کر چکے افراد نئے ابھرنے والوں کی رہنمائی کی بجائے ان کے حوصلے توڑنے کا کام کرتے ہیں اور بسا اوقات دل شکنی کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ اردو کو ذریعہ بنا کر کامیاب زندگی گذارنے والوں میں بھی اس زبان کے تئیں بے زاری دیکھی جاتی ہے اور وہ اپنے بچوں کو اس میدان میں لانے سے عار محسوس کرتے ہیں۔ سرکاری سطح پر اردو کی بقا اور فروغ کے لیے بھی کئی سطح پر کام کیے جا رہے ہیں لیکن اسے اپنانے اور فائدہ اٹھانے والوں کی کمی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے نام پر قائم انجمن اور تنظیمیں اس جانب توجہ دیں اور سرکاری اسکیموں سے اردو عوام کو جوڑنے کا کام انجام دیں۔ مشہور شاعر اسلم چشتی کے اس مشورے کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔

تہذیبوں کے لاکھوں پھل آ جائیں گے
اردو کا ایک پیڑ لگا دو بستی میں

افتتاح (17 **اپریل** 2018)

ہیومن چین اور توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ کے اشتراک سے قومی اردو کونسل کے 22 ویں کل ہند اردو کتاب میلے کا افتتاح 17 اپریل 2018 کو کشن گنج کے روئی دھاسہ میدان میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم اور کشن گنج لوک سبھا کے ممبر پارلیمنٹ مولانا اسرار الحق قاسمی نے فیتہ کاٹ کر کیا۔ اس موقعے پر ہیومن چین کے صدر انجینئر محمد اسلم علیگ، توحید ایجوکیشنل

ٹرسٹ کے سربراہ مولانا شیخ مطیع الرحمٰن مدنی، کوچادھامن کے ایم ایل اے ماسٹر مجاہد عالم اور کثیر تعداد میں اہل علم، سیاسی وسماجی قائدین موجود تھے۔ روئی دھاسہ میدان کشن گنج شہر کے قلب میں واقع ہے، اس کے عقب میں نارتھ ایسٹ کو جانے والی ریلوے لائن ہے اور محض چند قدموں کے فاصلے پر کشن گنج ریلوے اسٹیشن ہے، چنانچہ ہرٹرین روئی دھاسہ میدان کو سلام کرتی ہوئی جاتی ہے۔ تاریخی روئی دھاسہ میدان کو پوری طرح سے سجادیا گیا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک نیا شہر بسا دیا گیا ہو۔ ناشرین کے لیے الگ الگ کتابوں کا اسٹال، کئی گیلری، منظم استقبالیہ، عوام کی رہنمائی کے لیے انفارمیشن سینٹر، پارکنگ کا معقول انتظام اور ایک حصے میں شامیانوں سے سجا سنورا ایک شاندار کانفرنس ہال۔ اسی کانفرنس ہال میں افتتاحی اجلاس رکن پارلیمنٹ مولانا اسرارالحق قاسمی کی صدارت میں منعقد ہوا جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے رکن راجیہ سبھا اور کٹیہار میڈیکل کالج کے چیئرمین ڈاکٹر احمد اشفاق کریم نے شرکت کی۔

شدید گرمی اور گرم ہوا کا موسم تھا اس کے باوجود کانفرنس ہال مردوخواتین، اسکول وکالج کے طلبہ وطالبات اور اساتذہ نیز اردو سے محبت کرنے والے سامعین سے کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم جب مائک پر تشریف لائے تو سامعین نے تالیوں کی گونج سے ان کا استقبال کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے تمام معزز مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور اہم مہمانوں کی گل پوشی کی گئی۔

اس موقعے پر اپنے استقبالیہ خطاب میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ میں اردو کے مستقبل کے حوالے سے نہ خوف زدہ ہوں اور نہ ہی مایوس، اس کے اچھے دن ہیں اور آئندہ بھی اچھے دن ہی رہیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے حوالے سے بہت سے خدشات اور تشویشات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے اور یہ کوئی آج کل کی بات نہیں ہے، آزادی کے بعد سے اسی موضوع پر بات کی جاتی رہی ہے لیکن اردو نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس نے اپنے وطن کے ساتھ بیرون ممالک میں بھی اپنی دنیا بسالی ہے، یہ اس زبان کی خوبصورتی، شیرینی اور دوام کی علامت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو گنگا جمنی تہذیب اور سیکولرزم کی ایک روشن علامت ہے۔ یہ زبان نہ صرف ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی نمائندہ زبان رہی ہے بلکہ ملک کی تمام تحریکات ورجحانات میں بھی اس نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ وزارت فروغ انسانی وسائل کے تحت کام کرنے والی قومی اردو کونسل کا مقصد اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی اور اردو کو روزگار سے جوڑنا ہے اس میں کونسل بہت حد تک کامیاب بھی رہی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کی غرض سے کونسل ملکی سطح پر کام کررہی ہے اور جس کے خوش آئندہ نتائج بھی سامنے آرہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت ہند جس تندہی اور انہماک سے اردو کے فروغ اور اس کی اشاعت میں لگی ہے وہ قابل ستائش ہے لیکن سرکاری مراعات اور تعاون کی بنیاد پر صرف اردو کی ترقی ممکن نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ہمیں اپنے گھروں میں مادری زبان کے طور پر اردو کو رائج کرنے کی ضرورت ہے اور ہمیں اردو کا رونا چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں میں اردو کا چراغ روشن کرنا چاہیے۔

انھوں نے مقامی انتظامیہ اور میڈیا اہلکاروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ صوبہ بہار میں یہ اپنی نوعیت کا دوسرا کل ہند کتاب میلہ ہے اور میں اس کے لیے ہیومن چین کے صدر انجینئر محمد اسلم علیگ اور توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ کے چیئرمین مولانا مطیع الرحمٰن مدنی صاحب کا شکرگزار ہوں۔ مزید برآں اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے اعلان کیا کہ اب اردو ایپ کے ذریعے کونسل کی کتابوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے جو کہ ہمہ وقت آن لائن ہیں۔

اس موقعے پر اپنے صدارتی خطاب میں کتابوں سے دوستی کرنے کی اپیل کرتے ہوئے رکن پارلیمنٹ مولانا اسرارالحق قاسمی نے کہا کہ آپ کے اندر اس وقت

سوچ پیدا ہوگی جب آپ کا رشتہ علم سے ہوگا اور علم کتاب سے ہی آئے گا۔ انھوں نے کہا کہ وہی قوم آگے بڑھتی ہے جس کے پاس سوچ ہوتی ہے اور یہاں کے لوگوں کو سوچ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ کتاب کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے پڑھنے والے ادھر ادھر کی خرافات سے بچ جاتے ہیں۔ انھوں نے کشن گنج میں 'بزم ادب اردو لائبریری' کے قیام کے حوالے سے کہا کہ اس کے لیے وہ اپنا پارلیمانی فنڈ دینے کے لیے تیار ہیں اور اس کے لیے جو بھی ممکن ہوگا کیا جائے گا۔

نومنتخب رکن راجیہ سبھا اور کٹیہار میڈیکل کالج کے چیئرمین ڈاکٹر احمد اشفاق کریم نے تعلیم پر توجہ دینے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ یہ علاقہ جغرافیائی اعتبار سے ضرور پسماندہ ہے لیکن صلاحیت کے اعتبار سے قطعی پسماندہ نہیں ہے اور اس خطے کے لوگ تمام شعبۂ حیات میں مل جائیں گے۔ انھوں نے عزم کی ضرورت پر زور دینے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ اگر عزم نہیں ہوتا تو کٹیہار میڈیکل کالج کا قیام ممکن نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر دلیپ کمار جیسوال رکن قانون ساز کونسل نے کتاب میلے کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کتاب سماج کو پرکھنے کا آئینہ ہوتا ہے اور اس سے نہ صرف علم میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ زندگی کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ انھوں نے قومی سطح کی لائبریری کشن گنج میں تعمیر کرنے کی نہ صرف اپیل کی بلکہ اس کے لیے تعاون کی بھی پیش کش کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کشن گنج سنٹر کے ڈائرکٹر پروفیسر راشد نہال نے اردو کو پڑھانے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اگر ان کے ساتھ کچھ تعاون کیا جائے تو وہ بی ایڈ کے طلبہ کو اردو پڑھانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کے توسط سے اردو کی تدریس کے لیے جگہ جگہ سنٹر کھول سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر مقررین میں جے ڈی یو لیڈر جناب محمود اشرف، ڈاکٹر فرزانہ بیگم (راحت این جی)، جناب مدثر عالم، مفتی اظہار عالم، بہار کانگریس اقلیتی سیل کے چیئرمین جناب منت رحمانی، جناب شاہ فیصل کٹیہار، روزنامہ راشٹریہ سہارا کے سینئر سب ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالقادر شمس، میلے کے کنوینر جناب مجاہد اختر ناز اور دیگر حضرات شامل تھے۔ توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ کے چیئرمین مولانا مطیع الرحمن مدنی نے تمام مہمانان، انتظامیہ اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس سے قبل توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ کی طرف سے شائع کردہ تین کتابوں کا اجرا عمل میں آیا۔

افتتاحی تقریب میں پرنٹ، الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا کے اہلکاروں کا ہجوم تھا جس کی وجہ سے میلے کے دوران جملہ سرگرمیوں کی ہرروز پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا میں خوب تشہیر کی گئی۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت ہیومن چین کے صدر انجینئر محمد اسلم علیگ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر خالد مبشر نے مشترکہ طور پر انجام دی۔

اسی دن شام کو ایک خوبصورت ثقافتی تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں مشہور گلوکارہ محترمہ اندارنائک ممبئی نے اردو غزل، صوفیانہ کلام اور قوالی سے سامعین کا دل موہ لیا۔

دوسرا دن: 18اپریل

دوسرے دن بارہ بجے 'اردو میڈیم اسکول اور اس کے چیلنجز' پر سمپوزیم منعقد ہوا، جس میں پروفیسر بلند اختر ہاشمی، پروفیسر راشد نہال (ڈائرکٹر اے ایم یو سینٹر کشن گنج) مفتی نسیم اختر، ڈاکٹر ظریف احمد، ڈاکٹر علی رضا صدیقی، جناب شفا حسن (ڈائرکٹر انسان اسکول، کشن گنج)، جناب تبریز ہاشمی، وغیرہ نے پر مغز تقریریں کیں۔ اکثر مقررین کا کہنا تھا کہ ملک کے دوسرے خطوں کے ساتھ سیمانچل میں بھی اردو میڈیم اسکولوں کے سامنے طرح طرح کے چیلنجز ہیں۔ اردو درسی کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ، اردو مدرسین کی قلت اور اردو سبجیکٹ کے تئیں طلبہ اور سرپرستوں کی عدم دلچسپی جیسے مسائل ہیں جن کو حل کرنا ضروری ہے۔ بعض مقررین نے یہ بھی کہا کہ اردو میڈیم اسکولوں کے مسائل چاہے جتنے بھی ہوں لیکن اردو زبان کی تعلیم وتدریس کی افادیت کو ہر شخص محسوس کرتا ہے، اس لیے اردو اسکولوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے حکومتوں اور عوام کو سامنے آنا ہوگا۔ اس موقعے پر اردو رسائل خصوصاً شمع، بیسویں صدی، نور وغیرہ کا بھی تذکرہ کیا کہ کس طرح یہ اور اس قسم کے دوسرے رسائل وجرائد اردو کی ترویج واشاعت میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ اس سیشن میں 'بزم ادب اردو لائبریری' کشن گنج کو زرخیز بنانے اور اردو کتابوں سے مزین کرنے کا لائحہ عمل بھی پیش کیا گیا۔

18اپریل کی ہی شام چار بجے بعنوان 'سول سروسز گائڈنس برائے اردو میڈیم طلبہ' ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا، جس میں پروفیسر راشد نہال، ڈاکٹر سرور عالم، ڈاکٹر رضی الرحمن، ڈاکٹر عزیز الرحمن، ڈاکٹر ریکھا رانی، ڈاکٹر جاوید احمد، جناب محمد ندیم انصاری وغیرہ نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس سیشن میں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کی سطح تک کے طلبہ نے حصہ لیا۔ ماہرین اور تجربہ کار اساتذہ نے سول سروسز کی تیاری کے حوالے سے طلبہ کی رہنمائی کی۔ طلبہ کو بتایا گیا کہ پی ٹی مینس اور انٹرویو کی تیاری کس طرح کی جائے۔

18اپریل کو ہی شام چھ بجے آل انڈیا مشاعرہ پروفیسر ارتضیٰ کریم (ڈائرکٹر اردو کونسل) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پہلے شمع روشن کی گئی پھر باضابطہ مشاعرے کا آغاز

ہوا جس میں علاقائی شعرا کو زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ مشاعرے میں سامعین کی زبردست بھیڑ تھی، پورا اسٹیج شعرا سے بھرا ہوا تھا۔ سامعین شعرا کے کلام سے جہاں لطف حاصل کر رہے تھے، وہیں داد و تحسین کی بارش بھی ہو رہی تھی۔ اس خطے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ لوگ مشاعرہ سننے کے لیے دور دراز علاقے سے بھی جمع ہو جاتے ہیں۔ مشاعرے میں جناب جہانگیر نایاب، جناب مبین اختر امنگ، تبریز ہاشمی، ہارون رشید غافل، ڈاکٹر قسیم اختر، جناب ممتاز نیر، جناب سالک رضا سالک، جناب حازم حسان، جناب شمس الہدیٰ معصوم، پروفیسر احمد حسن دانش، جناب خضر ندوی، ڈاکٹر انور ایرج، جناب نوشاد دیناج پوری، ڈاکٹر خالد مبشر وغیرہ نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا اور خوب داد تحسین حاصل کی۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر خالد مبشر نے انجام دیے۔

تیسرا دن: 9 اپریل

'اردو کے فروغ میں مدارس کا کردار' پر سمینار منعقد ہوا۔ جس میں جسیم اختر، مفتی جاوید اختر، مولانا غیاث الدین نے شرکت کی۔ صدارت کے فرائض مولانا مطیع الرحمن مدنی نے انجام دیے۔ جبکہ نظامت کی ذمے داری ڈاکٹر توقیر راہی (راقم) نے نبھائی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے اردو کے فروغ میں مدارس کے کردار کے حوالے سے ٹیلی فونک گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مدارس صرف دین کے قلعے نہیں ہیں بلکہ اردو کے بھی قلعے بن گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ بعض مدارس میں باضابطہ اردو نصاب میں داخل نہیں ہے لیکن مدارس میں ذریعہ تعلیم اردو ہی ہے اور سارے کام کاج اردو میں ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مدارس نے بڑے بڑے اردو کے افسانہ نگار، ادیب، نقاد، ناول نگار اور شاعر پیدا کیے ہیں۔ لہٰذا مدارس کی خدمات کو کسی طرح بھی کم کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔

تیسرے دن 9 اپریل کی شام چار بجے 'ادب اطفال' پر لیکچر کا اہتمام کیا گیا جس میں پانچی پارہ ہائی اسکول کے اردو استاد جناب جمیل اختر اور دیگر اساتذہ نے ادب اطفال پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اکثر مقررین نے کہا کہ 'کتاب مرکوز' کی جگہ 'طفل مرکوز' تعلیم بچوں کو دینی چاہیے اور بچوں کی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے نصاب تیار کرنا چاہیے نیز مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کرنا چاہیے، کیونکہ مادری زبان میں بچہ زیادہ سیکھتا ہے۔

شام چھ بجے ایک رنگا رنگ تقریب منعقد کی گئی جس میں فنکاروں نے مقامی زبان سرجاپوری میں گیت گا کر داد حاصل کی اور اس موقع پر سامعین کو سرجاپوری فلم 'پیاری سن بہن' بھی دکھائی گئی، جس میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ مزے دار بات یہ ہے کہ دیر رات تک سامعین گیت اور فلم سے محظوظ ہوتے رہے۔

چوتھا دن: 10 اپریل

چوتھے دن کے بارہ بجے 'سیما نچل کی ادبی خدمات' پر سمپوزیم کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر بلند اختر نے کی، جس میں جناب شفا حفیظ (ڈائرکٹر انسان اسکول)، ڈاکٹر سرور عالم، جناب علی رضا (قومی تنظیم)، ڈاکٹر ظریف احمد، جناب قسیم الرحمٰن وغیرہ نے حصہ لیا۔ اس پروگرام کی نظامت کے فرائض جناب عابد انور نے انجام دیے۔ جس میں درجنوں ادیبوں کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی جن میں کشن گنج ضلع کے مشہور تعلیمی ادارہ انسان اسکول کے بانی مرحوم ڈاکٹر سید حسن کی علمی و ادبی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈال کر لوگوں کو روشناس کرایا گیا۔ جہاں اس موقعے پر بطور مقرر تشریف فرما ممتاز صحافی و سرکردہ سماجی کارکن الحاج علی رضا صدیقی نے پدم شری مرحوم ڈاکٹر سید حسن کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ سید حسن صاحب نے ملک کے کئی نامور تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کی اور مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے

امریکہ گئے اور پھر وہیں نوکری حاصل کی۔ مگر اپنے وطن میں تعلیمی خدمات کی فکر اور للک نے انھیں واپس اپنے وطن آنے پر مجبور کیا اور قریب چالیس سال کی عمر میں انھوں نے 1964 میں کشن گنج جیسے تعلیمی پسماندہ علاقے میں انسان اسکول کی بنیاد ڈالی۔ جو آج کالج کی شکل میں خدمات انجام دے رہا۔ سیمانچل کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ہیومن چین کے صدر انجینئر محمد اسلم علیگ نے کہا کہ سیمانچل کا خطہ ادبی سرگرمیوں کے لیے زرخیز رہا ہے۔ ماضی میں آج سے 250 سال قبل ودیا دھر نے کتاب لکھ کر ایک زریں تاریخ رقم کی تھی اور تصنیف و تالیف کا کارواں آج بھی اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔

ڈاکٹر توقیر راہی (راقم) نے پھنیشور ناتھ رینو کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سیمانچل کا علاقہ ادبی، ثقافتی، لوک گیت اور شعر و شاعری کا مرکز رہا ہے۔ اس کا اندازہ ادیبوں اور شاعروں اور ناول و افسانہ نگاروں کی تحریروں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ پھنیشور ناتھ رینو نے 'میلا آنچل' لکھ کر ناول نگاری کے میدان میں ہندوستان بھر میں شہرت حاصل کی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ پریم چند کا اگر شاہکار ناول 'گئودان' ہے جو کہ 1936 میں شائع ہوا، تو وہیں رینو کے میل کا پتھر ناول 'میلا آنچل' ہے جو کہ 1954 میں منظر عام پر آتا ہے۔ یہی نہیں پھنیشور ناتھ رینو کے مارے گئے گلفام پر 'تیسری قسم' فلم بھی بن چکی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے سیمانچل کے ادبا و شعرا میں طارق جمیلی، شمس جمیلی، زبیر الحسن غافل، رضی احمد تنہا، حقانی القاسمی اور ڈاکٹر عبدالقادر شمس وغیرہ کی ایک لمبی فہرست بھی پیش کی۔ پھنیشور ناتھ رینو کے اسکول کے استاد جناب سالم اختر نے پھنیشور ناتھ رینو پر بڑی تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ آج بھی امریکہ، کناڈا وغیرہ ممالک سے تحقیق و تفتیش کے لیے لوگ ان کی سرزمین پر آتے رہتے ہیں۔

شام چار بجے ثقافتی پروگرام کے تحت 'اردو انفارمیشن ٹکنالوجی اور ڈیجیٹل انڈیا' پر مباحثہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مباحثے میں پروفیسر راشد نہال، انجینئر محمد اسلم علیگ، جناب رضا حفیظ (انسان اسکول)، جناب ندیم اختر، ڈاکٹر سرور عالم، محترمہ گلابی خاتون، انسان اسکول کے اساتذہ اور اے ایم یو سینٹر کشن گنج کے فیکلٹی ممبروں نے حصہ لیا۔ یہ مباحثہ نہایت مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوا، نیز ڈیجیٹل انڈیا اور انفارمیشن ٹکنالوجی کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی گئی۔

شام چھ بجے ثقافتی سرگرمیوں کے تحت 'بیت بازی' اور جدید گیت کی محفل سجائی گئی، جس میں 'ہمارا اسکول' بہادر گنج کے طلبہ نے حصہ لیا۔ اسکول کے ڈائرکٹر جناب ذکی انور کی رہنمائی میں یہ پروگرام نہایت کامیاب رہا۔ اس موقعے پر طلبہ نے حب الوطنی کے گیت بھی گائے۔ نارتھ ایسٹ کے کچھ اساتذہ اور طلبہ و طالبات نے ستار کے جدید راگ الاپے جو کہ قابل دید رہا۔ مزید برآں مختصر ڈرامہ، موسیقی اور شعر و شاعری کی بزم بھی آراستہ ہوئیں۔

پانچواں دن: 11 اپریل

پانچویں دن دوپہر بارہ بجے 'سوچھ بھارت ابھیان' کے موضوع پر لیکچر اور نکڑ ناٹک کا انعقاد ہوا۔ اس کلچرل پروگرام میں کشن گنج ضلع کے ڈی ای او اور اے ڈی ایم نے شرکت کی۔ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جناب رما شنکر نے جہاں اسلام کے حوالے سے صفائی ستھرائی پر روشنی ڈالی، وہیں قرآن کریم کی پہلی آیت 'اقرأ' پر تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ لوگ پانچ دس لاکھ کا مکان بناتے ہیں، لیکن بیت الخلا بنانے پر دھیان نہیں دیتے جو کہ بہت افسوسناک بات ہے۔ ایم ایس انٹرنیشنل اسکول کے طلبہ نے 'سوچھ بھارت ابھیان' پر نکڑ ناٹک بھی کیا۔ ساتھ ہی جامعۃ الامام بخاری کے طلبہ و طالبات نے 'جہیز کی لعنت' اور 'بچہ شادی' پر رنگارنگ پروگرام پیش کیا۔ اس کے علاوہ اروناچل پردیش کی ٹیم نے ساز و مضراب کے ذریعے راگ و راگنی سے سامعین کو خوش کیا۔

اسی دن چھ بجے شام کو 'مصنف سے ملاقات' عنوان کے تحت پروگرام میں اے ایم یو شاخ کشن گنج کے اساتذہ و طلبہ نے حصہ لیا، جس میں کچھ مصنفین کی کتابوں کا اجرا ہوا اور کچھ مصنفوں سے سوال و جواب کی محفل بھی سجی نیز ملاقاتیں بھی ہوئیں۔

چھٹا دن: 12 اپریل

چھٹے دن کتاب میلے کے ثقافتی پروگرام کے تحت 'اردو اور روزگار' پر تقریریں ہوئیں، جس میں جناب انس رحمانی (نمائندہ انقلاب)، جناب عابد انور (یو این آئی)، جناب فیضان اشرف، جناب نوشاد عالم (روزنامہ راشٹریہ سہارا) اور دیگر حضرات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب عابد انور نے اردو اور روزگار پر بڑی تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے کہا اردو میں روزگار کی کمی نہیں ہے، لیکن اردو کے ساتھ انگریزی زبان پر گرفت شرط ہے۔ انھوں نے یو این آئی کا حوالہ دیا کہ وہاں روزگار کے لیے اردو کے ساتھ انگریزی معلومات لازمی ہے۔ جناب انس رحمانی اور جناب نوشاد عالم نے بھی متذکرہ عنوان پر روشنی ڈالی۔ خلاصہ بحث یہ تھا کہ صحافت کے میدان میں روزگار کے لیے اردو کے ساتھ انگریزی پر گرفت ضروری ہے۔

چار بجے شام اردو کتاب میلے کی ثقافتی سرگرمیوں کے تحت 'جدید تعلیم کی افادیت' پر ایک سیمینار منعقد ہوا، جس میں مارواڑی کالج، کشن گنج کے سابق پرنسپل اور

مشہور سائنس داں پروفیسر ٹی وی آر کے راؤ، موجودہ پرنسپل (مارواڑی کالج)، پروفیسر سریندر راما نند، پروفیسر راشد نہال (ڈائرکٹر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کشن گنج سینٹر)، پروفیسر بلند اختر ہاشمی، ڈاکٹر ریکھا رانی، ڈاکٹر سجل پرساد، اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (ADM)، کشن گنج اور دیگر حضرات نے شرکت کی۔

پروفیسر ٹی وی آر کے راؤ نے جدید تعلیم پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ تعلیم کا بنیادی مقصد انسانی اقدار کا احیا اور بہتر سماج کا قیام ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے کہا کہ تعلیم کا مقصد انسان کو انسان بنانا ہے اور جو تعلیم انسان میں انسانیت پیدا کرنے میں ناکام رہے اسے نظر انداز کر دینا چاہیے۔ جدید تعلیم کے حوالے سے انھوں نے افسوس ظاہر کیا کہ تعلیم آج انسان کو اس جانب راغب کر رہی ہے جہاں انسانیت سے کوئی ناطہ نہیں ہے۔ مزید برآں انھوں نے نئی ٹکنالوجی کی افادیت پر زور ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ انسان کی بھلائی کے لیے آئی ہے، مگر انسان خود اس کا غلام بن گیا ہے۔ جب کہ پروفیسر راشد نہال نے کہا ٹکنالوجی ہمارے لیے ہے نہ کہ ہم ٹکنالوجی کے لیے۔ لہٰذا ہمیں ٹکنالوجی کو غلام بنانا چاہیے نہ کہ ہم خود غلام بن جائیں۔ ڈاکٹر ریکھا رانی نے کہا کہ نئی تعلیم کا مقصد لوگوں میں سوچ کی تبدیلی ہے نہ کہ لباس اور طرز زندگی میں اور نہ ہی مغربی تہذیب و تمدن اپنا لینے کا نام نئی تعلیم ہے۔ مارواڑی کالج کے موجودہ پرنسپل پروفیسر سریندر راما نند نے تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ تعلیم کا مقصد اندھیرے سے اجالے کی طرف سفر ہے۔ انھوں نے جدید تعلیم و ٹکنالوجی کے حوالے سے کہا کہ آج انٹرنیٹ کے ذریعے طلبہ اپنے سبجکٹ کے علاوہ پوری دنیا سے آشنا ہو رہے ہیں۔ ADM راشنکر نے مسلمانوں کی پسماندگی کی وجہ ترکِ تعلیم کو بتایا۔

چار بجے شام اردو کتاب میلے میں کلچرل پروگرام کے تحت 'جنگ آزادی میں سیمانچل کے مجاہدین کی خدمات' پر سمپوزیم منعقد ہوا۔ اس میں ڈاکٹر جنید حارث شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، مولانا مطیع الرحمٰن مدنی، سابق ایم ایل اے جناب اختر الایمان، جامعہ امام البخاری کے اساتذہ اور طلبہ نے شرکت کی۔ جناب اختر الایمان نے کہا کہ اردو کونسل نے اردو کتاب میلے کا انعقاد کر کے اس خطے کے لیے بڑا کام کیا ہے اور اس کی ستائش کی جانی چاہیے۔ کتاب زندگی اور انسان کی بہترین دوست ہوتی ہے، جس نے کتاب سے دوستی کر لی وہ کامیاب و کامران رہا۔ کتابوں سے ہم اپنے اسلاف کی دی ہوئی نایاب و نادر چیزیں حاصل کر کے حال کو خوشگوار بناتے ہیں اور مستقبل کے روشن امکانات کی امید رکھتے ہیں۔

اس طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے سینئر اسسٹنٹ پروفیسر جنید حارث نے ملک میں اردو کی موجودہ صورت حال کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جہاں اردو نے ملک کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے وہیں مسلمانوں نے ملک کی آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ اگر اردو زبان نہ ہوتی تو شاید جنگ آزادی کی تحریک میں اتنی جان پیدا نہ ہوتی۔ بارڈر سیکورٹی فورس (بی ایس ایف) کے ڈی آئی جی دیوی سرن سنگھ نے اردو سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ زبان اتنی شیریں ہے کہ مجھے مجبور ہونا پڑا کہ میں اسے سیکھوں اور میں نے اس زبان کو وقت نکال کر سیکھا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے کہا کہ میں نے بہتر اردو جاننے والے کو بے روزگار نہیں دیکھا۔ انھوں نے اپنے مسلم دوستوں کے حوالے سے کہا کہ یہ زبان آداب و تہذیب سکھاتی ہے۔ یہ محبت اور پیار کی زبان ہے اور محبت کرنا سکھاتی ہے اس لیے اسے کسی طرح سے بھی مذہب سے جوڑنا اچھی بات نہیں ہے۔

وہیں مولانا مطیع الرحمٰن نے کہا کہ جنگ آزادی

میں اردو کی خدمات اور مسلمانوں کی قربانیوں کی تاریخ کو جانے بغیر اس ملک کی تاریخ ادھوری رہے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس چھوٹے سے علاقے میں ملکی سطح کے پروگرام کا انعقاد کیا۔

جامعہ امام البخاری کے اساتذہ اور طلبہ نے مقالے پیش کیے۔ جن میں علمائے صادق پور اور ولایت علی پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔ مجموعی طور پر پروگرام بہت کامیاب رہا۔ نظامت کے فرائض محمد شاہنواز ندوی نے بحسن و خوبی انجام دیے۔

چھ بجے شام (12 اپریل) میلے کے ثقافتی سرگرمیوں میں 'شام نسواں' بہت کامیاب پروگرام رہا۔ اس میں توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ کے ادارہ جامعہ عائشہ الاسلامیہ کی طالبات نے مختلف عنوانات کے تحت محفلیں سجائیں۔ مثلاً 'قومی گیت'، 'اردو ہے میرا نام' وغیرہ قابل تعریف رہا۔ سب سے اہم بات یہ رہی کہ انگریزی، اردو اور ہندی تینوں زبانوں میں تقریر، بحث ومباحثہ پیش کیا گیا۔

ساتواں دن: 13اپریل

ساتویں دن بارہ بجے میلے کے ثقافتی پروگرام کے تحت 'مادری زبان کی اہمیت' پر سمینار منعقد ہوا۔ اس میں مولانا اظہار احمد قاسمی، مفتی جسیم اختر قاسمی، ماسٹر مرغوب عالم، ماسٹر مہتاب عالم، جناب تفہیم الرحمن اور دیگر حضرات نے حصہ لیا۔

مادری زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے دارالعلوم کشن گنج کے مہتمم مولانا اظہار احمد قاسمی نے کہا کہ جب مدارس اسلامیہ کا وجود ہے تو اردو کے مستقبل کے لیے فکر مند اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مدارس میں نہ صرف ذریعۂ تعلیم اردو ہے بلکہ روزمرہ کے کام کاج اردو میں ہی ہوتے ہیں۔ مزید انھوں نے کہا کہ رامائن، مہابھارت، گیتا اور دیگر مذاہب کی کتابیں بھی اردو میں موجود ہیں۔ اس سے اردو کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دارالعلوم بہادر گنج کے استاذ حدیث مفتی جسیم الدین قاسمی نے کہا کہ حکومت سے شکوہ کرنے کے بجائے خود اس کی ترقی و اشاعت میں کوشش کرنا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ رات دن ہم اردو کا رونا روتے ہیں، لیکن جب شادی کا کارڈ چھپوانے کی باری آتی ہے تو انگریزی میں چھپواتے ہیں۔ انجینئر اسلم علیگ نے کہا کہ وہی لوگ تعلیمی میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے ہیں، جن کی تعلیم مادری زبان میں ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مادری زبان کی اہمیت اور اس کی حفاظت کی بھی فکر کی جانی چاہیے۔

ٹھاکر گنج کالج کے استاذ ساجد اکرم نے تعلیم کو مادری زبان میں دینے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس سے طلبہ میں تعلیم کے تئیں دلچسپی پیدا ہوگی۔ کشن گنج میں اردو تحریک کے صدر ماسٹر مرغوب عالم نے مادری زبان اور اردو کے تعلق سے کئی مثالیں پیش کرتے ہوئے اس کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

علاوہ ازیں انٹرنیشنل آکسفورڈ اسکول کے بچوں نے پروگرام داستان گوئی پیش کیا اور اس کے ڈائرکٹر تفہیم الرحمان نے بھی اس موقع پر اظہار خیال کیا۔ اس کے علاوہ برکات رضا پورنیہ کے طلبہ نے نعت پیش کرنے کے ساتھ 'آؤ اردو سیکھیں' کے عنوان سے نکڑ ناٹک پیش کیا۔ اردو کے حوالے سے کیریئر گائڈ اکیڈمی ارریہ کے طالب علم سفیان طارق نے اردو کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ کیریئر گائڈ اکیڈمی ارریہ کے ڈائرکٹر سبطین احمد نے زبان کے تعلق سے پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کیا۔

چھ بجے شام (13 اپریل) کو 'سیلاب' نکڑ ناٹک پیش کیا گیا۔ جس میں جامعہ برکات رضا پورنیہ کے طلبہ نے حصہ لیا۔

آٹھواں دن: 14اپریل

آٹھویں دن پانچ بجے شام کو 'اردو کے فروغ میں NCPUL کی خدمات' پر ڈاکٹر فیروز عالم نے روشنی ڈالی۔ انھوں نے مختلف اسکیموں کا تفصیلی خاکہ پیش کیا۔ مزید برآں مختلف تنظیموں کے ذریعے پوچھے گئے سوالات کا جواب دیا۔

چھ بجے شام (14 اپریل) کو فوسٹر کڈس پلے اسکول کے بچوں نے رنگارنگ پروگرام کے ذریعے اپنے جوہر دکھائے۔ اس میں اسکول کے ڈائرکٹر جناب مشکور فیضی بچوں کی رہنمائی کررہے تھے، چھوٹے چھوٹے بچوں کا یہ پروگرام قابل دید تھا۔

نواں دن: 15اپریل

نویں دن شام چار بجے 'اردو سوشل میڈیا اور فلم' پر ایک ٹیبل ڈسکشن کا پروگرام منعقد ہوا، جس میں ڈاکٹر تجلی پرساد، ڈاکٹر سرور عالم، جناب ذیشان وغیرہ نے حصہ لیا۔ اس اسٹیج TV پروگرام کے انداز میں سجایا گیا۔ مجموعی طور پر کامیاب پروگرام رہا۔ ساتھ ہی جامعہ نوریہ برکات العلوم پورنیہ کے بچوں نے نعتیہ کلام سے سامعین کو خوب محظوظ کیا۔

شام سات بجے اختتامی اجلاس منعقد ہوا، جس میں میلے کی کارکردگی، اس کی افادیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی اور اس بات کا عزم کیا گیا کہ کس طرح اردو زبان وتہذیب کو عام کیا جائے۔

میلے کے انچارج اور اردو کونسل کے ریسرچ آفیسر

جناب شہواز محمد خرم، ڈاکٹر فیروز عالم، جناب محمد احمد صاحب، جناب محمد احمد خان صاحب اور کونسل کے دیگر کارکنان کے ساتھ ساتھ میلے میں آئے ناشرین کے اہلکاروں نے میلہ اور اس کے تحت منعقد ہونے والے علمی وثقافتی پروگراموں کو کامیاب بنانے میں نہایت اہم رول ادا کیا۔ یو این آئی کے سینئر صحافی جناب عابد انور صاحب پورے پروگرام میں موجود رہے اور ہر دن کی خبریں ملک بھر کے اخبارات کو فراہم کرتے رہے۔ کونسل کی جانب سے ڈاکٹر شاہد اختر میڈیا انچارج کی حیثیت سے پوری طرح سرگرم رہے۔

شام سات بجے (15 اپریل) اختتامی اجلاس منعقد ہوا، جس میں کشن گنج ضلع کے اے ڈی ایم، ایس پی کشن گنج، جناب پروفیسر راشد نہال، ڈاکٹر تجلی پرساد، انجینئر محمد اسلم علیگ، کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب کمل سنگھ، میلے کے انچارج اور ریسرچ آفیسر جناب شہواز محمد خرم، ڈاکٹر فیروز عالم وغیرہ نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر توقیر راہی (راقم) نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ اختتامی اجلاس کا آغاز گل پوشی سے ہوا۔

میلے کے اختتام پر ٹیلی فونک گفتگو کے دوران کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ کشن گنج کے لوگوں کے مثبت رویے سے قومی اردو کونسل کا بائیسواں کل ہند اردو کتاب میلہ کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوسکا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس قسم کے کتاب میلے کا انعقاد سیمانچل کی سرزمین میں پہلی بار کیا گیا۔ کتاب میلے میں نہ صرف لوگوں کی سوچ کے دریچے وا ہوئے بلکہ کتاب کے تعلق سے ان کا والہانہ اور جذباتی رشتہ بھی استوار ہوا جو یقیناً مستقبل کے لیے خوش آئند بات ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کسی بھی کام کی کامیابی کا دارومدار لوگوں کی شمولیت سے ہوتا ہے۔ اس میلہ کو کامیاب بنانے میں طلبہ وطالبات، اساتذہ، شائقین کتب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھوں نے عمائدین شہر، پرنٹ والیکٹرانک میڈیا، ضلع انتظامیہ اور اے ایم یو کشن گنج سینٹر کے ڈائرکٹر پروفیسر راشد نہال کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا۔ کتاب میلہ کے اختتامی اجلاس میں کشن گنج کے ایس پی جناب راجیو مشرا نے بحیثیت مہمان ذی وقار شرکت کی اور میلے کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا۔ اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب کمل سنگھ نے کہا کہ یہ میلہ اس لحاظ سے بھی اپنے مقصد میں کامیاب رہا کہ سیمانچل کے عوام کو ملک بھر کے پبلشرز کی کتابیں دستیاب ہوسکیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کونسل اردو زبان وادب سے متعلق سیمینار، کانفرنس اور کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی تعاون بھی فراہم کرتی ہے تاکہ اردو کی کتابیں لوگوں تک آسانی سے پہنچ سکیں۔ انھوں نے آخر میں ہیومن چین کے صدر انجینئر اسلم علیگ اور توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ کے چیئرمین مولانا مطیع الرحمٰن مدنی اور ضلع انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا۔ علاوہ ازیں انھوں نے میلے کو کامیاب بنانے کے لیے اردو کونسل کے ذمے داران کا شکریہ ادا کیا خصوصاً میلے کے انچارج اور ریسرچ آفیسر جناب شہواز محمد خرم کا۔ اس موقعے پر انھوں نے ملک بھر کے طول وعرض سے آئے ہوئے تمام پبلشرز نیز مخلصین ومعاونین کا شکریہ ادا کیا۔ انجینئر محمد اسلم علیگ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کتاب میلے کے ذریعے جہاں سیمانچل کی سماجی اور تعلیمی صورت حال جاننے کی کوشش کی گئی، وہیں یہاں کے ادیب، مصنف، شاعر، ماہر تعلیم اور سماجی شخصیات جن کو لوگوں نے بھلا دیا تھا ہم انھیں ایک پلیٹ فارم پر لانے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے کشن گنج کے تمام خواتین وحضرات، میڈیا، انتظامیہ اور اردو کونسل کے عملے خاص کر قومی کونسل کے ڈائرکٹر کا شکریہ ادا کیا۔ میلے کا اختتام میلے کے انچارج اور روح رواں جناب شہواز محمد خرم کے اظہار تشکر پر ہوا۔

■

Dr. Tauqir Rahi
NCPUL, Jasola Institutional Area
New Delhi - 110025

ممتحنہ اختر

شبلی کی ہیئت پسندی
سرسید تحریک کے تناظر میں

علی گڑھ تحریک کے اثرات سے اجتماعی سطح پر جو تنقید ابھر کر سامنے آئی اگر چہ اس میں اخلاقی، اصلاحی اور سماجی پہلو زیادہ نمایاں ہے جس وجہ سے مواد و موضوع ہی کو بنیادی اہمیت حاصل رہی تاہم انفرادی سطح پر اسی تحریک کے اثرات سے تنقید میں ایسے تصورات بھی سامنے آئے، جس میں فنی وجمالیاتی پہلو کو خاص تقویت حاصل ہوئی۔ ان تنقیدی تصورات کو منظر عام پر لانے میں شبلی کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ شبلی نے حالی کی طرح نظری وعملی دونوں قسم کی تنقیدوں کی طرف توجہ دی۔ علی گڑھ تحریک کے اثرات بھی ان پر خاصے نمایاں رہے۔ وہ سرسید کے عظیم رفقاء اور علی گڑھ تحریک کے خاص اراکین میں سے تھے انھوں نے بھی قومی وملی احساس کو بیدار کرنے کے لیے علمی وادبی خدمات انجام دیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر اور اصلاحی وسماجی پہلوان کے یہاں بھی اہم قرار پائے۔ نئی تہذیب وتمدن اور نئے تغیرات کے اثرات انھوں نے بھی قبول کیے۔ قدیم اصول تنقید سے قطع نظر شعر وادب کے مختلف اجزائے ترکیبی کو انھوں نے بھی ایک نئے نقطۂ نظر سے دیکھا، جانچا اور ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی۔ مختصراً اس تحریک کے یا سرسید کے اجرا کیے گئے پرچے' تہذیب الاخلاق، کے اثرات دوسرے ادیبوں وانشا پردازوں کی طرح ان پر بھی نمایاں رہے چنانچہ اس کے پیش نظر انھوں نے خود لکھا ہے کہ:

''ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمران ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں بعض نے اردو سے فیض اٹھایا بعض نے مدعیانہ اپنا راستہ الگ نکالا تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے ہیں۔''[1]

اگر چہ بعض مذہبی، سماجی اور سیاسی امور میں انھوں نے سرسید کی مخالفت بھی کی یا اس سے الگ ایک جدا گانہ راستہ بھی اختیار کیا۔ تاہم مجموعی حیثیت سے وہ اس تحریک سے بالواسطہ یا بلا واسطہ متاثر رہے بلکہ ایک معلم، ادیب اور مورخ کی حیثیت سے ان کو اسی تحریک سے جلا ملی چنانچہ انھوں نے خود اس کا اعتراف کیا ہے لکھتے ہیں:

''یہ سچ ہے کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی زندگی قرار پاسکتا ہے تو اس کا آغاز اس کی نشو ونما' اس کی ترقی اس کی نمود، اس کا امتیاز جو کچھ ہوا ہے اس کالج سے ہوا ہے''[2]

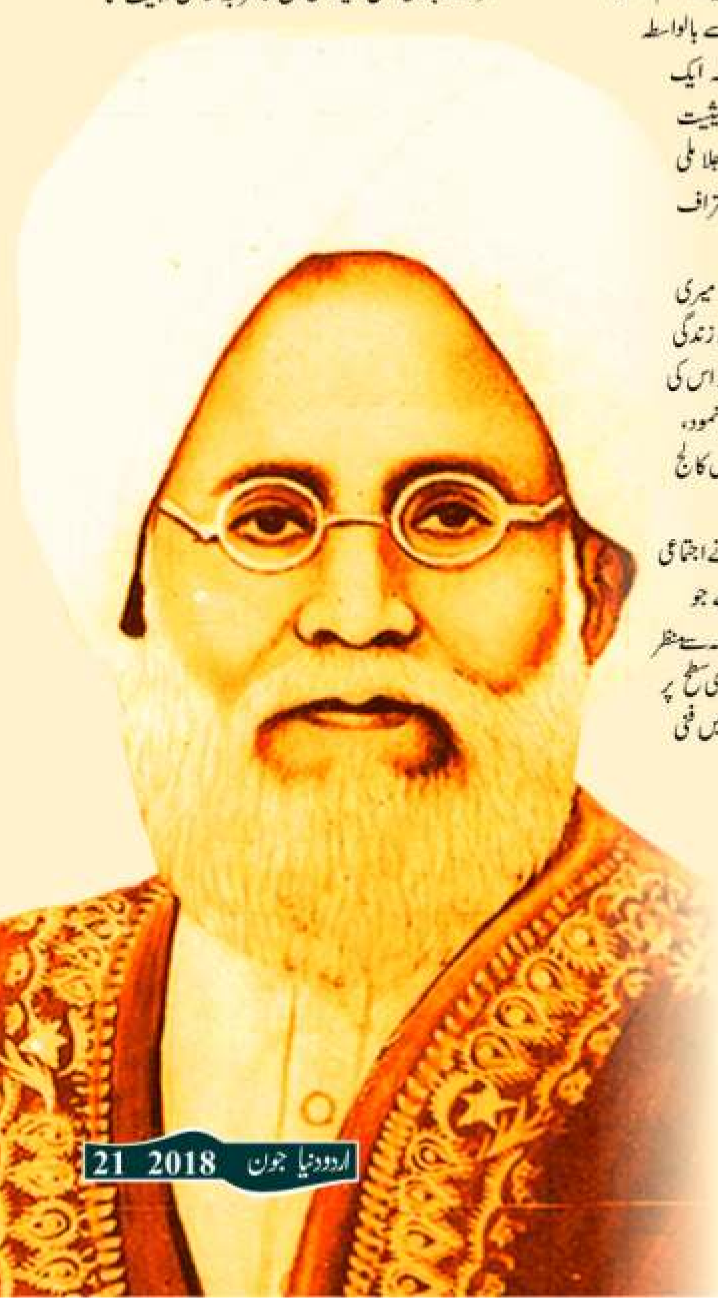

تنقید میں بھی انھوں نے اجتماعی سطح پر وہی اثرات قبول کیے جو علی گڑھ تحریک یا حالی کے مقدمہ سے منظر عام پر آچکے تھے۔ لیکن انفرادی سطح پر ان اثرات کے مقابلے میں فنی وجمالیاتی احساس ان کے تنقیدی تصورات میں زیادہ قوی رہا۔ وقتی مصلحت کے پیش نظر یا اجتماعی سطح پر وہ افادیت و مقصدیت کے قائل ضرور رہے لیکن ان کی ذہنی ونفسیاتی مناسبت اور ان کے رچے ہوئے ذوق ومذاق نے انھیں ادب کے جمالیاتی پہلو کی طرف ہی مائل رکھا۔ جس وجہ سے لفظی وہیئتی پہلو کی طرف انھوں نے زیادہ توجہ دی بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

''شبلی کا جمالیاتی اور رومانی مسلک شعر کی طرف جھکاؤ دراصل ان کی نفسیاتی اور طبعی خصوصیت کی نشاندہی کرتا ہے''[3]

اس کے علاوہ مشرقیت کا، مشرقی تعلیم وتہذیب کا، مشرقی شعر وادب کا، مشرقی انداز فکر کا رنگ بھی جدید رجحانات کے مقابلے میں ان کے دوسرے نظریات کی طرح ادبی روایات ورجحانات پر بھی زیادہ غالب رہا جس وجہ سے بھی انھوں نے ادب کے فنی ولفظی پہلو کو معنوی پہلو سے زیادہ اہمیت دی۔

شبلی نے یوں تو تاریخ، مذہب اور ادب تینوں کی طرف توجہ دی لیکن تنقید میں ان کا مرتبہ خاص اہمیت کا

حامل ہے ان کے تحقیقی اور تنقیدی کارناموں میں بیان خسرو، سوانح عمری مولانا روم، موازنہ انیس و دبیر اور شعرالعجم کی پانچ جلدیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے تنقیدی خیالات ان تمام تصانیف میں بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن باضابطہ اور منظم طریقے سے ان کے تنقیدی تصورات 'شعرالعجم' کی چوتھی جلد کے پہلے حصے میں نظر آتے ہیں۔ جو ان کے تنقیدی مسلک پر خاص طور پر روشنی ڈالتے ہیں۔

شبلی نے اپنے تنقیدی نظریات میں یوں تو مواد اور ہیئت دونوں کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ شعری حقیقت کے مختلف بیانات کے پیش نظر بھی انھوں نے جذبات اور اس کے موثر اظہار پر روشنی ڈالی ہے۔ موازنہ انیس و دبیر میں انھوں نے کسی قدر اس کی وضاحت بھی کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

''شاعری کے دو جز ہیں مادہ و صورت، یعنی کیا کہنا چاہیے اور کیونکر کہنا چاہیے انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے، سننے یا کسی حالت یا واقعے کے پیش آنے سے جوش و مسرت، عشق و محبت درد و رنج .... وغیرہ وغیرہ کی جو حالت پیدا ہوتی ہے اس کو جذبات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان جذبات کا ادا کرنا شاعری کا اصل ہیولا ہے...... لیکن یہ شرط ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس انداز سے کہا جائے کہ جو اثر شاعر کے دل میں ہے، وہی سننے والوں پر بھی چھا جائے یہ شاعری کا دوسرا جز یعنی صورت ہے اور انھی دونوں چیزوں کے مجموعے کا نام شاعری ہے۔''[4]

لیکن شعری حقیقت کے تجزیہ میں فنی و جمالیاتی خوبیوں پر جس انداز اور جس صراحت کے ساتھ انھوں نے روشنی ڈالی ہے اس سے ان کے یہاں لفظی و ہیئتی خوبیوں کی قدر و قیمت معنی و مواد سے کسی قدر بڑھ جاتی ہے۔ اگر چہ شاعری کے بنیادی یا معنوی عناصر یعنی تخیل، اصلیت و واقعیت اور سادگی وغیرہ کو لے کر شعرالعجم میں انھوں نے تقریباً انھی خیالات کی تائید کی ہے جو مقدمہ میں حالی کے پیش نظر رہے ہیں لیکن حالی کے مقابلے میں انھوں نے بعض ایسے عناصر اور جزئیات کی بھی نشاندہی کی ہے جن کا تعلق مخصوص طور پر شعر کے ہیئتی و فنی پہلو سے وابستہ ہے اور شعری حقیقت کے پیش نظر وہ انھیں بنیادی اہمیت دیتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ جیسے شعری حقیقت کی بنیاد وہ تخیل کے ساتھ ساتھ محاکات پر بھی رکھتے ہیں جو ان کے یہاں شعر کے ہیئتی و فنی پہلو کی نشاندہی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ محاکات ان کے نزدیک ''کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے''[5] محاکات کو وہ 'شاعرانہ مصوری'[6] بھی قرار دیتے ہیں۔ اگر چہ ان کے نزدیک محاکات کی

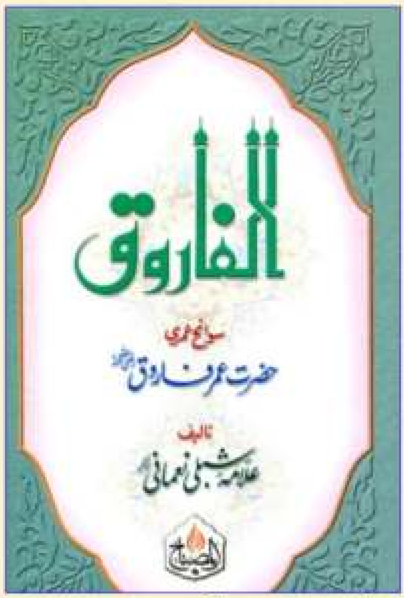

جان تخیل میں پوشیدہ ہے یا تخیل ہی شعری اصلیت کی بنیاد قرار پاتا ہے لیکن محاکات اور تخیل کے تفصیلی تجزیہ میں ان کا جھکاؤ محاکات اور ان کے متعلقات کی طرف ہی زیادہ رہتا ہے بلکہ شعری حقیقت بھی ان کے یہاں کئی جگہوں پر محاکات اور ان سے جڑے متعلقات ہی قرار پاتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

''شاعری کس چیز کا نام ہے، کسی چیز کا، کسی واقعے کا کسی حالت کا، کسی کیفیت کا اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔''[7]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''شاعری کیا ہے درحقیقت مصوری ہے۔''[8]

محاکات کا تصور اگر چہ شبلی نے ارسطو کے ہاں سے لیا ہے اور وہ اسے اس معنی میں قبول بھی کرتے ہیں جو معنی ارسطو کے ہاں اس کے رہے ہیں یعنی اصل کی نقل لیکن ارسطو کے برعکس وہ اس کا تصرف کافی وسیع پیمانے پر سامنے لاتے ہیں بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ فصاحت و بلاغت اور علم بیان یا مشرقی شعر و نقد کے تمام اصول و قواعد کی ترجمانی ان کے یہاں محاکات سے ہو جاتی ہے چنانچہ شعرالعجم میں محاکات کے تجزیہ و تفصیل کے ضمن میں وہ جن چیزوں سے یا جن اصولوں سے محاکات کی تکمیل کرتے ہیں وہ اصل میں فصاحت و بلاغت کے ہی اصول ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

1۔ ''جس شے کا بیان کرنا ہے اس کی جزئیات کا اس طرح استقصا کیا جائے کہ پوری شے کی تصویر نظر کے سامنے آجائے مثلاً اگر احباب کی مفارقت کا واقعہ لکھنا ہے تو ان تمام جزئی حالات اور کیفیات کا استقصا کرنا چاہیے جو اس وقت پیش آتی ہیں۔[9]

2۔ ''اکثر چیزیں اس قسم کی ہیں کہ ان کے مختلف انواع ہوتے ہیں اور ہر نوع میں الگ الگ خصوصیت ہوتی ہے۔ مثلاً آواز ایک عام چیز ہے اس کے مختلف نوعیں ہیں، پست، بلند، شیریں، کرخت، سریلی وغیرہ..... اب جب کسی چیز کی محاکات مقصود ہو تو ٹھیک وہی الفاظ استعمال کرنے چاہیں جو ان خصوصیات پر دلالت کرتے ہیں۔''[10]

3۔ ''جب کسی قوم یا کسی ملک یا کسی مرد یا عورت یا بچہ کی حالت بیان کی جائے تو ضرور ہے کہ ان تمام خصوصیات کا لحاظ رکھا جائے۔''[11]

شبلی کے یہ تمام امور فصاحت و بلاغت کے انھیں اصولوں پر دلالت کرتے ہیں یا مطابقت رکھتے ہیں جن کے مطابق کلام کو یا اس میں پیش کیے گئے الفاظ کو موقع و مناسبت یا خواہش و ضرورت کے مطابق استعمال میں لایا جاتا ہے یا ایک خاص تناسب و توازن کے مطابق کلام میں پیش کیے گئے الفاظ کو ترکیب دیا جاتا ہے تا کہ وہی اثر وہی کیفیت اور وہی منظر آنکھوں میں پھر جائے جو خود واقعے کے پیش آنے سے پھر جاتا ہے چنانچہ'موازنہ انیس و دبیر' میں انیس کے کلام کو بلاغت کے معیار پر سراہتے ہوئے شبلی ان الفاظ میں ان خیالات پر روشنی ڈالتے ہیں:

''ہر واقعے اور ہر معاملے کے بیان کرنے میں بلاغت کا یہ اقتضا ہے کہ اس کی تمام خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں کہ دلوں پر وہی اثر طاری ہو جو خود واقعے کے پیش آنے سے پڑتا ہے۔ میر انیس کے کلام میں عموماً یہ وصف پایا جاتا ہے۔''[12]

بعینہ اسی خیال کو محاکات کے ضمن میں شعرالعجم میں انھوں نے اس طرح پیش کیا ہے:

''محاکات کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو یعنی جس چیز کا بیان کیا جائے اس طرح کیا جائے کہ خود وہ شے مجسم ہو کر سامنے آئے۔''[13]

فصاحت و بلاغت کے انھی اصولوں کی بنا پر اصل میں شبلی محاکات کی تکمیل میں دقیق و باریک، جزئی، مخالف اور مبہم خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہیں اور انھی اصولوں کی بنا پر اصل میں ان کے نزدیک شاعری کے یا شعرا کے مراتب و مدارج میں تفاوت ہوتا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

''محاکات میں نہایت فرق مراتب ہے اور اسی فرق مراتب کی بنا پر شاعری کے مدارج میں نہایت تفاوت ہے..... اس قسم کے دقائق اور باریکیاں محاکات میں پائی جاتی ہیں اور یہی نکتے ہیں جن کی بنا پر شعراء میں فرق مراتب ہوتا ہے۔''[14]

تخیل کی تفصیل و تشریح میں چاہے شبلی نے کتنے ہی

گہرے اور باریک خیالات کی نشاندہی کی ہو لیکن جمالیاتی، تاثراتی اور فنی خوبیوں کی نشاندہی ان کے یہاں محاکات سے ہی ہو جاتی ہے۔" ان کے خیال میں شاعرانہ مصوری ہمارے لیے مسرت وانبساط فراہم کرتی ہے یہ انبساط ہر طرح کے مناظر اور اشیاء کی تصویر کشی سے حاصل ہو سکتا ہے اس کے لیے خوب صورت یا بدصورت ہونے کی کوئی قید نہیں"15 چنانچہ لکھتے ہیں:

"کسی چیز کی اصلی تصویر کھینچنا خود طبیعت میں انبساط پیدا کرتا ہے۔ وہ شے اچھی ہو یا بری اس سے بحث نہیں مثلاً چھپکلی کی ایسی تصویر کھینچ دے کہ بال برابر فرق نہ ہو تو اس کو دیکھنے سے خواہ مخواہ لطف آئے گا۔"16

اس لیے شعری اظہار شعری خیال سے ان کے یہاں زیادہ اہم قرار پاتا ہے اور اس اظہار میں فنی کمال وفنی مہارت یا جدید انداز اور نیا اسلوب ہی شعری حقیقت کی اصل بنیاد قرار پاتا ہے۔ اس لیے وہ شعری حقیقت کو جدت ادا یا بدیع الاسلوبی سے بھی منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"شاعری کے لیے یہ سب سے مقدم چیز ہے بلکہ بعض اہل فن کے نزدیک جدت ادا ہی کا نام شاعری ہے......ایک بات سیدھی طرح سے کہی جائے تو ایک معمولی بات ہے اسی کو اگر جدید انداز اور نئے اسلوب سے ادا کر دیا جائے تو یہ شاعری ہے۔"17

اور ایک جگہ لکھتے ہیں:

"بدیع الاسلوبی کے معنی کسی خیال کو جدید اور عجوبہ زا پیرائیہ میں ادا کرنا ہے یہ وہ صنف ہے کہ بہت سے اہل فن کے نزدیک اسی کا نام شاعری ہے۔"18

اس جدت ادا یا بدیع الاسلوبی کے لیے وہ سادگی ادا کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہے کیونکہ ان کے نزدیک "شاعری کی بڑی خوبی جدت ادا ہے" اور اسی جدت ادا پر شاعری کا کمال منحصر ہے بلکہ ان کے نزدیک "شاعری، انشا پردازی، بلاغت ان تمام چیزوں کی جادوگری اسی جدت ادا پر موقوف ہے"19 لکھتے ہیں:

"شاعری کی بڑی خوبی جدت ادا ہے، جدت ادا میں بات کو خواہ مخواہ کسی معمولی پیرایہ سے بدل کر اور اصل راستہ سے ہٹ کر بیان کرنا ہوتا ہے اس لیے شاعر کو اس موقع پر سخت مشکل کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں سادگی ادا کو قائم رکھنا، گویا اجتماع النقیضین ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں شاعری کے کمال کا یہی موقع ہے......اس صورت میں جدت کی وجہ سے سادگی میں کسی قدر فرق پیدا ہوگا تو اور باتیں اس کی تلافی کر دیں گی۔"20

تشبیہ واستعارہ بھی اصل میں شبلی کے ہاں اسی بدیع الاسلوبی یا جدت ادا سے متعلق ہیں کیونکہ جدت ادا بدیع الاسلوبی کی نشاندہی ان کے یہاں جن خیالات سے ہوتی ہے ان میں تشبیہ واستعارہ ایک خاص عنصر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں بلکہ شعری حقیقت (جو ان کے نزدیک کئی جگہوں پر اصل میں جدت ادا ہی ہے) کی تصریحات میں بھی وہ کئی جگہوں پر تشبیہ واستعارہ کو خاص اہمیت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

1۔ "یہ چیزیں (تشبیہ واستعارہ) حسن کلام کا زیور ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ نظم ونثر اور تقریر میں جو کچھ جادوگری ہے بہت کچھ انہیں کی بدولت ہے۔"21

2۔ "یہ چیزیں (تشبیہ واستعارہ) شاعری بلکہ عام زبان آوری کے خط وخال ہے جس کے بغیر انشا پردازی کا جمال قائم نہیں رہ سکتا۔"22

3۔ "اکثر موقعوں پر تشبیہ واستعارہ سے کلام میں جو وسعت وزور پیدا ہوتا ہے وہ اور کسی طریقے سے نہیں پیدا ہو سکتا۔"23

انہی لفظی وفنی خصوصیات کے پیش نظر شبلی الفاظ کے حسن کو مواد وموضوع پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک "مضمون تو سب پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن شاعری کا معیار کمال یہی ہے کہ مضمون ادا کن الفاظ میں کیا گیا ہے اور بندش کیسی ہے"24 وہ حسن الفاظ کے تقدیم کے پیش نظر جو موقف اختیار کرتے ہیں اس موقف کے پس پشت اصل میں فصاحت وبلاغت اور علم بیان کے وہ تمام اصول کار بند رہتے ہیں جنھیں وہ شعری حقیقت کے پیش نظر بنیادی اہمیت دیتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

'شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے گلستان میں جو مضامین اور خیالات ہیں، ایسے اچھوتے اور نادر نہیں، لیکن الفاظ کی فصاحت اور ترتیب اور تناسب نے ان میں سحر پیدا کر دیا ہے۔ ان ہی مضامین اور خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا رہے گا۔"25

مختصراً شاعری میں الفاظ کی، ان کے ترتیب وتناسب کی، ان کے توازن وتوافق کی جدت وندرت ہی اصل میں شبلی کے ہاں شاعری کا بنیادی وصف قرار پاتا ہے جس کا اعتراف انھوں نے خود یہ کہہ کر کیا ہے کہ "شاعری کی بڑی خوبی جدت ادا ہے"26 اس لیے الفاظ کے انواع اور ان کے مختلف اثر، ان کی ہلکی، ان کی گرانی، ان کی شستگی، ان کی شناخت وشوکت، ان کا نازک ولطیف پن ہی شبلی کے نزدیک معنی ومواد میں اثر وتاثیر پیدا کرتے ہیں اور سب سے مقدم ان الفاظ کا باہمی تعلق وتناسب یعنی ان کی ہم آہنگی، ان کا ہم ساز وہم آواز ہونا ہی (جس کو شبلی انجسام کا نام دیتے ہیں) شبلی کے ہاں شعر کی قدر وقیمت متعین کرتے ہیں اور اسی وصف سے ان کے نزدیک شعر میں موسیقیت پیدا ہوتی ہے اور شاعری اور موسیقی کی سرحدیں مل جاتی ہیں اس لیے شبلی کے نزدیک شعری حقیقت یہ بھی قرار پاتی ہے کہ:

"شعر الفاظ، وزن، نغمہ اور رقص کے مجموعے کا نام ہے۔"27

یہی ترتیب وتنظیم اصل میں شبلی کے ہاں شعری حسن یا شعری خوبی ہے اور اس شعری حسن سے ان کے نزدیک طبیعت میں وہ لذت وانبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو شاعری کا اصل مقصد ہے۔ محاکات، فصاحت وبلاغت بھی اصل میں ان کے نزدیک یہی ترتیب وتنظیم ہے جو طبیعت کو ایک جمالیاتی حظ عطا کرتی ہے۔

شبلی نے اپنی عملی تنقید میں بھی اصل میں اسی شعری حسن کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے مختلف شعرا کے کلام پر روشنی ڈالی ہے مخصوص طور پر 'موازنہ انیس ودبیر' میں انیس کے کلام کا جائزہ اور موازنہ انھوں نے اسی معیار کے پیش نظر لیا ہے چنانچہ انیس کے کلام کو سراہتے ہوئے انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"میر انیس کے کلام کا اصلی جوہر بندش کی چستی، ترکیب کی دل آویزی الفاظ کا تناسب اور برجستگی وسلاست ہے۔"28

شبلی نے اسی شعری حسن یا اسی ترتیب وتنظیم یا داخلی وخارجی ہیئت کی بنا پر انیس ودبیر کے علاوہ اردو اور فارسی کے مختلف شعرا کے منتخب کلام کا موازنہ کیا ہے چنانچہ 'موازنہ انیس ودبیر' میں انیس ودبیر کے کلام کا موازنہ وہ اس طور پیش کرتے ہیں:

تھا بلبل خوش گو کہ چہکتا تھا چمن میں

(مرزا دبیر)

بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

(میر انیس)

شبلی لکھتے ہیں کہ ان میں "مضمون بلکہ الفاظ تک مشترک ہیں لیکن ترکیب کی ساخت نے دونوں شعروں میں کافی فرق پیدا کر دیا ہے"29 انیس کے کلام میں اس لحاظ سے جو خوبی اور جو وصف ان کو نظر آتا ہے وہ مرزا دبیر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ چنانچہ مرزا دبیر کے کلام کا اسی معیار پر جائزہ لیتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں کہ:

1۔ "مرزا دبیر کے کلام میں وہ فصاحت اور شستگی نہیں جو میر انیس کے کلام میں ہے۔"30

2۔ ''مرزا صاحب اکثر ثقیل او رغریب الفاظ استعمال کرتے ہیں۔''31

3۔ ''بعض الفاظ بجائے خود ایسے ثقیل اور گراں نہیں ،لیکن مرزا صاحب جن ترکیبوں کے ساتھ ان کو استعمال کرتے ہیں، ان سے نہایت ثقل اور بھدا پن پیدا ہو جاتا ہے۔''32

4۔ ''فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی۔ بندش میں تعقید اوراغلاق، تشبیہات اور استعارات اکثر دور از کار، بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔''33

حسن کلام اور حسن الفاظ کی یہ توجیہہ وتفصیل ہی وہ وصف ہے جو شبلی کو جمالیاتی ،فنی نیز ہیئتی نقاد کی صف میں لاکھڑا کرتی ہے او راس توجیہہ وتفصیل میں ان کا شعری مذاق ،ان کا مشرقی مزاج اور ان کی جمالیاتی فکر سب جلوہ گر ہو کر سامنے آتی ہیں۔اس لیے ان کے یہاں حالی کی طرح اصلیت یا شعر کی معنوی خوبی شعری حقیقت کی بنیاد نہیں بنتی بلکہ شعر کا صوری یا ہیئتی پہلو شعر کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔وہ تخیل پر حالی سے بڑھ کر اپنی گہری سوچ کا ثبوت ضرور دیتے ہیں اس کے دقائق اور باریکیوں کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن اس معیار پر کسی شاعر کے کلام کا جائزہ نہیں لیتے۔ وہ واقعیت یا اصلیت کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں لیکن شعری خوبی ان کے یہاں مبالغہ قرار پاتی ہے وہ مشرقی معیار نقد کے ان تمام نظریوں کو قبول کرتے ہیں جو شعر کے فنی و جمالیاتی پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں۔فصاحت وبلاغت ان کے اقسام و جزئیات تشبیہ واستعارہ جدت ولطف ادا، محاکات ،صنائع بدائع ان تمام فنی و جمالیاتی خوبیوں سے وہ اپنے تنقیدی تصورات کی تشکیل کرتے ہیں اور پھر انہی کے معیار پر مختلف شعرا کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں بقول عبارت بریلوی:

''شاعری کی اس صوری پہلو کو زیادہ اہم سمجھنے کا ہی نتیجہ ہے کہ شبلی کے جدت ادا، تشبیہ واستعارہ، سادگی ادا وغیرہ پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے جن کا مقصد صرف یہ ہے کہ فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کی طرف زیادہ توجہ کی جائے۔اس طرح کی بحثوں سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کا مذاق مشرقی تھا اس وجہ سے وہ ان مشرقی اصطلاحات تنقید پر بہت زور دیتے ہیں۔''34

اسی مشرقی انداز فکر نے شبلی کو اپنے دور میں جو مغرب کے عام ذہنی غلبے کا دور تھا،ایک آزاد نظر او ر دور بین نگاہ عطا کی ،لیکن اپنے دور کے حالات و واقعات یا جدید تغیرات یا ان اثرات سے جو علی گڑھ تحریک سے پڑے تھے وہ بے خبر نہیں رہے بلکہ ادبی روایات ورجحانات میں وہ

اصل میں مشرقی تعلیم و تہذیب، مشرقی شعر وادب کی شان شبلی اورحالی دونوں میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ اگر چہ وقتی مصلحت کے پیش نظر جدید تہذیب وتمدن یا جدید تغیرات کے اثرات ان پر کسی قدر حاوی رہے لیکن ان کا دل مشرقی تھا او ریہ مشرقیت ان کی فکر میں، ان کے لب ولہجے میں، ان کے کردار میں، ان کے انداز واسلوب میں مختصراً ہر جگہ نمایاں ہے بلکہ کلاسیکی یا قدیم مشرقی ادب کی اس آخری پود میں قدیم مشرقیت ایسی آب وتاب کے ساتھ اس طرح جلوہ گر ہوکر پھر کبھی سامنے نہیں آئی۔

علی گڑھ تحریک سے کامل اتفاق رکھتے تھے۔اس لیے انھوں نے اپنے تنقیدی تصورات میں شعر کے اخلاقی ،افادی اوراصلاحی پہلو پر بھی کافی حد تک روشنی ڈالی اور شاعری پر سماجی ،تہذیبی وتمدنی اثرات کی بھی نشاندہی کی۔انھوں نے نئی تہذیب یا مغرب کے ان اثرات کو بھی قبول کیا جو اس وقت کے تقاضے کے طور پر سامنے آئے تھے لیکن قدیم قدروں یا مشرقی تعلیم وتہذیب سے گہرے لگاؤ کی بنا پر وہ اس کے زیادہ حامی رہے چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''اگر چہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت (تشخص) کے لیے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے۔''35

اصل میں مشرقی تعلیم وتہذیب ،مشرقی شعر وادب کی شان شبلی اور حالی دونوں میں بدرجہ اتم موجود تھی۔اگر چہ وقتی مصلحت کے پیش نظر جدید تہذیب وتمدن یا جدید تغیرات کے اثرات ان پر کسی قدر حاوی رہے لیکن ان کا دل مشرقی تھا اور یہ مشرقیت ان کی فکر میں ،ان کے لب ولہجے میں ،ان کے کردار میں ،ان کے انداز واسلوب میں مختصراً ہر جگہ نمایاں ہے بلکہ کلاسیکی یا قدیم مشرقی ادب کی اس آخری پود میں قدیم مشرقیت ایسی آب وتاب کے ساتھ اس طرح جلوہ گر ہو کر پھر کبھی سامنے نہیں آئی۔

حواشی:

1. مقالات شبلی (جلد دوم) مضمون سرسید احمد مرحوم او ر اردو لٹریچر، شبلی نعمانی (دار المصنفین اعظم گڑھ یوپی) ص 55
2. شبلی کی علمی مضمون (شبلی کا تنقیدی مسلک ،خلیل الرحمن اعظمی ص 51
3. موازنہ انیس و دبیر مولانا شبلی نعمانی ،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ،ص 19-20
4. شعر العجم جلد چہارم،مولانا شبلی نعمانی ،دار المصنفین ،شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ص 6
5. ایضاً ص 8
6. موازنہ انیس ودبیر مولانا شبلی نعمانی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ص 19-20
7. ایضاً ص 110
8. شعر العجم جلد چہارم ،مولانا شبلی نعمانی ،دار المصنفین ،شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ص 12
9. ایضاً ص 14
10. ایضاً ص 15
11. موازنہ انیس ودبیر مولانا شبلی نعمانی ،ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص 63
12. شعر العجم جلد چہارم، مولانا شبلی نعمانی ،دار المصنفین ،شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ص 11-12
13. شعر العجم جلد چہارم، مولانا شبلی نعمانی ،دار المصنفین ،شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ص 11-12
14. مضمون ،شبلی کا تنقیدی مسلک ،خلیل الرحمن اعظمی ،ص 46
15. شعر العجم جلد چہارم ،مولانا شبلی نعمانی ،دار المصنفین ،شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ،ص 11
16. ایضاً ص 52
17. ایضاً ص 200
18. ایضاً ص 71
19. ایضاً ص 53
20. ایضاً ص 71
21. موازنہ انیس ودبیر، شبلی نعمانی ،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ص 92
22. شعر العجم جلد چہارم ،مولانا شبلی نعمانی، دار المصنفین ،شبلی اکیڈمی ،اعظم گڑھ ،ص 46
23. ایضاً ص 47
24. ایضاً ص 56
25. شعر العجم جلد چہارم، مولانا شبلی نعمانی دار المصنفین ،شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ،ص 56
26. ایضاً ص 71
27. شعر العجم جلد اول ،مولانا شبلی نعمانی ،دار المصنفین ،شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ،ص 13-14
28. موازنہ انیس ودبیر ،مولانا شبلی نعمانی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ،ص 256
29. موازنہ انیس ودبیر ،مولانا شبلی نعمانی ،ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص
30. ایضاً ص 253
31. ایضاً ، ص 254
32. ایضاً ، ص 254
33. ایضاً ، ص 252
34. اردو تنقید کا ارتقا، عبارت بریلوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ص 180
35. شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں، سید شہاب الدین دسنوی (انجمن ترقی اردو ہند) ،ص 78

■

Dr. Mumtaheena Akhter
D/O :Peer Gulam Mohammad Shah
R/O :Kaka Sathoo, Jamalatta, Srinagar, Kashmir
P/O : M.R Gunj-190002 (J&K)

سیماب اکبرآبادی
اردو کا ایک نظریہ ساز شاعر

محمد کلام

دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

اردو کے کلاسیکی دور کے آخری شاعر سیماب اکبر آبادی کا یہ دلچسپ، پرتاثیر اور سلیس شعر خاص و عام کی زبان پر ہے۔ سیماب کا زمانہ اردو شاعری میں نئے رجحانات وامکانات کا زمانہ تھا۔ سیماب اکبرآبادی 1880 میں آگرہ میں پیدا ہوئے، جواس وقت اکبرآباد کے نام سے مشہور تھا۔ اکبرآبادکی اس زمین نے سیماب سے پہلے بھی اردو شاعری کو اپنی بیش بہا خدمات نظیر اور غالب کی صورت میں عطا فرمائی تھیں۔ ان دو استاد شعرا کے کارنامے اردو شعروادب میں ایک رجحان ساز اور روایت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شعروادب کے تعلق سے ایسا ہی کچھ معاملہ سیماب کا بھی تھا۔ سیماب کو اپنے معاصرین اور اردو کے نئے شاعروں میں ایک نظریہ ساز شاعر کا درجہ حاصل ہے، جنھوں نے زندگی کے بدلتے مسائل کو اپنی تعمیری اور امکانی فکر کے ساتھ شاعری میں برتنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ سیماب کے فکر وفن اور طرز بیان کی خصوصیات کی وضاحت میں عنوان چشتی کا یہ جملہ قابل غور ہے:

''اظہار واسالیب کی سطح پر توازن، موضوع ومواد کی سطح پر تنوع''[1]

سیماب کی غزلیات دل بستگی اور اثر پذیری کا مادہ رکھتی ہیں۔ وہ ایسے مقام سے کچھ کہتے ہیں کہ دل میں نشتر کی طرح کھٹک جاتا ہے، جس سے تکلیف کے بجائے ایک طرح کی لذت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں کا خمیر کلاسیکی شاعری کے بطن سے نکلا ہے اور جدید شاعری نے اسے اپنا رنگ روپ عطا کیا ہے۔ سیماب کی فن کارانہ صلاحیتوں اور فکری تنوع کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر عنوان چشتی لکھتے ہیں:

''ان کے شعری مزاج میں توازن تھا، اس لیے انھوں نے روایت سے روشنی اور تجربے سے تازگی حاصل کر کے اپنی شعری تخلیقات میں ایک نیا، مگر مانوس حسن پیدا کیا۔ سیماب کے شعری تجربے اردو شاعری کی مخصوص جمالیات کے دائرے میں رقص کرتے ہیں، یا یہ کہیے کہ ان کی جڑیں اردو کی قدیم شعری جمالیات کی زمین میں پیوست ہیں''[2]

انھوں نے اپنی غزلوں کو ثقیل اور بوجھل الفاظ سے یکسر بے نیاز رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ترسیل کی بھرپور گنجائشیں موجود ہیں۔ سیماب اپنے طرز خاص اور فکر کے رنگین ورعنا نقوش سے اہل نظر کی کچھ اس طرح مدارات کرتے ہیں:

بدل گئیں وہ نگاہیں یہ حادثہ تھا اخیر
پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا

تھا کہاں وقت کہ افسانۂ ہستی پڑھتے
صرف عنوان ہی عنوان نظر سے گذرے

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

کہانی ہے تو اتنی ہے فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

تو نہیں تو رات ہے محروم سوز زندگی
شام ہی سے چاندنی روپوش ہے تیرے بغیر

نیند آ آ کر اچٹ جاتی ہے تیری یاد میں
تار بستر نشترِ آغوش ہے تیرے بغیر

زندگی تجھ سے عبارت تھی، مگر جب تو نہیں
زندگی کا اپنی کس کو ہوش ہے تیرے بغیر

پھول ادھر کھلے ہوئے، داغ اُدھر بجھے ہوئے
حسن کی صبح اور ہے، عشق کی شام اور ہے

اے وحشت خیال اسے کیا جواب دوں
غربت یہ پوچھتی ہے کہ چھوڑ آئے گھر کہاں

سوز وفا ہے نا تمام، جاؤ کرو تم اپنا کام
آگ بجھانے آئے ہو آگ ابھی لگی نہیں

کوئی یہ شکوہ سرایانِ جور سے پوچھے
وفا بھی حسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے

وہ خواب پریشاں سے گھبرا کے ترا اٹھنا
آزردہ سی وہ چتون، رُکتی سی وہ انگڑائی

الٰہی خواب منزل کو نئی راتیں عطا فرما
یہی تارے گنے جائے گا میرا کارواں کب تک؟

سلگنا اور جینا، یہ کوئی جینے میں جینا ہے
لگا لے آگ اپنے دل میں دیوانے دھواں کب تک؟

سیماب کے مندرجہ بالا اشعار ان کی ذہنی اختراع اور فکری تنوع کی غمازی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں خیال کی ادائگی کا انداز بے حد صاف اور سادہ ہے۔ ان کی اس سہل پسندی اور سادہ گوئی سے یہ گمان قطعی نہیں ہونا چاہیے کہ موضوع ومضامین کی سطح پر سیماب کسی طرح کی قحط حالی یا تنگ دستی کے شکار تھے، بلکہ طرز اظہار کا یہ انداز ان کی شعوری کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس ضمن میں عنوان چشتی کے خیال سے استفادہ کیا جاسکتا ہے:

''ان کے الفاظ وتراکیب کا بیشتر سرمایہ غرابت اور ثقالت سے پاک، زبان کے تخلیقی حسن کا حامل ہے''[3]

اس مختصر مقالے میں سیماب کے تمام کلام کی معنوی اور فنی خوبیاں اور خامیاں گنانا ممکن نہیں۔ تاہم مندرجہ بالا چند غزلوں کے متفرق اشعار سے ان کا رنگ تغزل سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے اور اس بات کا اندازہ بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ خیالات کی گہرائی اور گیرائی، جذبات کی لطافت اور گداختگی، معنی کی نزاکت وپاکیزگی، لب ولہجہ کی سبک روی اور زبان کا ستھرا پن، غزل کے اندر نئے امکانات پیدا کرنے اور اسے آگے بڑھانے میں کس قدر ممد ومعاون ثابت ہوسکتا ہے۔

ایسے وقت میں جب غزل زلف ورخسار تک محدود ہوکر رہ گئی تھی، سیماب آگے بڑھتے ہیں اور غزل کی اصلاح وتہذیب کے لیے نہ صرف آواز اٹھاتے ہیں، بلکہ بذات خود پیش قدمی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غزل کی حقیقت اور اس کی ضرورت پر سنجیدگی سے بحث کرتے ہیں۔ اس میں عصری رجحانات اور مسائل حیات کو پیش کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں اور علی الاعلان کہتے ہیں کہ خیال کی رنگینی ونزاکت کے ساتھ جذبے کی متانت وعفت کو متوازن رکھنا ہی اصل شاعری ہے۔ دوسری طرف وہ نظم کو غزل کا حریف یا مدمقابل ماننے سے صاف انکار کردیتے ہیں۔ بلکہ غزل گو حضرات سے نظم کو اپنا لینے اور اس کی ترقی واشاعت میں کوشاں رہنے کی آرا کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سے سیماب

کے ذہن کے مثبت رویوں اور تعمیری سوچ کا اندازہ ہوتا ہے۔اس طرح وہ ادب کی نئی نسل کو شاعری کے جدید تقاضے اور فکر و شعور سے روشناس کرانے کی ایک عملی کوشش کرتے ہیں۔ سیماب کی انھیں تخلیقی آگہی اور شعور و بیداری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عنوان چشتی لکھتے ہیں:

’’مولانا سیماب اکبرآبادی اس نکتہ سے آگاہ تھے کہ روایت پرستی جتنی گمراہ کن ہے، بے شعور جدّت پسندی اتنی ہی تباہ کن‘‘[4]

نظم اور غزل کی کشاکش اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے زمانے میں ہر دو اصناف کی ترصیع و ترفیع کا بارگراں اٹھانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اگر اطناب و طوالت کو کم کرنے کے لیے سیماب کے معاصرین میں سے بہترین غزل کے حامی فانی و حسرت کو متغزلین کا نمائندہ منتخب کر لیا جائے اور نظم کو چار چاند لگانے والوں میں سے اقبال اور جوش کو نظم کی نمائندگی سونپ دی جائے، تو بھی ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ نظم کو اپنا کر اردو شاعری کی دنیا وسیع کرنے والے اور اس کے ذریعے زندگی کے مسائل کا حل پیش کرنے والے صحیح راستے پر گامزن تھے، یا غزل کو بڑھاوا دے کر اردو شاعری کو باطنی کیفیات سے معمور رکھنے والے وہ اساتذۂ فن ٹھیک راستے پر تھے، جو ہنوز نفسیات عشق کو اپنے فکر کی جولانگاہ تصور کرتے اور غزل کی نغمگی اور تاثر ہی سے زندگی کی تلخ کامیوں کو راحت فزا بنانے اور تقدیر کا اعلیٰ ظرفی کے ساتھ مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کرتے تھے۔ پھر ہم ان دونوں قسم کے شاعروں کے کمالات اور ان کے نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو یہ فیصلہ کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ متغزلین نے شعر و ادب کو نقصان پہنچایا یا نظم کے پرستاروں نے۔ اس لیے کہ اردو ادب کو مفید، کارآمد، دلآویز اور دلچسپ بنانے میں دونوں ہی طرح کے شعرا کی کاوش و کوشش کو دخل ہے۔ دونوں کی مینا کاری اور فردوس آرائی سے آج کا اردو ادب باغ و بہار بنا ہوا ہے۔ چنانچہ اس وقت یہ بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کی تاویل و تنقید کے لیے غزل بھی اسی قدر ضروری ہے، جتنی کہ نظم، مگر ذرا دیر کے لیے چشم تصور سے اس وقت اور ماحول کا جائزہ لیجیے جب کہ سیماب اپنی شاعری کی ایک نئی راہ متعین کرنے جا رہے تھے۔ ایک طرف تو وہ داغ سے شرف تلمذ رکھتے تھے اور ان کے خون میں وہی معصومانہ تغزل اور خلوص شعری حرکت کر رہا تھا، جو اساتذۂ قدیم کا ترکہ تھا، اور دوسری جانب وہ نظم کے کیف و اثر سے اپنے ہم سفروں کا بدلا ہوا رنگ ترنم دیکھ رہے تھے۔ ایسے نازک مرحلے پر یہ سیماب کا ذوق سالم اور وجدان ہی تھا جس نے ان کو نہ صرف افراط و تفریط سے بچا لیا اور نظم و غزل دونوں کے لیے وقف کر دیا، بلکہ اچھے اور تعمیری ادب کی طرف ان کی رہنمائی کی۔ چنانچہ سیماب کی حیثیت بطور ایک نظریہ ساز کے، تاریخی ہے اور نظم اور غزل ہی کی نہیں بلکہ نئے ادب اور پرانے ادب کی چپقلش کے اس دور میں میانہ روی اور اعتدال کے کئی جدید نظریات سیماب کی مثبت فکر اور روشن خیالات کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔

سیماب اکبرآبادی نے شروع ہی سے اپنے کلام میں غزل کی مروجہ یا مسلمہ عریانی یا خام خیالی کو داخل کرنے سے اجتناب برتا۔ تاہم انھیں قدیم رنگ تغزل سے جو لگاؤ تھا، وہ مشق مطالعہ اور زمانے کے ساتھ بدلتا گیا۔ اور انھیں کے الفاظ میں یہ کہ’’ 1918 سے ایک نئی راہ اختیار کی۔‘‘ اب ان کے کلام میں ندرت خیال کے ساتھ جذبات آفرینی اور اسلوب بیان کی متانت بے حد نمایاں نظر آتی ہے۔ فلسفہ، تنقید اور علم کلام کی مشاقی سے ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا ہوتا ہے، جس میں میر کا سوز، غالب کی شوکت اور داغ کی سلاست بیک وقت اور ایک جگہ جمع ہو گئی تھیں۔ اسی اسلوب کو انھوں نے اپنے آخر وقت تک قائم رکھا۔

ہرچند کہ سیماب پرانے اسالیب و طرز سخن کو از سر نو ترتیب دینے اور غزل کو نئے زمانے، نئے ماحول کے لیے سازگار بنانے میں پیش پیش تھے۔ تاہم غزل سے پرانا اور گہرا رشتہ ہونے کے سبب نظم سے موانست پیدا کرنا اور بحسن و خوبی اس سے عہدہ برآ ہونا سخت مشکل کام تھا۔ لیکن وہ ایک بڑے فن کار اور اچھے شاعر کی طرح اس مشکل مرحلے سے بھی گزر گئے اور جس طرح انھوں نے غزل میں رچاؤ کے ساتھ ایک اندرونی فضائی کیفیت برقرار رکھنے کے لیے کامیاب جد و جہد کی، اسی طرح نظم کے رجحان کو عام کرنے کے لیے نعرہ بازی کے بجائے فکر و نظر کے اعلیٰ مظاہر سے کام لیا۔ نظم کی زبان و بیان میں ایک طرح کا جذباتی انہماک، ایک طرح کی بے ساختگی، بے تکلفی اور ایک طرح کا تیکھا پن پیدا کرنے میں بھی کامیاب رہے۔ انگریزی ادب سے متاثر ہو کر نظم نگاری میں ان کے فنی اور ہیئتی تجربات پر عنوان چشتی کا یہ قول صادق آتا ہے:

’’سیماب کے ایسے تجربوں کے پس پشت ایک زبردست شعور جھلکتا ہے، اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ اردو میں اس قسم کے تجربوں میں پہل کرنے کا سہرا سیماب کے سر ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔‘‘[5]

سیماب اکبرآبادی کا اپنا ایک خاص رنگ تغزل ہے اور نظم نگاری کا ایک خاص اسلوب۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک زبردست قوت آخذہ کے مالک ہیں، لیکن اخذ و قبول کے سلسلے میں انھوں نے اپنی انفرادیت کو ہر حال میں قائم رکھا ہے۔ جملہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ انھیں کے قلم کا یہ تصرف ہے کہ دوسرے دبستانوں سے بہت کچھ اثر قبول کرنے کے باوجود آگرہ اسکول نے ایک علیحدہ اور منفرد دبستان کی حیثیت سے اردو شعر و ادب میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ نہ معلوم کتنے قدیم و جدید اسکول کے پیرو اسی آستانہ شعر و ادب سے فیض حاصل کرنے کے بعد آپس میں دست و گریباں ہونے کے بجائے زندگی اور شاعری کو آگے کی طرف بڑھانے میں مصروف ہیں۔

یہ تو امر مسلمہ ہے کہ سیماب کے معاصرین استادوں میں جتنے شاگرد سیماب کو نصیب ہوئے، اتنے ان کے کسی دوسرے معاصر استاد شاعر کو میسر نہیں ہو سکے۔ اور اس بڑی تعداد میں دو چار دس بیس نہیں بلکہ سیکڑوں شاگرد اچھی خاصی شہرت کے مالک ہیں۔ ان میں سے اکثر صاحب تلامذہ بھی ہیں۔ پروفیسر حامد حسن قادری نے صحیح کہا ہے’’انھوں نے اپنے علاوہ اور بھی بہت سے طالبان فن اور تشنگان ادب کی ادبی تعمیر کی، جو بغیر کسی وسیلہ کے آج کے ادب کے ستون کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اور جو کل کے ادبی کارواں کے سالار قافلہ بنیں گے۔ بعض آج ہی بن چکے ہیں۔‘‘

اس سے بھی بڑھ کر یہ بات قابل توجہ ہے کہ سیماب کے اپنے کلام میں بقا اور ارتقا کی زبردست صلاحیت ہے اور ان کے کلام کے حسن تاثیر سے اصلاح تخیل اور شعر و ادب کی تہذیب و تزئین کا کام آئندہ بھی جاری رہے گا۔

حواشی:

1۔ سیماب کی نظمیہ شاعری، ڈاکٹر زرینہ ثانی، سیماب اکادمی، بمبئی، پہلا اڈیشن فروری 1978، ص 9

2۔ ایضاً، ص 10

3۔ ایضاً، ص 10، ص 12

4۔ ایضاً، ص 10، ص 10

5۔ ایضاً، ص 10، ص 10

حوالے و کتابیات:

1۔ تاریخ ادب اردو، جلد چہارم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2013

2۔ اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ دوئم، کلیم الدین احمد، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ 2014

3۔ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ترجمہ مرزا محمد عسکری، ادارہ کتاب الشفاء، دہلی 2000

4۔ سیماب کی نظمیہ شاعری، ڈاکٹر زرینہ ثانی، سیماب اکادمی، بمبئی، پہلا اڈیشن فروری 1978

Mohd Kalam
Dept of Urdu, BHU
Varanasi - 221005 (UP)

محمد شواق خان

خواجہ احمد عباس
بحیثیت افسانہ نگار

خواجہ احمد عباس کی شخصیت بین الاقوامی سطح پر شہرت کی حامل ہے جو اُردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ خواجہ صاحب ایک مستند اوراعلیٰ درجے کے جرنلسٹ، کالم نگار، فلم میکر، فلم ڈائریکٹر، فلم پروڈیوسر، ممتاز افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، سوانح نگار اور مضمون نگار تھے، جنھوں نے متعدد شعبوں میں طبع آزمائی کی اور ہر جگہ اپنی یادگار چھاپ چھوڑی۔ خواجہ احمد عباس وہ شخصیت ہیں جنھوں نے مشہور فلم اداکار امیتابھ بچن' کو پہلی بار اپنی فلم 'سات ہندوستانی' میں موقع دے کر فلمی دُنیا کو ایک انمول ہیرے سے متعارف کرایا جو پچھلی نصف صدی سے فلمی دنیا میں جگمگا رہا ہے۔ خواجہ صاحب ایک سچے نیشنلسٹ، ترقی پسند اور پختہ فکر ادیب تھے جو فلمی دُنیا میں 'ماموں جان' کے نام سے جانے جاتے تھے۔ اُنھوں نے اُردو ہندی اور انگریزی میں 74 کتابیں لکھی ہیں، جن میں 11 افسانوی مجموعے، متعدد ناول، ڈرامے اور مضامین۔ ایک خودنوشت انگریزی میں "I am not an island" ایک سفر نامہ 'مسافر کی ڈائری' اور دیگر کچھ تصانیف شامل ہیں۔ خواجہ صاحب نے 1936 میں اخبار 'بمبئی کرانیکل' سے وابستہ ہو کر صحافی اور ادبی کیریئر کا آغاز کیا بعد میں اپنا اخبار "Aligarh Opnion" بھی نکالا۔ 1947 کے بعد ہفت روز اخبار 'بلٹز' سے وابستہ ہوئے جہاں وہ 'لاسٹ پیج' آخری عمر تک لکھتے رہے۔ جس سے انھیں کافی شہرت ملی۔ خواجہ صاحب نے کئی بین الاقوامی شخصیات کے انٹرویوز بھی کیے جن میں امریکی صدر 'روز ویلٹ' اور روسی وزیر اعظم 'خروشیف' بھی شامل ہیں۔

خواجہ احمد عباس 7 جون 1914 کو پانی پت میں پیدا ہوئے۔ خواجہ صاحب اپنے مقام پیدائش کی طرح تمام عمر نا انصافی اور استحصال کی لڑائی میں کمر بستہ رہے۔ ان کا سلسلہ سرسید تحریک کے اہم رُکن اور اُردو تنقید کے بانی مولانا الطاف حسین سے ملتا ہے جو رشتے میں ان کے پرنانا لگتے ہیں۔ ان کے دادا غلام عباس ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے اول شہید تھے جنھوں نے انگریزی سامراج کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ ان کے والد خواجہ غلام السبطین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے گریجویٹ تھے اور والدہ 'مسرور خاتون' حالی کے ماہر تعلیم بیٹے خواجہ سجاد حسین کی بیٹی تھیں۔ اس طرح خواجہ احمد عباس کا تعلق ایک تعلیمی خاندان سے تھا جس کا اظہار وہ اپنی سوانح عمری "I am not an island" میں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "میں پیدا ہونے سے پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا" جس کے معنی ہیں کہ علم و ادب مجھ کو وراثت میں ملا تھا۔ برصغیر میں 1936 کو ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ اس تحریک نے انسانی زندگی کو سمجھنے، پرکھنے اور بہتری کی طرف گامزن کرنے کے نئے دریچے کھولے، اُردو ادب کو عالمی ہم مرتبہ بنانے کی جدوجہد کا آغاز کیا، فن اور ادب کو عوام کے قریب لانے کی سعی کی، ادب میں بھوک، افلاس، غربت، سماجی پستی اور سیاسی غلامی جیسے عناصر کو زیر بحث لایا، واقعیت اور حقیقت نگاری پر زور دیا، انقلابی اور اشتراکی ادب کو ترجیح دی، فرسودہ روایات کو ترک کرنے اور صحت مند روایات کو اپنانے کا مشورہ دیا، ادب میں حُسن کے معیار بدلنے کی بات کی۔ اس تحریک کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی جس کی صدارت پریم چند نے کی اور اپنے خطبہ صدارت میں مقاصدِ تحریک کا اظہار واضح الفاظ میں یوں کیا۔

"...... ہمیں حُسن کا معیار بدلنا ہوگا....... ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں، کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگا۔"

اس تحریک نے جلد برصغیر میں ہیجان برپا کر دیا اور

بیشتر حساس ادیبوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ خواجہ احمد عباس کا شمار بھی انھیں ادیبوں میں ہوتا ہے جن کی افسانہ نگاری کا آغاز اس تحریک کے ابتدا کے ساتھ ہوا جنھوں نے مندرجہ بالا تمام مقاصد کی پیروی کی۔ مارکسزم اور گاندھی واد سے متاثر خواجہ احمد عباس نے اسی تحریک کے زیر اثر لکھا اور سماجی حقائق کو بڑی بے باکی سے اپنی تحریروں میں پیش کیا۔ وہ اس تحریک کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے تھے اس لیے اپنے ایک انٹرویو میں اس تحریک کی اہمیت، نظریہ ادب اور لکھنے کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''میں اس لیے لکھتا ہوں کہ زندگی کی متنوع صورتوں کو ان کے حقیقی سیاق وسباق میں دیکھ سکوں۔ میں فلم کی کہانی لکھوں، اخبار کا کالم یا کوئی افسانہ، میں نے کبھی قلمی سمجھوتہ نہیں کیا ہے کہ یہ میری سرشت کے خلاف ہے۔ ترقی پسند نظریہ نے اُردو ادب کو سوچنے کا ایک نیا انداز دیا اور متمول کیا ہے''۔

اسی تحریک سے منسلک خواجہ احمد عباس کے ہمعصر حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی سعادت حسن منٹو، اختر حسین رائے پوری وغیرہ اپنی اپنی سطح پر انسانی بربریت، بے انصافی، جہالت، تعصب، توہم پرستی، بے ایمانی، بدنیتی کے خلاف کھل کر لکھ رہے تھے۔ ان تمام لوگوں کا شمار ترقی پسند تحریک کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ بحیثیت افسانہ نگار خواجہ احمد عباس کا ذکر گرچہ ان مندرجہ بالا ہمعصر افسانہ نگاروں کے ساتھ نہ کیا جاتا ہو ان کو ترقی پسندوں کی صف دوم کے افسانہ نگاروں میں جگہ دی جاتی ہو اور ایک طویل عرصے تک مختلف نقاد مثلاً عزیز احمد، ممتاز شریں وغیرہ نے ان کی افسانہ نگاری کو معمولی اہمیت دی ہو مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے کچھ ایسے بلند پایہ افسانے تحریر کیے ہیں جن کے ذکر کے بغیر ترقی پسند تحریک کی تاریخ مکمل نہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز بطور صحافی ہوا اور کے بعد دیگرے انھوں نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی مگر بطور افسانہ نگار انھیں سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی بقول محمد حسن:

''خواجہ احمد عباس کی شخصیت یوں تو رنگا رنگ تھی اور ان کے کارنامے صحافت سے لے کر فلم سازی تک پھیلے ہوئے تھے لیکن اُردو ادب کے لیے ان کی حیثیت بنیادی طور پر افسانہ نگار کی ہے۔ انھوں نے ناول بھی لکھے اور کم سے کم ایک ناول 'انقلاب' کا ادبی دنیا میں خاصا چرچا بھی ہوا۔ لیکن افسانہ نگار احمد عباس ناول نگار احمد عباس پر غالب ہی رہا۔''

(مضمون خواجہ احمد عباس مصنف محمد حسن کتاب 'دریافت' ص: 51)

خواجہ احمد عباس نے اپنی فکشن نگاری کا آغاز 1936 میں افسانہ 'ابابیل' لکھ کر کیا۔ یہ افسانہ 'نیا ادب' میں شائع ہوا جس میں ایک ظالم کسان 'رحیم خان' کی نفسیاتی کیفیت کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا گیا ہے جس کا تعارف بحیثیت ایک ظالم اور سنگ دل کردار کے طور پر ہوتا ہے جو بچوں اور بیوی پر ظلم ڈھاتا ہے جس کے تشدد سے بیوی بچے اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ظاہری سختی کے باوجود اس کے اندر پدرانہ اور شوہرانہ شفقت موجود تھی جو بیوی اور بچوں کے چھوڑ جانے کے بعد 'ابابیل' کی جانب منتقل ہو جاتی ہے جو اس کے غم گسار بنتے ہیں اور جن کے تحفظ کے لیے یہ بارش میں بھیگ جاتا ہے۔ اس افسانہ کے بعد اُنھوں نے کئی افسانے لکھے جن کا خاصا چرچا ہمارے افسانوی ادب میں ہوا جن کا تعلق براہ راست ہمارے سماج سے ہے۔ ان کے متعدد افسانے انسانی زندگی کے کسی نہ کسی اہم پہلو کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی کہانیاں معاشرے کی تلخ اور کڑوی حقیقتوں کی آئینہ دار، انسانیت کے پست کردار کی منہ بولتی تصویر ہیں اور سماج کی کمزوریوں اور خرابیوں کی ترجمان ہیں جو ہمیں غور وفکر کی دعوت بھی دیتی ہیں اور سماج و معاشرے میں اصلاح کا جذبہ بھی اُبھارتی ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں بے روح شہری زندگیوں کو بھی پیش کرتے ہیں اور فوٹ پاتھ پر رہنے والوں کے دکھ سکھ بھی بیان کرتے ہیں، سیاست اور توہم پرستی پر طنز بھی کرتے ہیں۔ افسانہ 'اجنتا' فسادات میں انسانیت کی موت پر مصنف کے اضطراب اور بے چین ذہن کی ترجمانی کرتا ہے۔ افسانہ 'انتقام' ہندو مسلم فسادات کے متعلق ہے جس میں 'ہری داس' اپنی بیٹی 'جانکی' کے قتل کا انتقام ایک مسلم لڑکی کا قتل کر کے لینا چاہتا ہے مگر کہانی کے آخر میں اس کا ضمیر جاگ اُٹھتا ہے اور وہ اس

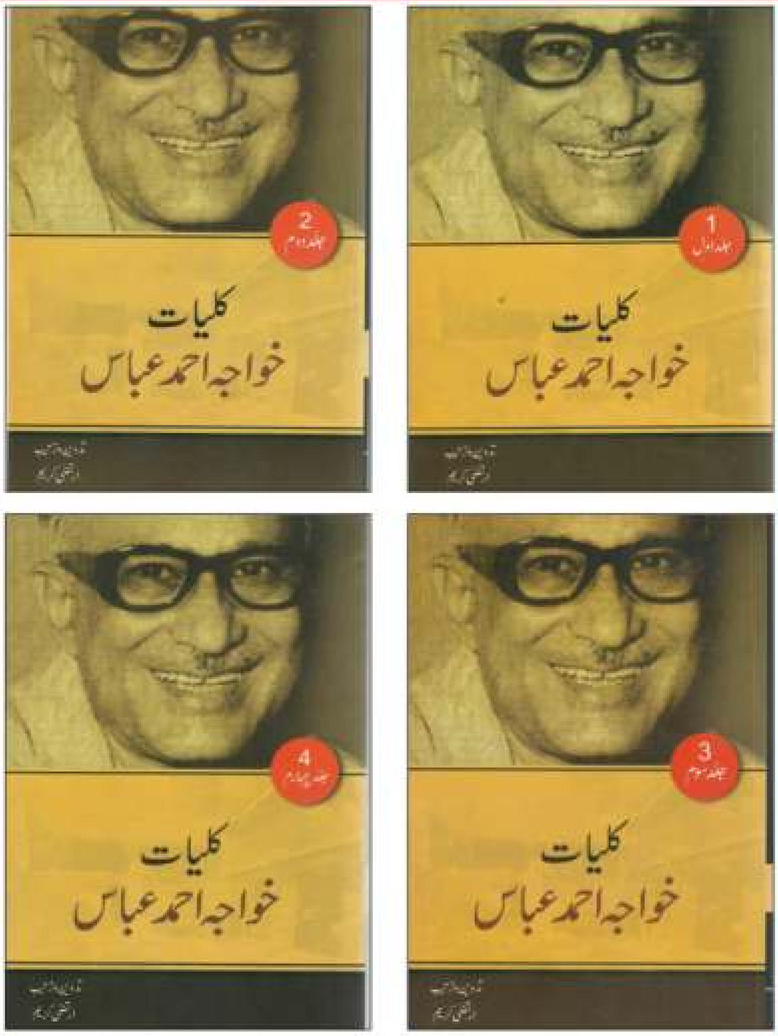

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے 8 جلدوں پر مشتمل 'کلیات خواجہ احمد عباس' شائع کیا ہے۔ کلیات میں ان کے افسانے، ناول، ڈرامے، سفرنامے اور دیگر تحریریں شامل ہیں۔ کلیات خواجہ احمد عباس کی تدوین وترتیب پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کی ہے۔

گھناونے عمل سے باز آجاتا ہے۔افسانہ'رفیق' کا موضوع بھی فسادات ہے جس میں فرنگیوں کی سازشوں اور مکاریوں سے پردہ اُٹھایا گیا ہے جو دوست 'میجر رفیق' اور'کرنل رجیندر'کو ایک دوسرے کا دشمن بنا کر ان میں فساد کرا دیتے ہیں جس میں 'میجر رفیق' مارا جاتا ہے یہ حادثہ کرنل رجیندر کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے۔افسانہ'فین' میں عباس نے نویں جماعت میں پڑھنے والے ایک 'فین' کے بارے میں بتایا ہے جو عباس صاحب کی تمام زندگی سے واقف ہے مگر ان کی خودنوشت کی قیمت 45 روپیہ ہونے کے سبب اسے خریدنے سے قاصر ہے۔افسانہ'نیلی ساڑی' میں واحد متکلم کا اسلوب استعمال کیا گیا ہے جس میں 'سلمہ' اپنی روداد سناتی ہے کہ کس طرح 'امیر کزن محمود بھائی' اس کی عزت لوٹ کر اسے بمبئی پہنچاتا ہے اور پھر کیسے اس کا چہرہ تیزاب سے جلا دیا جاتا ہے۔ افسانہ'سردار جی' ہندو مسلم فسادات کے موضوع پر لکھا گیا ہے جس پر مقدمہ بھی چلا مگر مصنف باعزت بری ہوگئے،افسانہ'کہانی کی کہانی': میں'سردار جی' افسانے پر چلائے ہوئے مقدمہ کی روداد ہے،افسانہ'میرے بچے' کشمیر کے متعلق ہے جس میں 'زونی' کی کہانی ہے جو پاکستانی قبائل کے ظلم وستم کے سبب اپنے بچے کی قاتل بن جاتی ہے۔'زعفران کے پھول' میں کہانی کا مرکزی کردار 'زعفرانی' کے اندر بیداری کا جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے جو اپنے بھائی کو بھی خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتی ہے مگر آخر کار یہ حکومت کے ظلم و جبر کا شکار ہوکر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔افسانہ'ماں کا دل' کی کہانی ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران ہونے والے واقعہ پر مبنی ہے جس کا عنوان فلم کے ایک مکالمہ'بچہ بھی ماں کا دل ہوتا ہے' سے اخذ ہے۔ افسانہ'بھولی' میں نچلے طبقے کی لڑکیوں کے والدین کی بے کسی، بے بسی،لاچاری اور سیٹھ لوگوں کی ناجائز مانگوں کو موضوع بنایا گیا ہے جس میں پکی عمر کا مالدار'بشمبر'بھولی سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر شادی کے عین وقت پر وہ 5000 ہزار روپیہ کی ناجائز پیش کش کرتا ہے جس پر بھولی کے صبر کی انتہا ٹوٹ جاتی ہے اور وہ اس قصائی کے رشتہ کو ٹھکرا کر تمام عمر والدین کی خدمت اور بچوں کو پڑھانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ افسانہ' آئینہ خانے میں'آپ بیتی کی طرز پر لکھا گیا افسانہ ہے جس میں مصنف 60 برس کی عمر میں خود سے مخاطب ہوکر دلچسپ حقائق کا انکشاف کرتا ہے جو مصنف کی ذاتی (مثلاً تاریخ پیدائش، افسانے لکھنے کا سبب، عشق، صحافت، فسادات،حالی کے ساتھ تعلقات) اور نفسیاتی زندگی کو سمجھنے کے لیے نہایت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ افسانہ

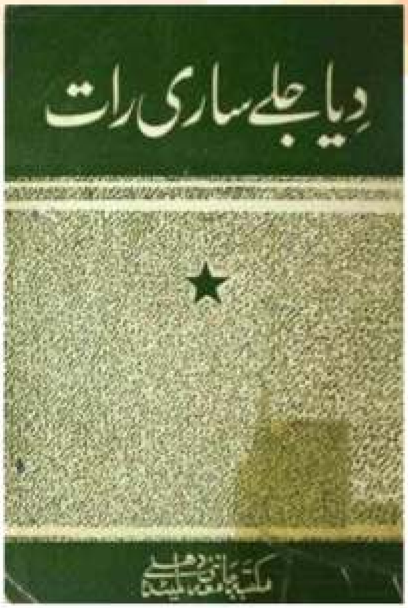

'دیوالی کے تین دیے' میں مذہبی توہم پرستی اور سیٹھ لوگوں پر طنز کسا گیا ہے جو غرض کے لے ہزاروں اور لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں مگر کسی بے سہارا اور ضرورت مند کی مدد کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔سیٹھ لکشمی داس اور لکشمی کانت دیوالی کی رات ہزاروں روپے گھر کی رونق میں اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ ان کے گھر میں لکشمی پرکٹ ہو مگر لکشمی کی آمد پر یہ لوگ اسے پناہ نہیں دیتے کیونکہ یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ لکشمی محض امیروں کے روپ میں نہیں غریبوں کے روپ میں پرویش کرتی ہے۔ افسانہ'بنارس کا ٹھگ' میں انسان کے دوغلے کردار کی نشان دہی کرائی گئی ہے جو مندروں اور مسجدوں میں ہزاروں خرچ تو کرتا ہے مگر نیکی کمانے کی غرض سے نہیں بلکہ اپنا نام کمانے کے عوض۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کا مرکزی کردار 'مسافر' شہروں، شمشانوں، مندروں اور مسجدوں سے ہوتا ہوا ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جو نہ مندر ہوتا ہے نہ مسجد جسے وہ اپنے رہنے کا اصل مقام قرار دیتا ہے۔

ان افسانوں کے مختصر جائزے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خواجہ احمد عباس کی کہانیوں کے موضوعات کا دائرہ کافی وسیع ہے اُنھوں نے مذہبی،سیاسی،سماجی، فسادی،بداخلاقی موضوعات پر کہانیاں لکھیں ہیں۔ان کی بیشتر کہانیاں فسادات کشمیر، تقسیم وطن کا المیہ اور سماج و معاشرے کی بُرائیوں و ناانصافیوں کا مجموعہ ہیں۔ان کے موضوعات وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔انھوں نے زندگی کے سلگتے ہوئے موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کر کے ہمیں ان پر سوچنے کے لیے اکسایا ہے۔خواجہ احمد عباس نے متعدد سیاسی رنگ کی کہانیاں لکھیں ہیں۔ ان سیاسی رنگ کے افسانوں کی نمائندگی اجنتا، بنارس کا ٹھگ، بارہ گھنٹے اور میری موت وغیرہ کرتی ہیں جن کے ذریعے اُنھوں نے تعصب،فسادات اور نفرت کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ان سیاسی کہانیوں میں بارہ گھنٹے اور میری موت انقلابی زمرے میں بھی آتی ہیں۔افسانہ'بارہ گھنٹے' ایک انقلابی کہانی ہے جس میں خواجہ احمد عباس نے انسانی نفسیات اور جنسیات کا بڑی باریک بینی سے تذکرہ کیا ہے اور ایک عورت کے حب الوطنی کے جذبہ کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے جو ملک کے انقلابیوں کے لیے اپنے جسم کا نذرانہ تک پیش کر دیتی ہے۔انقلابی'وجے سنگھ' کو16 سال کی قید کے بعد رات کے 12 گھنٹے پارٹی رُکن 'بینا' کے گھر قیام کرنا پڑتا ہے۔چھ ہزار کالی راتیں اسے عورت کی قربت سے محروم رکھتی ہیں جو اس رات عورت کی موجودگی سے اس کے اندر ہیجان برپا کر دیتی ہیں،اس جنسی طوفان سے بینا باخبر ہے اور بالآخر وہ ایک قربانی کے جذبہ کے تحت اپنا جسم 55 سال کے بدصورت شخص کے حوالے کر دیتی ہے جو ملک کے لیے، قوم کے لیے، انقلاب کے لیے، آزادی کے لیے قید و بند کی صعوبتیں اُٹھاتا ہے اور طویل عرصہ جنسی لذت سے محروم رہتا ہے۔ افسانہ'میری موت' بھی فسادات کے متعلق ہے جس میں مصنف کو سرداروں کے متعلق طرح طرح کے گمان ہیں جنھیں وہ بڑی نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے مگر کہانی کے آخر میں جب سردار جی ایک مسلم 'غلام رسول' کی نیکی کا بدلا اُتارنے کے لیے مصنف کی جان بچاتے بچاتے خود اپنی جان دے دیتا ہے تو مصنف کا حسد اور کینہ ہمدردی میں منتقل ہوجاتا ہے اور یہ حادثہ سردار کی موت کے بجائے مصنف کی ذہنی موت بن جاتا ہے۔

خواجہ صاحب قصہ پن کے قائل تھے اور چونکہ وہ فلمی دُنیا سے بھی وابستہ تھے اس لیے فلموں کی طرح ان کے بعض افسانے میں بھی برسوں کی روداد سنائی دیتی ہے واپسی کا ٹکٹ، لیلیٰ مجنوں اور الف لیلیٰ جس کی عمدہ مثالیں ہیں۔افسانہ'واپسی کا ٹکٹ' فلیش بیک تکنیک میں لکھا گیا افسانہ ہے جس میں مصنف کو 36 برس بعد دوست 'برجو' کا فون آنے پر اسے طالب علمی کے زمانے کی داستان یاد آجاتی ہے۔افسانہ'الف لیلیٰ' پتھر کی سیج پر ایک ہزار راتوں کی داستان ہے یہ مصنف کی وہ ایک ہزار راتیں ہیں جو انھیں بمبئی کے ابتدائی دور میں مشکلوں اور تکلیفوں میں ملک کے بد اور ابتر حالات کی وجہ سے فٹ پاتھوں، خاک اور ویرانوں میں گزارنی پڑی۔ افسانہ'لیلیٰ مجنوں' میں عیسائی لڑکی للی ڈی سوزا (لیلیٰ) اور ہندو لڑکے موہن (مجنوں) کے عشق کی داستان ہے جس کا آغاز ان کے بچپن سے ہوتا ہے مگر جب یہ شادی کے قابل ہوتے ہیں تو مذہب کے ٹھکیداران کے عشق میں دیوار بن جاتے ہیں جس کے سبب یہ خودکشی پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔

خواجہ صاحب کی کہانیوں کا آغاز ایسے ہوتا ہے کہ قاری فوراً اس طرف متوجہ ہوجاتا ہے اور جلد تجسس کی فضا قائم ہوجاتی ہے۔خاتمے پر یہ کہانیاں ہمارے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہیں اور کچھ ایسے سوالیہ نشان اُبھار دیتی ہیں جن کے جوابات ہم آئندہ زندگی میں تلاش کرتے رہتے ہیں جو ان کے فن کا کمال ہے۔خواجہ احمد عباس کی افسانہ نگاری کی بنیادی خصوصیات 'حقیقت نگاری اور اصلاح معاشرہ' ہے۔اس لیے وہ مقصدی افسانے لکھنے میں ذرا بھی نہیں کتراتے ان کی یہ حقیقت نگاری ان کی حق گوئی، بے باکی، خلوص،انسان دوستی، دردمندی، سیاسی اور سماجی شعور کا نتیجہ ہے۔انھوں نے محض افسانوں میں ہی نہیں بلکہ دوسری اصناف اور فلموں میں بھی حقیقت نگاری اور مقصدیت کو اولیت دی۔خواجہ احمد عباس خاص نقطۂ نظر کے حامل تھے جس کی پیش کش کے لیے وہ قلم اُٹھاتے تھے۔مثلاً ہندو مسلم نفاق،فسادات، ملک کے ابتر حالات، پچھڑے ہوئے طبقے کی خراب و خستہ حالت نے ان کو کافی رنج پہنچایا۔ان حالات سے ملک کو روشناس اور قوم کو بیدار کرنے کے لیے اُنھوں نے افسانے لکھے۔انھوں نے داستانوی اور افسانوی کہانیاں نہیں لکھیں بلکہ اپنے گردو پیش کے حقیقی واقعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔خواجہ صاحب ایک سچے قوم پرست، وطن پرست اور سوشلسٹ تھے جن کی کہانیوں کا مقصد اصلاح معاشرہ تھا۔وہ سماج کے ہر پہلو اور وطن کے ہر فرد کی اصلاح چاہتے تھے۔خواجہ احمد عباس ایک نئے معاشرے کے ذریمر اور اصلاح و انقلاب کے قائل تھے وہ ایک جہد کار تھے جن کی ساری زندگی جدو جہد میں گزری جو ملک کی آزادی کی جنگ میں پیش پیش رہے اور اپنی کہانیوں اور کردار کے ذریعے ملک کے مظلوم اور بے سہارا طبقے کی نمائندگی کرتے رہے۔خواجہ صاحب کمیونسٹ خیالات رکھتے تھے۔اُنھوں نے اشتراکی نظریے کو قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کے فروغ میں بھی اہم رول ادا کیا جس کی زندہ مثالیں ان کے افسانوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔خواجہ صاحب نے پسماندہ سماج کو اپنی تحریروں کے ذریعے بہتری کی طرف لانے کی ہر ممکن کوشش کی وہ برصغیر میں امن و امان،خوش حالی اور آزادی کے خواہش مند تھے اس لیے وہ اپنے افسانوں میں ہر جگہ حق گوئی اور حق پرستی کے نعرے بلند کرتے ہیں جس کا اظہار وہ ایک جگہ یوں کرتے ہیں:

''ہر چیز،ہر تحریک،ہر شخص جو خُدا کی مخلوق کو یعنی انسان کو ذلیل وخوار سمجھتا ہے میں اس کے خلاف ہوں''

خواجہ صاحب سیکولر مزاج کے مالک تھے جنھیں فرقہ پرستی قطعی طور پر برداشت نہیں تھی ان کے فن میں انسانیت کو اولیت اور انسان کو فوقیت حاصل ہے۔انھوں نے اپنی تمام زندگی انسانوں کی بھلائی، بہتری اور ترقی کے لیے وقف کررکھی تھی۔وہ ہمہ وقت مظلوم،لاچار اور مسلسل جبرو مفلسی کے شکار انسان کے حق کی بات کرتے رہے۔

خواجہ صاحب ایک مضبوط اور بے باک قلم کار تھے جن کے اندر حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جس نے انھیں ایک سچا نیشنلسٹ اور پختہ ترقی پسند فکر ادیب بنا دیا۔ان کا ادب فکری ادب ہے انھیں ہمہ وقت ملک وقوم کے ہر فرد کی فکر لگی رہتی تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر افسانے میں ایک بے چین احمد عباس کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان کی تمام افسانوی تحریریں حب الوطنی کے جذبے اور سیاسی و سماجی شعور سے بھر پور ہیں۔لوگوں میں بیداری اور

> **خواجه صاحب سیکولر مزاج کے مالک تھے جنهیں فرقه پرستی قطعی طورپربرداشت نهیں تهی ان کے فن میں انسانیت کو اولیت اور انسان کو فوقیت حاصل هے.انهوں نے اپنی تمام زندگی انسانوں کی بهلائی, بهتری اور ترقی کے لیے وقف کر رکهی تهی.وه همه وقت مظلوم,لاچار اور مسلسل جبر و مفلسی کے شکار انسان کے حق کی بات کرتے رهے-**

معاشرے کی فلاح و بہبود کا کام اُنھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے بڑے فنکارانہ اور سنجیدہ انداز میں کیا ہے۔

منفرد اسلوب اور نئے تجربے بھی خواجہ صاحب کے افسانوں کی اہم خوبیاں ہیں'روپیہ آنے پائی'اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔افسانہ'روپیہ آنے پائی'میں ایک نیا تجربہ ملتا ہے جو نئی تکنیک اور بغیر پلاٹ کا افسانہ ہے جسے اُنھوں نے اکاونٹ بک کی شکل میں لکھا ہے جس میں ایک کم آمدنی والے شخص کے روزانہ حساب کتاب کی فہرست کو پیش کیا گیا ہے۔اس تکنیک کا افسانہ اُردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں پہلی بار دیکھنے کو ملتا ہے۔

خواجہ احمد عباس کی کہانیوں کا پلاٹ سادہ اور غیر پیچیدہ ہے انداز بیان بے حد آسان اور موثر ہے جس سے قاری کا ذہن اُلجھنے سے بچا رہتا ہے اور آسانی سے فن کار کا ہمسفر بنا رہتا ہے۔ان کی کہانیوں کی مقبولیت میں اسلوب یا اسٹائل کا بھی بڑی حد تک ہاتھ ہے۔ان کے افسانوں کا کینوس چھوٹا ہے جن میں کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ باتیں کہی گئی ہیں۔ان کے افسانے کہانی پن کے قائل ہیں اور چونکہ کہانی پن واقعات سے پیدا ہوتا ہے اس لیے ان کے افسانوں کے واقعات میں کہیں ظاہری طور پر تو کہیں پوشیدہ طور پر ربط ضرور ہے جو ان کے پلاٹ کی جان ہے۔

خواجہ احمد عباس کی کہانیوں کے کردار ہندوستانی معاشرے کے کردار ہیں جن میں ہر مذہب اور ہر ملت کے افراد شامل ہیں۔چھوٹے بڑے، امیر غریب، بد نیک، ظالم مظلوم، سنگ دل رحم دل، صابر شاکر جلد باز،کاہل انقلاب پسند ہر قسم کے کردار ان کی کہانیوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ان کے کردار جامد اور ٹھہرے ہوئے کردار نہیں ہیں بلکہ راونڈ کردار ہیں جو حالات کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ابابیل کا رحیم خان آخر تک سنگ دل نہیں رہتا بلکہ بیوی اور بچوں کے ترک مکاں کے بعد بے بس اور رحم دل کردار میں تبدیل ہوجاتا ہے۔خواجہ احمد کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا تھا جو ایک سچے وطن پرست تھے جس کے اندر زندگی کی غیر معمولی اور پیچیدہ مسائل کو سمجھنے، پرکھنے اور دیکھنے کی صلاحیت موجود تھی جو معاشرے کے اُتار چڑھاو اور خوبیوں خامیوں سے پوری طرح آگاہ تھے جو نئے دور کی آہٹوں سے باخبر تھے،مسائل ومیلانات سے آگہی رکھتے تھے،اجتماعی اور انفرادی زندگی کی محرومیوں کا ادراک جسے حاصل تھا اور آپسی بھائی چارہ انسانی دوستی جس کا شیوہ تھا، بے باکی حق گوئی جس کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھی۔خواجہ احمد عباس زبان و بیان پر مکمل عبور رکھتے تھے،بیانیہ پر قدرت حاصل تھی اور کہانی کے فن سے بخوبی واقف تھے، موصوف کی مختلف موضوعات پر پکڑ تھی، کردار ہمارے معاشرے کے چلتے پھرتے انسان ہیں، مکالمے دلچسپ اور دلکش ہیں،اسلوب منفرد اور انداز بیان مختلف ہے، پلاٹ میں ترتیب ہے،ماحول وفضا حالات و واقعات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے' آغاز و اختتام پرکشش و پراثر ہے،مقصدیت اور حقیقت نگاری کو کہانیوں میں اولیت حاصل ہے،استعارے اور علامتوں کا استعمال بڑی ہوشیاری سے کیا گیا ہے۔ان تمام خوبیوں کی بنا پر دوسری اصناف کی بہ نسبت افسانے میں انھیں زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔

■

Mohd Shawak Khan S/o Mohd Akram
P/o: Rajal, R/O Rajal, Tehsil Nowshera
Distt: Rajouri - 185151 (J&K)

قمر جہاں

امن و یکجہتی کا پیامبر
شمیم کرہانی

انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا نصف اول برصغیر ہند کی تاریخ کا وہ پر آشوب عہد ہے جس میں برطانوی استعماریت کی ظالمانہ اور جابرانہ پالیسیوں نے ہندوستانیوں کے دلوں میں قومیت کے تصور کو بیدار کردیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانیوں کی رگوں میں لہو بن کر دوڑنے والی یک جہتی، تہذیبی اشتراک اور یگانگت کی مے دو آتشہ ہوگئی۔ حب الوطنی، متحدہ قومیت کا تصور اور غیرملکی سامراج سے آزادی پانے کے جنون نے الفت و محبت کے اس جذبے کو قوی تر کردیا اور مشترکہ درد وغم کا احساس ان کے دلوں کو قریب سے قریب تر لانے کا باعث ہوا۔ شاعر و ادیب اپنے فن پارے کا خام مواد اپنی ذات کے علاوہ ارد گرد پھیلی ہوئی وسیع کائنات اور اس میں پیش آنے والے حادثات و تجربات سے بھی حاصل کرتا ہے اور ان ہی حادثات و تجربات کو جذبے اور فکر کی آنچ میں تپا کر فن کی ٹکسال میں ڈھال دیتا ہے۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ اس انتشار، طوائف الملوکی اور لوٹ کھسوٹ کی سیاست کے نتیجے میں ساکنان ہند کے دلوں پر گزرنے والی قیامت شعرا کے دلوں کو متاثر نہ کرتی۔ آزاد اور حالی کی ذہنی قیادت میں موضوعاتی نظموں نے اپنے آغاز سے ہی حب الوطنی کے عناصر کا استقبال کیا۔ جیسے جیسے جدوجہد آزادی کی لے تیز ہوتی گئی ویسے ویسے برطانوی سامراج کے تئیں نفرت اور اپنے ملک سے محبت کا پودا تناور درخت کی شکل اختیار کرتا گیا۔ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں شعرا کا پورا قافلہ تھا جو برطانوی سامراج کی لوٹ کھسوٹ اور ''پھوٹ ڈالو اور راج کرو'' کی پالیسی کے خلاف مورچہ سنبھالے ہوئے تھا۔ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات ضبط کرکے نذر آتش کی جاتی رہی اور انھیں زنداں کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیلا جاتا رہا تاہم زنداں میں بھی جنوں کی یہ شورش نہیں گئی اور چکی کی مشقت کے پہلو بہ پہلو مشق سخن بھی جاری رہی۔

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں سردار جعفری، فیض، مخدوم، مجاز، علی جواد زیدی، احسان دانش اور سلام مچھلی شہری وغیرہ کے ہمراہ انقلاب اور بغاوت کے گیت گانے والوں میں ایک توانا آواز شمیم کرہانی کی بھی ہے۔ شمیم کرہانی نے ہنگامی موضوعات اور وطنی تحریکات کو اس طرح حیطۂ تخلیق میں داخل کیا کہ وہ یکجہتی کا صحیح تصور پیش کرسکیں۔ شمیم کرہانی کے شعری رویے کا اندازہ لگانے کے لیے اور زندگی اور انسانوں کے تئیں ان کے معیار زندگی کو سمجھنے کے لیے ان کے چند اشعار پر نظر ڈالنا معاون ثابت ہوگا:

جو مذاق رنگ و بو ہو تو دلوں کا بھید کیسا
کبھی موج گل نے پوچھا کہ صبا کی ذات کیا ہے
بساؤں گا اک وہ دل کی دنیا کہ جس میں گونجے گا لحن یزداں
نہ مسجدوں میں قعود ہوں گے نہ مندروں میں قیام ہوگا

جب کہ آزادی کا فطرت نے دیا ہے اذن عام
آدمی کو آدمی نے کیوں بنایا ہے غلام

شمیم کرہانی نے جب (1930 میں) لیلائے ادب کی زلفیں سنوارنے کا ارادہ کیا تو ہندوستان اقتصادی بدحالی، سیاسی انتشار اور سماجی بدحالی و نا آسودگی کا مکمل تھا۔ شمیم صاحب کے پہلے مجموعے 'برق و باراں' کے مشمولات کو دیکھ کر ہی امن، یکجہتی، مساوات اور آزادی کے تئیں ان کے فکری رجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں آگیا میدان میں، قومی گیت، انقلاب، جگاوا، جنگجو ہندوستانی اور آزادی کا حق وغیرہ مشہور نظمیں اسی مجموعے میں شامل ہیں۔ ان میں سے 'قومی گیت'، 'جوان جذبے'، 'اشتراکی جھنڈا' اور 'جگاوا' بطور خاص بہت مشہور ہوئیں۔

شمیم کرہانی کا ایک پورا مجموعہ روشن اندھیرا 1942 کی نظموں پر مشتمل ہے۔ 1942 ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں 'ہندوستان چھوڑو تحریک' کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے، اس کے ایک سال بعد 1943 کا سال بنگال کے قیامت خیز قحط کے حوالے سے ہمارے اجتماعی لاشعور میں ایک بھیانک یاد کی شکل میں محفوظ ہے۔ 1943 میں قحط بنگال کے نتیجے میں دس لاکھ سے زائد لوگ ہلاک ہوگئے تھے، یہ قحط کوئی پہلا حادثہ نہیں تھا بلکہ اس طویل سلسلے کا نقطۂ عروج تھا جو بنگال کی سرزمین کو وقتاً فوقتاً اپنے خونی پنجے میں جکڑ لیتا تھا۔ یہ 1943 کا بنگال ہے جس میں آج کا بنگلہ دیش، بہار کا جنوبی حصہ اور اڑیسہ بھی شامل تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور تاج برطانیہ نے ہندوستان کی

قدیم اور پھلتی پھولتی کپڑا سازی کی صنعتوں کو تباہ کر دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زراعت پر لوگوں کا انحصار زیادہ ہوگیا ساتھ ہی زراعت سے متعلق ان کی خود غرضانہ اور استحصالی پالیسیوں نے زمین سے اس کی زرخیزی چھین لی تھی۔ برطانیہ کی صنعتوں کے لیے خام مال کی ہوس نے جبراً نیل اور کپاس جیسی نقد آور فصلوں کے لیے زمین کو غصب کر رکھا تھا اور غذائی فصلوں کے لیے زمین پر بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبار 'انگلش مین' نے 1865 میں خبردار کیا تھا کہ 'ہم ایک ایسے دور میں داخل ہو رہے ہیں جہاں اناج کی کمی ہونے جارہی ہے" تاہم پنبہ بگوش نوآبادیاتی انتظامیہ نے قحط کے سدباب کے لیے کوئی اقدامات نہیں اٹھائے۔ بلکہ 1866 میں آئے قحط کے دوران گورنر سیسل بیڈن کا موقف تھا کہ "قدرت کے ان کاموں کو روکنے اور ان کا مداوا کرنے کے لیے کوئی بھی حکومت کچھ بھی نہیں کرسکتی۔"[1]

Cornelius wallard کے مطابق ہندوستان میں دو ہزار سالوں میں 17 دفعہ قحط پڑا تھا مگر ایسٹ انڈیا کمپنی اور تاج برطانیہ کے 120 سالہ دور میں 34 دفعہ قحط پڑا۔ بنگال کے اس قحط میں لگ بھگ ایک کروڑ افراد بھوک سے مرگئے تھے جو کل آبادی کا ایک تہائی حصہ تھے۔ لوگ بھوک کی شدت سے مجبور ہو کر اپنے جگر گوشوں کو فروخت کرنے لگے تھے۔ قحط بنگال میں انسانیت کی اس توہین نے شعرا و ادبا پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ وامق جونپوری کی 'بھوکا بنگال' اور ساحر لدھیانوی کی 'بنگال' اسی قحط کی دین ہیں۔ ساحر اور وامق کی نظمیں اچھی ہیں تاہم جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے ان کی پیش کش میں اکہرا پن اور خطابت غالب ہے جب کہ شمیم کرہانی کی فکر انگیز نظم 'کیوں گنگا کے دھارے' ایک کامیاب نظم ہے، جس میں موضوع کے ساتھ ساتھ فنی رچاؤ بھی نظر آتا ہے:

کیوں گنگا کے دھارے
تجھ میں چمکیں تجھ میں جھمکیں روپ گگن کے تارے
تجھ میں لہکیں تجھ میں مہکیں جل منڈل کے پیارے
اور ترے ریتیل میں تڑپیں دھرتی کے مہ پارے
کیوں گنگا کے دھارے[2]

بنگال چونکہ گنگا کے بیسن میں آباد ہے اور وہاں کی زرخیزی گنگا کی مرہون منت ہے اس لیے شاعر نے گنگا کے تمثیلی پیرایے میں قحط بنگال کی بہت کامیاب عکاسی کی ہے۔ پوری نظم بہت متاثر کن ہے۔ مزید ایک بند ملاحظہ ہو:

گھر، شمشان، کھنڈری گلیاں، بستی ہے یا پرتی
تو نے اب جو دیر لگائی جل جائے گی دھرتی
تجھ کو پیاسے نینوں سے تکتے ہیں تیرے پیارے
بڑھ گنگا کے دھارے[3]

عموماً ہنگامی موضوعات پر مبنی شاعری کا لہجہ خطیبانہ ہو جاتا ہے۔ کرہانی صاحب بھی بہت سی نظموں میں اس سے دامن نہیں بچا سکے، ان کی اس قبیل کی نظموں میں جوش و خروش کی فراوانی ہے لیکن جذبے کا خلوص اور صداقت مجروح ہوتے فن کی پردہ پوشی سے قاصر ہے تاہم 'گنگا کے دھارے' سادگی، دلکشی اور تخلیقی حسن سے معمور ہے۔ اس نظم کا تذکرہ کرتے ہوئے علی جواد زیدی لکھتے ہیں 'اس [قحط بنگال] پر کوئی ادیب کرشن چندر کے 'ان داتا' سے بہتر کوئی شاہکار نہیں پیش کرسکا۔ اسی طرح میرا خیال ہے کہ شمیم کی نظم 'گنگا کے دھارے' سے بہتر کوئی دوسری نظم اس موضوع پر نہیں کہی گئی۔'[4]

انگریزوں کی 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' پالیسی کی تخم ریزی فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں برگ و بار لائی۔ ہر دردمند دل انسانی خون کی ارزانی پر کراہ اٹھا۔ یہ درد ہندوستان کی قومیت اور یکجہتی کا علامیہ اور فرقہ واریت و انتشار کے خلاف کھلا ہوا اعلان جنگ ہے۔ شاعر آتش نفس کا دل بھی چیخ اٹھا۔ یہ چیخ قومی ہم آہنگی کے مٹتے ہوئے تصور کی بازیابی کے لیے تھی۔ یہ آواز وطن کی سالمیت، یکجہتی اور مشترکہ تہذیب و ثقافت کی تلاش میں تھی۔ ملاحظہ ہو:

ہم پرچم قومی کو لہرا کے ہمالہ پر
دشمن کی حکومت کے جھنڈے کو جھکا دیں گے
جو آڑ میں مذہب کی ہنگامہ کرے برپا
ہم ایسے فسادی کو گنگا میں بہا دیں گے
سر جائے کہ جاں جائے اے مادر ہند اک دن
ذلت سے غلامی کی ہم تجھ کو چھڑا دیں گے[5]

ہندوستان کی تقسیم سے قبل اور تقسیم کے بعد پورے شمالی ہندوستان میں آگ اور خون کی جو ہولی کھیلی جارہی تھی۔ فرقہ پرستی اور فسادات کے اس دور عروج میں بھی اردو شاعری نے یگانگت اور رواداری سے بھرپور مزاج کو باقی رکھا۔ شعرا نے اس عہد میں بھی مشترک جذبات کے ہی گیت گائے۔ شمیم کرہانی کی نظم 'کانی عورت' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

دیکھتے ہی ہوگیا دل میں تصور سے دونیم
مسلم و ہندو بھی اک ماں کی دو آنکھیں شمیم
پھوٹ جائے ایک پھر کس طرح منہ دکھلائے گی
مادر ہندوستاں بھی تو یونہی شرمائے گی[6]

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کا ایک مضحکہ خیز المیہ ہے کہ پانی بھی ہندو اور مسلمان ہوگیا تھا۔ ریلوے اسٹیشنوں پر پانی کے گھڑوں پر ہندو پانی اور مسلم پانی لکھا جانے لگا۔ امرتا پریتم رسیدی ٹکٹ میں لکھتی ہیں کہ بچپن میں جب وہ اپنی ماں کے ہمراہ گوجرانوالہ گئیں تو انھوں نے دیکھا کہ لدھیانہ ریلوے اسٹیشن پر ہندو اور مسلم دونوں کے لیے الگ الگ گھڑے رکھے تھے جن پر 'ہندو پانی' اور 'مسلم پانی' لکھا ہوا تھا، ان کا معصوم ذہن اس حقیقت کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ انھوں نے اپنی ماں سے سوال کیا کہ "کیا پانی بھی ہندو مسلمان ہوتا ہے؟" ماں نے جواب دیا "ہاں! یہاں ہوتا ہے بھگوان جانے آگے اور کیا ہوگا۔" شمیم کرہانی نے پانی کے اس قبول اسلام اور شدھی کرن پر ایک خوبصورت نظم 'پانی کے گھر' لکھی اس کے ابتدائی دو اشعار ملاحظہ ہوں:

ہائیں کیا یہ ایک اسٹیشن پہ دو پانی کے گھر
ایک پر لکھا ہوا ہندو، مسلماں ایک پر
پا بگل ہے اس نظارے سے دل تشنہ دہن
کی گئی ہے قید دو جیلوں میں اک روح وطن[7]

1942 میں برطانوی وزیر اعظم چرچل نے ہندوستان میں آئینی اصلاحات تجویز کرنے کے لیے سر اسٹیفورڈ کرپس کو بھیجا۔ کرپس مشن کی تجاویز سے عدم اتفاق رکھتے ہوئے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اسے مسترد کر دیا اور مسترد کرنے کے ساتھ ہی کانگریس نے فوری طور پر 8 اگست کو 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک شروع کردی جس میں انگریزوں سے مطالبہ کیا گیا کہ فوری طور پر ہندوستان کا اقتدار کانگریس کے حوالے کر کے ہندوستان سے نکل جائیں۔ اس کی پاداش میں 9 اگست کی صبح کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبران اور سبھی ہر دلعزیز قائدین کو اچانک نظر بند کر دیا گیا تھا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ انھیں میں سے ایک خبر یہ بھی تھی کہ گاندھی جی کی گرفتاری کے لیے پولیس اتنے سویرے پہنچ گئی تھی کہ ابھی وہ نیند سے بیدار بھی نہ ہونے پائے تھے۔ شمیم صاحب نے اس موقع پر نظم 'کچھ دیر ذرا سو لینے دو' لکھی۔ مجاور حسین رضوی لکھتے ہیں 'اردو شعرا نے دونوں موضوعات [قحط بنگال اور ہندوستان چھوڑ دو تحریک] کو اپنایا۔ 1942 کی جدوجہد آزادی پر سب سے اچھی نظمیں شمیم کرہانی نے لکھیں۔ ان کی 'کچھ دیر ذرا سو لینے دو' 'مہاتما گاندھی کی گرفتاری پر' اور 'روشن اندھیرا' اس کی کامیاب مثال ہے۔'[8]

گاندھی چونکہ ہندو مسلم اتحاد اور مشترکہ تہذیب کی علامت تھے اس لیے ہندوستانیوں کو ان سے گہری عقیدت تھی اور ہے۔ تاہم یک جہتی اور اہنسا کا یہ تصور اس

وقت پاش پاش ہوگیا جب تقسیم کے فوراً بعد اہنسا کے اس پجاری کے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ تاریخ ہند کی جبیں پر ثبت یہ وہ داغ ہے جس کے دھبے ہزاروں برساتوں کے بعد بھی نہیں دھلے جا سکیں گے۔ گاندھی کی شہادت نے صرف ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا کو گنگ کر کے رکھ دیا تھا۔ اس عہد کے تقریباً ہر شاعر نے اس پر نظمیں لکھیں۔ شیم صاحب نے 'جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے' لکھی۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

وہ بھگتی کی سمرن، وہ چاہت کی مالا
صداقت کی گنگا، خرد کا ہمالا
وہ بوڑھوں میں بوڑھا، وہ بالوں میں بالا
اک اندھیر نگری کا تنہا اجالا
کرن جیسے بادل کی لہرا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے[9]

قومی یک جہتی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ملک کی تہذیبی تاریخ سے ایسی شخصیتوں کے کارناموں کو خراج تحسین پیش کرنا جو افتراق کے بجائے اتحاد اور علاحدگی پسندی کے بجائے قومی وحدت کے قائل تھے۔ اردو شاعری میں شروع سے ہی یہ عنصر نظر آتا ہے۔ اردو شعرا نے بلا کسی مذہبی امتیاز کے مہادیو جی، شری کرشن جی، رام چندر جی، گوتم بدھ، گرو نانک اور امام حسین جیسی شخصیتوں کو اپنا ہیرو بنایا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر شخصیتیں مذہبی حیثیت رکھتی تھیں تاہم ان کے کردار سے عوام کو یگانگت اور رواداری کی روشنی ملتی ہے۔ جنگ آزادی کے رہنماؤں پر لکھی گئی نظمیں یک جہتی کے اسی پہلو کو نمایاں کرتی ہیں۔ شمیم صاحب نے جہاں گاندھی کی شہادت پر 'جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے' لکھی وہیں ابوالکلام آزاد کے انتقال پر نظم 'خضر حیات' لکھی۔

ساتھ ہی شمیم کرہانی کے یہاں ہندوستان کی تاریخ اور سیاست سے ایسے کردار کو بطور علامت اور استعارے استعمال کیا ہے جو تاریخ میں یک جہتی کا نشان بن گئے ہیں۔ 'بھولا ہوا رستہ' ایک ایسی ہی نظم ہے جو ہندوستان کی ڈھائی ہزار سالہ تہذیب کا ایک بہت خوبصورت اور دلکش کولاژ ہے جس کو دیکھ کر ہم ایک دلگداز اداسی کے حصار میں محصور ہو جاتے ہیں۔ اس نظم کو اگر شمیم صاحب کے فن کی معراج قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ نظم کا استعاراتی اور علامتی انداز شاعری کے فن پر ان کی قدرت کاملہ کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ 65 مصرعوں کے چھوٹے سے پیمانے میں ڈھائی ہزار سالہ تاریخ کو پیش کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ کچھ مصرعے ملاحظہ ہوں:

کھنڈر کی کالی اجاڑ منزل کے اک کنارے
حسین ناگن سی ایک ندی
نہ جانے کتنے ہزار سالوں سے بہہ رہی ہے
کوئی کہانی سی کہہ رہی ہے
کہ میرے ساحل پہ آریائی مسافروں نے
خرد کے دلکش محل بنائے
نئے تمدن کے بیل بوٹوں سے ان کے محراب و در سجائے
چراغ روحانیت جلائے
دراوڑوں کے سیاہ قدموں سے اپنے پیلے قدم ملائے
ملا کے مہر و وفا کی راہوں میں چل پڑے مشعلیں جلائے
اداس ساحل کی سمت دیکھو
بجھی بجھی سی وہ مشعلیں آج تک ملیں گی
کہ جن کی مدھم سی روشنی میں
پڑے ہیں ٹوٹے ہوئے ستارے
عظیم ارجن کے دل کے ٹکڑے،
مہان دسرتھ کے ماہ پارے
پوتر سیتا کا پاک آنچل
جبین ساوتری کا صندل
شکنتلا کے سہاگ کی گم شدہ انگوٹھی
شیام کی دل نواز بنسی
جو ایک جادو کا راگ بن کر دلوں کے
مدھوبن میں گونجتی تھی
صدائے جس کی حیات رادھا میں پیار کی چاندنی کھلا دی
ابل پڑے زندگی کی پیاسی زمین پر معرفت کے چشمے
سروں نے جس کے یہ راز کھولا کہ روح مرتی نہیں کبھی بھی
کہ روح اک لازوال شے ہے[10]

نظموں پر بات کرتے ہوئے سب سے بڑا مسئلہ حوالہ دینے کا ہوتا ہے۔ غزل کے اشعار اپنے آپ میں مکمل ہوتے ہیں، جب کہ نظمیں اپنے مفاہیم کے در وا کرنے کے لیے مکمل قرات کی متقاضی ہوتی ہیں۔ تاہم ان مصرعوں سے نظم کے مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ کرہانی صاحب کی یہ نظم اتنے دلکش آہنگ اور فنی محاسن سے مالا مال ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی صرف یہی ایک نظم اردو نظم کی تاریخ میں ان کو بقائے دوام دلانے کے لیے کافی ہے تو غلط نہ ہوگا تاہم حیرت کی بات ہے کہ اتنے خوبصورت لب و لہجے کے شاعر کو اردو دنیا نے تقریباً نظر انداز کیا ہے۔ مذکورہ نظموں کے علاوہ 'جاگا ہندوستان' 'پرچم نہ جھکانا' 'پاک ہولی' 'ترنگا پرچم' 'ہمارا ہندوستان' 'نئی تعمیر' اور 'بڑھ چل ہندوستان' ایسی بہت سی نظمیں ہیں جو اخوت، مساوات، امن اور یک جہتی کے جذبات سے

معمور ہیں۔ شمیم صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے قمر رئیس لکھتے ہیں "شمیم کرہانی مرحوم ایک خاص تہذیب، اس تہذیب کی خوش مذاقی، انسان دوستی اور حوصلہ خیز وطن پرستی کی آخری یادگاروں میں سے ایک تھے۔ اس تہذیب کے جمالیاتی کسب و کمال، اخلاقی آدرش اور اعلیٰ انسانی اقدار جب تک ہمیں عزیز رہیں گے شمیم کرہانی مرحوم بھی ہم میں زندہ رہیں گے۔"[11]

حوالہ جات

1۔ دینار پٹیل۔ "بنگال کے قحط کا ذمہ دار برطانیہ تھا"۔ بحوالہ
www.bbc.com>160611_orissa-famine-sq_
2۔ شمیم کرہانی، روشن اندھیرا (اگست 42ء کی نظمیں)۔ لکھنؤ، سرفراز قومی پریس 1946، ص 57
3۔ ایضاً ایضاً۔
4۔ علی جواد زیدی "پیش لفظ" روشن اندھیرا۔ ص 14
5۔ شمیم کرہانی: برق و باراں، لکھنؤ: انڈین بک ڈپو۔ ص 8
6۔ ایضاً، ص 54
7۔ ایضاً، ص 119
8۔ مجاور حسین رضوی: اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر، الہ آباد: شاہین پبلی کیشنز، ص 386
9۔ انتخاب شمیم کرہانی، دوسری اشاعت، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند 1982، ص 40
10۔ انتخاب شمیم کرہانی (مرتب) حنیف کیفی، دہلی: اردو اکادمی، 1999، ص 79
11۔ قمر رئیس، شاعر، بمبئی، ص 27،

■

Qamar Jahan
Room No.: 255, Ganga Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Email.:qamarjahan20@gmail.com

بلونت سنگھ
رومان سے حقیقت نگاری تک کا سفر

ثاقب انور

اردو افسانہ نگاری میں بلونت سنگھ کا نام بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ جون 1921 میں پیدا ہوئے اور 27 مئی 1986 کو ان کی وفات ہوئی۔ انھوں نے اگرچہ فکشن کی مختلف قسموں میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں لیکن جس صنف سے ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوا وہ صنف افسانہ ہے۔ بلونت سنگھ کی پہلی کہانی 'سزا' 1937 میں ماہنامہ 'ساقی' میں شائع ہوئی اور بعد میں 'ڈنڈ' کے عنوان سے ہندی میں چھپی۔ اس کے بعد سے وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک ہندی اور اردو میں مسلسل لکھتے رہے اور شائع ہوتے رہے۔ 'جگا'، 'پہلا پتھر'، تارو پود، سنہرا دیس، ہندوستان ہمارا، افسانے، پنجاب کی کہانیاں، 'چلمن' اور 'دیوتا کا جنم' ان کے مشہور افسانوی مجموعے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ بلونت سنگھ کی تمام کہانیاں اعلیٰ درجے کی نہیں لیکن انھوں نے چند ایسے افسانے یقیناً لکھے ہیں جو اردو افسانوں کے کسی سخت سے سخت انتخاب میں بھی جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

بلونت سنگھ نے دیہات کی زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت گہرائی سے کیا ہے اور اسے اپنے افسانوں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ دیہاتی زندگی اپنے تمام رنگوں کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

بلونت سنگھ کے افسانوں کا دیہات پنجاب سے تعلق رکھتا ہے۔ یوں تو پنجاب سے تعلق رکھنے والے پہلے افسانہ نگار سدرشن تھے لیکن پریم چند سے متاثر ہونے کی وجہ سے پنجاب کی زمین کو وہ اپنے افسانوں میں کوئی جگہ نہ دے پائے۔ اس کی ابتدا اوپندر ناتھ اشک نے کی۔ کرشن چندر نے بھی پنجاب کی دیہاتی زندگی پر افسانے لکھے، لیکن انھوں نے اپنی پوری توجہ اس طرف صرف نہیں کی۔ اس کے بعد احمد ندیم قاسمی نے کسی حد تک اس میدان میں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے پنجاب کے پس ماندہ طبقے کی مجبوریوں، محرومیوں، جہالت، مفلسی، سماجی نابرابری اور جدو جہد آزادی جیسے متعدد موضوعات پر افسانے لکھے، پنجاب کی تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج کو بیان کیا، فسادات کے موضوع پر بھی قلم اٹھایا اور دیہی زندگی کی سچی تصویر بھی پیش کی۔ پنجاب کی زندگی کو افسانوں میں آئینہ کرنے کے حوالے سے بلونت سنگھ کا موازنہ بالعموم احمد ندیم قاسمی سے کیا جاسکتا ہے مگر جیسا کہ عابد حسن منٹو نے لکھا ہے:

'' قاسمی اور بلونت سنگھ کی کہانیوں کے پنجاب میں ایک بنیادی فرق ہے۔ یہ فرق قاسمی کی رومانیت اور بلونت سنگھ کی حقیقت نگاری کی پیدا کردہ ہے۔ احمد ندیم قاسمی کو پنجاب کے دیہات میں غربت اور افلاس کا احساس ہے، لیکن وہ اپنی شاعرانہ طبیعت کی وجہ سے کھیتوں، میدانوں، رہٹوں، البیلے جوانوں اور الہڑ دوشیزاؤں کی کہانیوں کے خالق کی حیثیت سے یاد رہے گا جب کہ بلونت سنگھ پنجاب کے رومان سے بھی واقف ہے، لیکن وہ اس رومان کی فضا کو اپنی کہانیوں پر چھا جانے کی ایسی اجازت نہیں دیتا کہ اس کے کرداروں کی حقیقی تصویریں نہیں ابھر سکتیں۔ وہ حسن کا اظہار تو کرتا ہے، لیکن حقیقت نگاری کی نظر سے اس کے پاس صرف رومانی نگاہ سے نہیں۔ پنجاب کی دیہاتی دوشیزہ میں جتنی ملائمیت ہے اتنا ہی کھردراپن یہاں کے جوان کی مردانگی میں ہے۔ بلونت سنگھ اس کھردرے پن کی کہانیاں سناتا ہے جب کہ

قاسمی اس کی ملائمیت کی۔''

(عابد حسن منٹو، ایک افسانہ نگار بلونت سنگھ، مضمون مطبوعہ سوغات، شمارہ 8، مارچ 1995، ص 27-426)

بلونت سنگھ نے پنجاب کو اس کے اصلی رنگ و روپ میں دیکھا اور دکھانا چاہا ہے۔ انھوں نے اس کو سیاحوں کی جنت بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ وہاں کی دیہی زندگی کے ہر روپ کو ظاہر کیا ہے۔ دیہات کی ایک تصویر ان کے افسانہ 'پنجاب کا البیلا' میں یوں سامنے آتی ہے۔

''دھوپ ہلکی پڑ چکی تھی، لیکن گرمی اب بھی کافی تھی۔ سڑک بڑے بڑے کھیتوں سے ہوکر جاتی تھی۔ راستے میں سڑک سے ذرا پرے ہٹ کر جا بجا رہٹ چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ کنوؤں کا صاف و شفاف پانی جھالوں میں گرتا ہوا آنکھوں کو کس قدر بھلا معلوم ہوتا تھا۔ ان پر ان کی کنوؤں کے گرد قینچی سے کتری ہوئی داڑھیوں والے کسان موٹے سوتی کپڑے کے تہبند باندھے بڑے سرور کے عالم میں حقے گڑگڑاتے نظر آتے تھے۔ جب کنوؤں پر کام کرنے والی لڑکیاں اور عورتیں کھیتوں میں مٹک مٹک کر ادھر اُدھر چلتی تھیں تو ان کی لمبی لمبی چوٹیاں ناگنوں کی طرح بل کھا کھا کر لہراتی تھیں۔ بیلوں کی ٹانگوں میں گھس گھس کر بھونکنے والے کتے اپنا الگ شور مچا رہے تھے اور اپنی میلی کچیلی چندریوں میں سوکھے ہوئے گوبر کے ٹکڑے جمع کرنے والی لڑکیاں کبھی اپنا کام چھوڑ کر گہریوں کی طرح میری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔''

(بلونت سنگھ، پنجاب کا البیلا، سوغات، شمارہ 8 مارچ 1995 ص 216)

بلونت سنگھ نے یہاں دیہاتی ماحول کی تصویر پیش کرنے میں اپنے بہترین مشاہدے کا ثبوت دیا ہے اور کئی لحاظ سے حقیقت پسندی کو ظاہر کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔

بلونت سنگھ کی مشہور کہانی 'رشتہ' بہادری اور دلیری کے موضوع پر ایک عمدہ تخلیق ہے۔ اس کا مرکزی کردار نہ صرف گھوڑی کی چوری کرتا ہے بلکہ کرنیل سنگھ کی بیٹی سے اپنی محبت کا اظہار بھی کرتا ہے۔ گھوڑی کے گم ہونے پر سکھ جاٹ کا حال کیا ہوتا ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے بلونت سنگھ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سکھ جاٹ کی دو چیزوں میں جان ہوتی ہے۔ اس کی لاٹھی اور اس کی سواری کی گھوڑی یا گھوڑا۔ اگر یہ چیزیں چوری ہو جائیں تو انھیں تلاش کرنے میں وہ زمین اور آسمان ایک کر دیتا ہے۔ اگر کوئی جاٹ سے اس کی یہ چیزیں چھین لینے کی کوشش کرے تو وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر دشمن بھاری پڑے اور اس کی یہ چیزیں چھن جائیں تو وہ چلو بھر پانی میں ڈوب مرتا ہے''۔

(رشتہ مطبوعہ سوغات، شمارہ 8، مارچ 1995، ص 189)

اس کہانی میں کرنیل سنگھ کی بیٹی کی محبت میں گرفتار نوجوان سے نوکر کہتا ہے کہ اگر تم کرنیل صاحب کی گھوڑی واپس کردو تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی تمہارے ساتھ کردیں، لہٰذا وہ دس دن بعد گھوڑی کے ساتھ واپس آتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ خود چور ہے اور وجہ بھی بتاتا ہے کہ اس نے چوری کیوں کی تھی۔ کرنیل صاحب اس کی بہادری اور ہمت کے قائل ہو جاتے ہیں اور اس سے اپنی بیٹی کی شادی کردیتے ہیں۔

بلونت سنگھ کے کردار مختلف خصوصیات کے حامل ہیں۔ کبھی وہ محبوبہ کو حاصل کرنے کے لیے ڈاکہ زنی ترک کردیتے ہیں تو کبھی محبوبہ کو پانے کے لیے چوری کرتے ہیں۔ اس نوع کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

''مجموعی طور پر یہ افسانے تشدد اور لوٹ مار سے زیادہ جواں مردی کی تکریم کرتے ہیں، لیکن ایسے افسانے کسی انسانی صورت حال کو ہم پر واضح نہیں کرتے۔''

(شمس الرحمن فاروقی، بلونت سنگھ کے کچھ افسانے، مطبوعہ آج کل، بلونت سنگھ نمبر جنوری 1995، ص 27)

بلونت سنگھ کے افسانہ 'سنہرا دیس' کا مرکزی کردار تھوپ سنگھ ہے جو روزی کمانے کی فکر میں شہر جاتا ہے اور اس شہر کو 'سنہرا دیس' کہتا ہے، لیکن 'سنہرا دیس' میں اس کے خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ انھوں نے تھوپ سنگھ کو دیہی نوجوان کا ایک ایسا نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے جو پیسہ کمانے کے لیے اپنے گاؤں کو چھوڑ دیتا ہے، لیکن اس کے خواب کی تکمیل یہاں بھی نہیں ہوتی۔ افسانہ 'سنہرا دیس' حقیقت پسندی کے بہت قریب ہے۔ بقول عابد حسن منٹو:

''بلونت سنگھ حقیقت نگار ہے لیکن اردو افسانہ نگاری کے ضمن میں حقیقت نگاری کی اصطلاح مختلف طریقوں سے استعمال کی گئی ہے۔ کرشن چندر بھی حقیقت نگار ہے اور منٹو بھی۔ کرشن چندر کی حقیقت نگاری محض موضوع کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، ورنہ انداز تحریر کے اعتبار سے وہ ہمیشہ ہی رومانوی رہا ہے۔ اس کے برعکس منٹو اپنے موضوع اور اسلوب نگارش دونوں اعتبار سے حقیقت نگار ہے۔ بلونت سنگھ کی حقیقت نگاری کرشن چندر کی حقیت نگاری سے قریب نہیں بلکہ منٹو کی حقیقت نگاری سے قریب تر ہے۔ بلونت سنگھ براہ راست بات کہنے کا عادی ہے۔ اس کے اظہار میں وہی بے باکی اور وہی بے رحمی کا سا انداز پایا جاتا ہے جو سعادت حسن منٹو کے اسلوب کی خوبی سمجھا گیا

بلونت سنگھ کے افسانہ 'سنہرا دیس' کا مرکزی کردار تھوپ سنگھ ہے جو روزی کمانے کی فکر میں شہر جاتا ہے اور اس شہر کو 'سنہرا دیس' کہتا ہے، لیکن 'سنہرا دیس' میں اس کے خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ انھوں نے تھوپ سنگھ کو دیہی نوجوان کا ایک ایسا نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے جو پیسہ کمانے کے لیے اپنے گانوں کو چھوڑ دیتا ہے، لیکن اس کے خواب کی تکمیل یہاں بھی نہیں ہوتی۔ افسانہ 'سنہرا دیس' حقیقت پسندی کے بہت قریب ہے۔

ہے۔ دونوں فن کاروں کا بنیادی فرق ان کے افسانوں کے مواد کی وجہ سے ہے۔ سعادت حسن منٹو کے افسانوں کا مواد عجیب و غریب کرداروں کے جنسی معاملات سے تعلق رکھتا ہے جب کہ بلونت سنگھ اپنی کہانیوں کا مواد خالص جنسی مسائل کے بجائے ان مسائل کے سماجی اثرات سے حاصل کرتا ہے۔ خود جنسی معاملات کے اظہار میں بلونت سنگھ جنس سے زیادہ معاملے کو اہمیت دیتا ہے اور اس لیے منٹو سے مختلف ہو جاتا ہے، لیکن چونکہ طریق تحریر میں وہ منٹو سے حد درجہ قریب ہے اس لیے بعض ایسی تحریروں میں وہ بالکل ہی منٹو معلوم ہوتا ہے جن میں موضوع بھی منٹو والا ہی ہو۔''

(عابد حسن منٹو، ایک افسانہ نگار بلونت سنگھ مضمون مطبوعہ سوغات، شمارہ 8، مارچ 1995، ص 429)

بلونت سنگھ نے انسانی ہمدردی پر بھی افسانے لکھے ہیں۔ 'سزا' اور 'پہلا پتھر' ایسے ہی افسانے ہیں۔ 'پہلا پتھر' میں نچلے پنجابی طبقے کی مشترکہ زندگی نمایاں کی گئی ہے۔ یہاں باج سنگھ عورتوں اور لالہ جی کی تین بیٹیوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ یہ افسانہ منٹو سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار باج سنگھ اچانک سنجیدہ ہو جاتا ہے، جب نابینا سانولی اپنے محبوب کی باتوں اور وعدوں کا تذکرہ باج سنگھ اور اس کے ساتھیوں سے کرتی ہے تو انداز یہ ہوتا ہے:

''باجے چاچا! نہ جانے میرے دل کو کیا ہو گیا ہے۔ کچھ سوجھتا ہی نہیں کہ کیا کروں .... باج چاچا

سوچتی ہوں ایسی کھشی کی بات کیسے ہوسکتی ہے، لیکن چاچا تمھیں میری بات پر اکین ہے نا؟ باج نے گھوم کر اپنے ساتھیوں کی جانب سوالیہ انداز سے دیکھا۔ سب چپ تھے وہ بھی چپ رہ گیا۔''

(بلونت سنگھ، پہلا پتھر، سوغات شمارہ 8، مارچ 1995، ص 244)

افسانہ 'سزا' میں تارا سنگھ ایک سیدھا سادہ عام کسان ہے، جس کو ایک یتیم لڑکی جیت کور سے محبت ہوجاتی ہے۔ وہ تارا سنگھ کو اچھا انسان نہیں سمجھتی تھی، لیکن جب تارا سنگھ اپنی تمام عمر کی جمع کی ہوئی کمائی سے اس کے گھر کو نیلام ہونے سے بچا لیتا ہے تب جیت کور کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اچھا انسان ہے جو اس کے بُرے وقت میں کام آیا۔ افسانے کے بالکل آخر تک تارا جیت کور سے کہتا ہے:

''روتی کیوں ہو جیتو میں تو ہر وقت اس کوشش میں رہتا ہوں کہ تمہارے کام آسکوں۔ جیتوں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر اسی جگہ رکھ دیا جس جگہ اس کمبخت ہاتھوں سے سلیپر مارا تھا۔ پھر دھیرے سے کہنے لگی۔ تارو اب میں جاتی ہوں۔ میں پھر آؤں گی، اب تم آرام کرو، ہاں! میں پھر آؤں گی۔ یہ کہہ کر سیڑھی کے پاس آئی اور سلیپر پہن کر لوٹی تو دیکھا کہ تارو راستہ رو کے دروازے کے آگے کھڑا ہے۔ وہ مسکرا کر اپنے کرخت لہجہ میں بولا جیتو آج پھر میری نیت خراب ہو رہی ہے۔ آج پھر سزا دے دو۔ جیتو نے جھینپ کر اچٹتی ہوئی نگاہ تارو پر ڈالی پھر جسم چراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اپنے جوڑے سے چنبیلی کا ہار کھولا اور کچھ مسکرا کر اور کچھ لجا کر وہ ہار اس کے گلے میں ڈال دیا۔''

(بلونت سنگھ، سزا، بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، مرتبہ گوپی چند نارنگ ساہتیہ اکادمی، دہلی 1885، ص 39-138)

تقسیم ہند کے بعد منظر عام پر آنے والا بلونت سنگھ کا سب سے اچھا افسانہ 'کالے کوس' ہے جس میں گاماں تین عورتوں کے ساتھ جان کی سلامتی کی خاطر پاکستان جاتا ہے۔ اس افسانے میں بلونت سنگھ نے بتایا ہے کہ فسادات میں انسانوں کو کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہر وقت جان کا خوف رہتا ہے، ماں، بیوی، بہن کی عزت کی فکر رہتی ہے۔ گاماں اپنے گھر کی خواتین کے ساتھ رات کو سفر کرتا ہے اور دن کے وقت کہیں چھپ جاتا ہے۔ اس مصیبت میں اس کا ایک ہندو دوست مدد کرتا ہے یہ اور اسے سرحد پار صحیح سلامت پہنچاتا ہے۔ گاماں لٹیرا، قاتل اور بدمعاش ڈاکو ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کسان بھی ہے۔ ہل چلانا اس کا آبائی پیشہ ہے۔ پھلور سنگھ گاماں کا

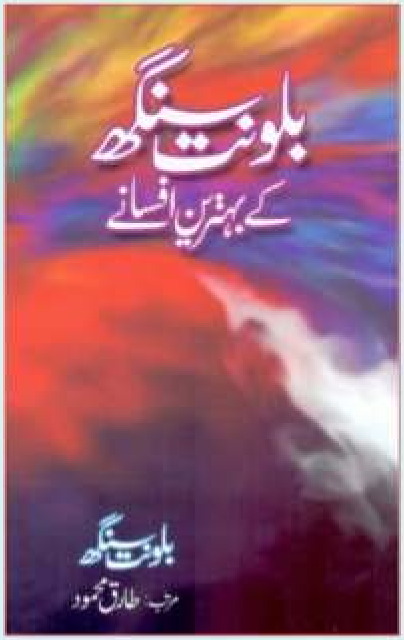

بچپن کا دوست ہے۔ بُرے کام دونوں نے ساتھ کیے، چنانچہ اس افسانے کے حوالے سے انور خاں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''بُرے آدمیوں میں بھی دوستی کا جذبہ کس قدر شدید ہوتا ہے اور کیسے بسا اوقات انسان نیکی اور بدی کے مروجہ معیاروں سے آگے چلا جاتا ہے، اس سلسلے میں بلونت سنگھ کا وژن کہیں نہیں دھندلاتا۔ اپنے تمام تر اختلافات اور تضادات کے باوجود ان کے لیے انسان وہی انسان ہے، کمزوری کا پتلا، جس کی اچھائیاں برائیوں پر کبھی کبھی غالب آجاتی ہیں اور وہ ایسے ہی لمحات کے مصور ہیں۔''

(انور خاں، پنجاب کا البیلا، بلونت سنگھ، مطبوعہ آج کل، جنوری 1995، ص 47)

بلونت سنگھ دیہاتی زندگی کے ترجمان ہیں۔ ان کے افسانوں میں جن شخصوں کو پیش کیا گیا ہے ان کی شجاعت و مردانگی سے ایک خوبصورت اور صحت مند زندگی کا نقش ابھرتا ہے۔ بقول وارث علوی:

''ان کے افسانوں میں پنجاب جاگتا ہے۔ پنجاب کا وہ کھردرا اور سنگین روپ جس نے تاڑ جیسے لمبے اور چٹانوں جیسے مضبوط لڑاکوں اور گرانڈیل لوگ پیدا کیے۔ سانڈنی سوار قد آور ڈاکو، میلوں تک چیتے کی رفتار سے دوڑنے والے چور، گینڈوں کی طاقت رکھنے والے شوریدہ سر نوجوان جو بات بے بات پر مارنے مرنے کو تیار ہوجاتے ہیں۔ بلونت سنگھ نے ان سب کی زندگی کو پنجاب کے رومان میں بدل دیا ہے۔ 'پنجاب کا البیلا' اور 'تین چور' اس سلسلے کی ان کی مشہور اور مقبول کہانیاں ہیں۔ اس شوریدہ سری کو اس کے فطری پس منظر میں دیکھنے کا مطلب ہے اس کی طاقت، حسن اور ہیئت کا تجربہ کرنا۔ ان افسانوں میں ان کا طریقہ، رومان کو افسانہ کے حقیقت پسند فریم ورک میں بریکٹ کرنے کا طریقہ رہا ہے، اسی حقیقت پسندی نے انھیں مزاج کی وہ چاشنی بخشی ہے جو ان افسانوں کے تشدد کو قابل برداشت بناتی ہے۔''

(وارث علوی، بلونت سنگھ کی افسانہ نگاری کے چند پہلو، مطبوعہ آجکل، جنوری 1995، ص 37)

بلونت سنگھ اپنے کرداروں کو بے وجہ خوبصورت بنانے اور بدبو کو خوشبو میں بدلنے کی کوشش نہیں کرتے، البتہ جب وہ حقیقت نگاری پر آتے ہیں تو بعض لمحہ حقیقی بدبو کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ نمونے کے طور پر اس اقتباس کو دیکھیے:

''میں سانڈنی کی کوہان سے پھسلا جاتا تھا۔ چنانچہ میں اس کی کمر سے لپٹ گیا۔ اس کے گاڑھے کی قمیص پسینے میں تر ہو رہی تھی۔ بغلوں سے ہلکی بو بھی آرہی تھی۔ بازوؤں کے گھنے بال پسینے میں تر ہو کر چپک گئے تھے۔ اس کے جوڑے پر بندھی ہوئی جالی کے نیچے کو لٹکتے ہوئے پھندے میرے .... اور آنکھوں میں گھسے جا رہے ہیں۔''

(انور سدید، اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد 1983، ص 102)

بلونت سنگھ کی یہ تصویر کشی بہت ہی بھیانک ہے، مگر ان کے ذہن میں ایک فطری انسان کا دل بھی دھڑک رہا ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ اس دل کی بے قراری کو ہی نہیں سنتا بلکہ اس پر گہری نظر بھی ڈالتا ہے۔

بلونت سنگھ افسانے کے فن سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے افسانوں کی واضح شناخت ان کا کہانی پن ہے۔ ماحول کی پیش کش اور جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ وہ حقیقت نگاری کے فن سے بھی واقف ہیں۔ وہ نہ کسی غیر ضروری بات کو طول دینے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ کبھی اہم بات کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ان کے اکثر افسانے حقیقت پسندی پر مبنی ہیں۔ وہ لگ بھگ تمام افسانوں میں دیہاتی زندگی کی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں۔ بیشک اردو افسانے کی دنیا میں بلونت سنگھ کی جگہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

■

Dr. Md. Saquib Anwer
Vill.: Sarwily, Post: Bara Eidgah, Via: Qasba
Distt.: Purnea - 854330 (Bihar)
Mob.:9801261623

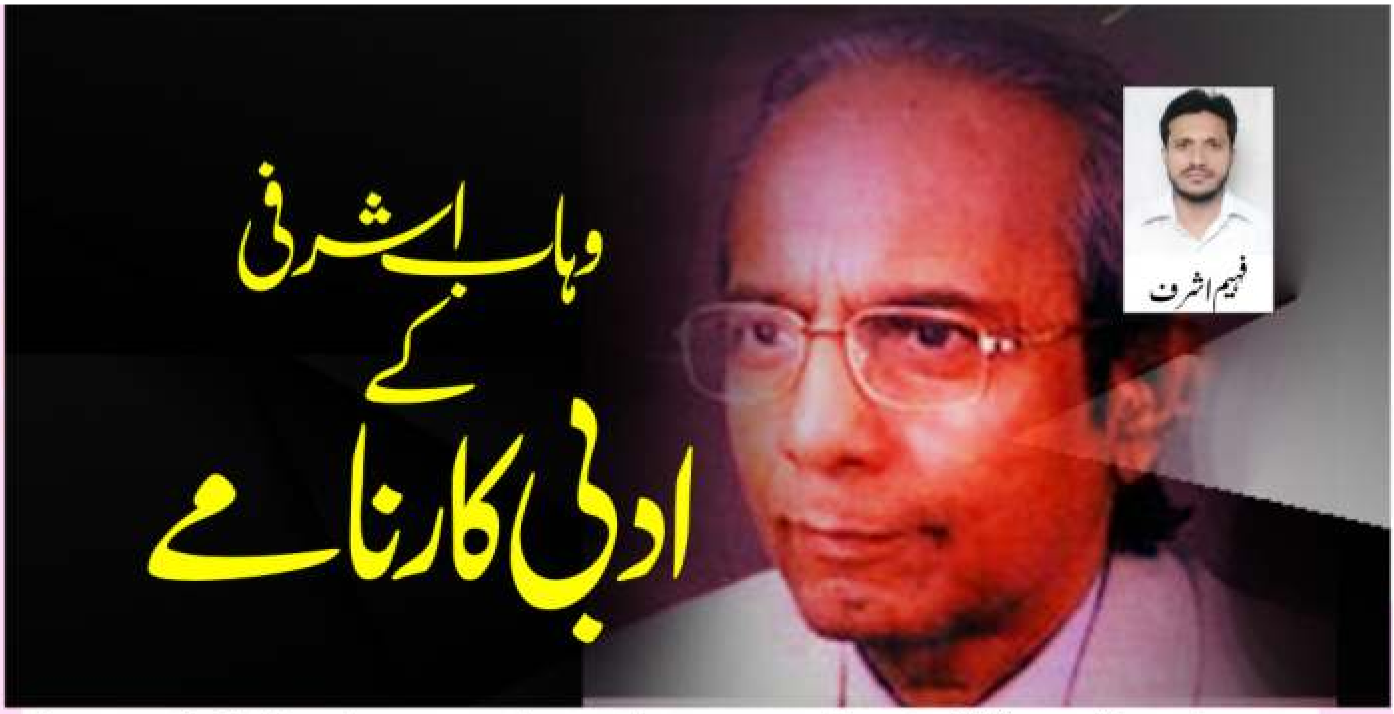

وہاب اشرفی کے ادبی کارنامے
فہیم اشرف

پروفیسر وہاب اشرفی ہمہ جہت اور عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ ادب سے ان کی والہانہ فریفتگی وشیفتگی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ وہ بہ یک وقت محقق، بے نظیر نقاد، صحافی، تاریخ نویس، باکمال استاد اور افسانہ نگار تھے۔ آزادیِ ہند کے بعد اردو ادب میں تنقید نگاری کو افکارِ تازہ عطا کرنے والوں میں سید وہاب اشرفی بھی ایک اہم نام ہے۔ اپنے مخصوص تنقیدی نظریات وتصورات کی وجہ سے اردو تنقید میں وہاب اشرفی بلند مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے شعور وفکر کا گہرا، مربوط اور مستحکم نقش چھوڑا بلکہ اپنی علمی وتنقیدی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ بھی کیا۔ ساتھ ہی اپنے اندر موجود تنقید کی فطری صلاحیت کو مغربی اصول ونظریات کے عمیق مطالعے سے بامِ عروج تک پہنچایا۔ ان کی تنقیدی صلاحیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ نثری صنف ہو یا شعری یکساں طور پر نقد وپرکھ کی صلاحیت ان کے اندر موجود تھی۔ انھوں نے ادبی روایات کا ہمیشہ احترام بھی کیا ہے، اپنی وسیع القلبی کے ساتھ آتی جاتی لہروں کا خیر مقدم بھی کیا ہے۔ مختلف ادبی تحریکوں اور نظریات نے ناقدین کو بھی مختلف خیموں میں تقسیم کیا ہے۔ آج ہر بڑا ناقد کسی نہ کسی رجحان یا دبستان سے وابستہ نظر آتا ہے۔ اس تصادم اور نظریاتی علاحدگی کے ماحول میں وہاب اشرفی ایسے ناقد ہیں جن کا امتیازی وصف یہ ہے کہ انھوں نے کسی دبستان سے خود کو باضابطہ وابستہ نہیں کیا۔ ذہن کو کھلا رکھا۔ چنانچہ ان کی ادبی اہمیت اردو کے نامور ناقدین میں مسلّم ہے۔ ان کے قلم سے تقریباً دو درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں جس کے ذریعے اردو تحقیق وتنقید میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

سید وہاب اشرفی نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی شروعات صحافت سے کی۔ کلکتہ کی سکونت کے دوران مشہور اخبارات 'عصرِ جدید'، 'الحق' اور 'اخوت' وغیرہ سے وابستہ رہے اور گیا سے شائع ہونے والا رسالہ 'آہنگ' اور 'مورچہ' میں بھی اپنی خدمات دیں۔ پھر رسالہ 'صنم' میں مدیر رہے جو تقریباً پانچ برسوں تک جاری رہا اور اس مختصر سی مدت میں اس رسالے نے نہ صرف مقبولیت حاصل کی بلکہ دو اہم شمارے 'بہار نمبر' اور 'افسانہ نمبر' کے نام سے شائع کیے جو تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ پٹنہ سے سہ ماہی 'مباحثہ' نکال رہے تھے جو ان کی زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا۔ اس رسالے نے اردو رسائل میں ایک الگ مقام حاصل کیا، بالخصوص اردو نسل کا ہر دل عزیز رسالہ رہا ہے جس نے نو وارد ادیبوں، شاعروں اور فکشن نگاروں کو نہ صرف جوڑنے کا کام کیا بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔

وہاب اشرفی صاحب نے رسائل وجرائد کی آبیاری کے ساتھ تصنیف وتالیف کے عمل کو بھی جاری رکھا۔ پہلے پہل تو نظمیں اور غزلیں لکھیں مگر جلد افسانہ نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کا پہلا افسانہ 'اپنی اپنی راہ' ہے، جو رسالہ 'بیسویں صدی' میں شائع ہوا۔ انھوں نے کم وبیش 42 افسانے لکھے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے حادثے پیش آئے کہ موصوف نے تخلیق سے تنقید کی طرف اپنی توجہ کو مرکوز کر دیا۔ یہی وہ میدان تھا جس نے انھیں عروج بخشا۔ حالانکہ انھوں نے زمانہ طالب علمی سے جس صنف کی طرف توجہ نہیں کی وہی ان کا مقدر ٹھہری۔ ان کی پہلی تنقیدی تصنیف 'قطب مشتری: ایک تنقیدی جائزہ' (1967) ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے مُلّا وجہی کی مثنوی کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہاب اشرفی کی اس تنقیدی کاوش کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ پھر انھوں نے متانت کے ساتھ اپنے محسوسات کو گویائی عطا کرنے کا ذریعہ تنقید کو چُنا۔ وہاب اشرفی کی دوسری تنقیدی کتاب 'قدیم ادبی تنقید' (1973) ہے۔ جس میں انھوں نے مغرب کے پانچ قدیم نقادوں ارسطو، افلاطون، ہوریس، کونٹیلین اور لانجائنس کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ یہ کتاب اہم اس لیے ہے کہ موصوف نے نہ صرف ان قدیم نقادوں کے تنقیدی خیالات سے ہمیں آشنا کرانے کی کوشش کی ہے بلکہ ان کے تنقیدی خیالات پر اپنے تنقیدی تاثرات بھی ظاہر کیے ہیں۔ 'مثنویاتِ میر کا تنقیدی جائزہ' (1981) بھی آپ کی ایسی کتاب ہے جس میں تند آمیز طریقے سے میر کی مثنویوں کا محاسبہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے واضح طور پر مثنویاتِ میر کی خوبیوں اور خامیوں کو نہ صرف اجاگر کیا ہے بلکہ اردو کے ایک معتبر شاعر پر تاثرات قلم بند کرتے ہوئے اپنے آپ کو کسی قسم کی مصلحت اور جانبداری سے پاک رکھا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی 'مثنوی اور مثنویات' ہے جس میں اردو کی معروف مثنویوں کے ساتھ غیر معروف مثنویات کے متعلق بنیادی معلومات فراہم کی ہیں۔

موصوف نے آدھے درجن کے قریب مجموعہ ہائے مضامین بھی یادگار چھوڑے ہیں 'معنی کی تلاش' (1978) وہاب اشرفی کے ان مقالات کا پہلا مجموعہ ہے جو ملک کے معتبر رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے تھے۔ اس کا ایک مضمون 'افسانے کا منصب' جو تھوڑا طویل ہے مسلسل موضوعِ بحث رہا۔ اس مجموعے کا ہر مقالہ موضوع سے پوری طرح انصاف کرتا ہے۔ دوسرا مجموعہ 'آگہی کا منظر نامہ' (1989) ہے۔ یہ اپنے مشمولات کے اعتبار سے خاصا وقیع ہے۔ خاص طور پر تحقیق وتنقید کا باہمی رشتہ، اردو میں دانشوری، کلامِ اقبال کے نثری معانی، جمیل مظہری اور غیاث احمد گدی کا فنی مطالعہ اہم ہیں۔ تیسرا مجموعہ 'اردو فکشن

اور تیسری 'آگہی' (1995) فکشن سے متعلق وہاب اشرفی کی نکتہ رسی کو واضح کرتا ہے۔ انھوں نے اس میں فکشن کے بنیاد گزاروں کے ساتھ معاصر فنکاروں کا بھی جائزہ لیا ہے اور بالخصوص تقابلی موازنہ کرتے ہوئے معاصر فکشن کے امتیازات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضامین کا چوتھا مجموعہ 'حرف حرف آشنا' (1996) ہے۔ اردو کے اہم ترین شعرا غالب، مومن، اقبال اور چند دوسرے اہم شعرا پر ان کا فوکس ہے اور ان کی شاعری کے علامتی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اس میں شاعری اور شعریات کے بعض اہم نکات زیر بحث آئے ہیں۔ اس میں انھوں نے جدید تنقیدی رویے کو پیش نظر رکھا ہے۔ 'معنی سے مصافحہ' (2005) یہ ان کے تنقیدی مضامین کا پانچواں مجموعہ ہے۔ یہ اس وجہ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں جہاں ایک طرف اردو کے کلاسیکی شعرا سودا اور غالب تو دوسری طرف عاقد شبلی کی شاعری پر مضامین ہیں وہیں قدیم وجدید شعری منظر نامے کا احوال بھی درج ہے۔ ساتھ ہی معاصر فکشن کے نمائندہ لکھنے والوں مثلاً جیلانی بانو، احمد یوسف، عبد الصمد، شوکت حیات، شموئل احمد، جابر حسین اور محمود واجد وغیرہ کا بھی بے باکی سے احاطہ کیا ہے۔ اس کتاب کے بعض مضامین بحث طلب ہیں اور ڈسکورس کی فضا قائم کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ مجموعہ ہائے مضامین 'معنی کی جبلت'، 'معنی کا مسئلہ' تقاریظ اور تبصروں کا مجموعہ 'نکتہ نکتہ تعارف' اور حال ہی میں ان کی ایسی کتابیں شائع ہوئی تھیں جنھوں نے اردو دنیا کو چونکا دیا۔ مثلاً 'مشرقی ومغربی تنقید'، 'مارکسی فلسفہ اشتراکیت اور اردو ادب'، 'ادراک معنی اور پس آئینہ' وغیرہ۔ اس میں دو کتابیں 'مشرقی ومغربی تنقید' اور 'مارکسی فلسفہ اور اشتراکیت' اپنے موضوع کے اعتبار سے بے حد اہم ہیں اور وسیع ووقیع مطالعہ کا نمونہ بھی۔ مارکسی فلسفے اور اشتراکیت پر تو شاید ہی اتنی شرح وبسط سے کوئی کتاب لکھی گئی ہو۔ وہاب اشرفی نے مونوگراف بھی لکھے ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود دلچسپ اور اہمیت سے خالی نہیں ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام ہندوستانی ادب کے معمار سیریز کے تحت قاضی عبد الودود (1999)، مجروح سلطانپوری (2003 اور کلیم الدین احمد (2011) پر مونوگراف لکھ کر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

وہاب اشرفی نے سنجیدہ قارئین کے ساتھ طلبہ کا خیال رکھا۔ 'کہانی کے روپ' (1979) 'نقوش ادب' (1980) یہ ایسی تصانیف ہیں جس میں نثری تخلیقات کی فنی اصطلاحات کا تعارف آسان انداز میں پیش کیا ہے اور مثال کے ساتھ تفہیم کو آسان بنایا ہے۔ 'تفہیم البلاغت' (1986) میں شاعری کی فنی اصطلاحات کا تعارف آسان لفظوں میں پیش کیا ہے اور مثال کے لیے اشعار بھی آسان اور عام فہم منتخب کیے ہیں۔ وہاب اشرفی نے نصابی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے بھی کچھ کتابیں لکھی ہیں۔ 'پطرس اور ان کے مضامین' (1985)۔ اس کا مقدمہ طلبا کے لیے کارآمد ہے جو طنز ومزاح میں فرق کے ساتھ ساتھ پطرس کی مزاح نگاری کی جزئیات سے واقف کراتا ہے۔ 'راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری' (1986) ایک مختصر ترین کتاب ہے جس میں 'اپنے دکھ مجھے دے دو' کے افسانوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے بیدی کی افسانہ نگاری کے اہم نکات سے بحث کی ہے۔ اس کتاب کی ابتدا میں ایک مکمل مضمون 'اردو افسانے کی روایت' کے عنوان سے لکھا گیا ہے جس میں افسانے کی تاریخ اور معروف فنکاروں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

موصوف کے تحقیقی اور تاریخی کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو 1975 میں مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی 'اردو نثر کے ارتقاء میں شاد عظیم آبادی کا حصہ' کتابی صورت میں شائع ہو کر مقبول ہوا۔ 'کاشف الحقائق : ایک مطالعہ' (1982) تدوین کے جدید اصولوں کی روشنی میں مدون کیا اور ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر اس کی اہمیت کو واضح کیا۔ امداد امام اثر کی جانب بطور خاص لوگوں کی توجہ دلائی اور اس کتاب کے مثبت ومنفی پہلوؤں پر غیر جانبدارانہ رائے قائم کی۔ 'سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے' (1982) موصوف کی ایک اور اہم کتاب منظر عام پر آئی جو کہ انھوں نے اپنے ہم عصر پر لکھی ہے۔ اس کتاب میں سہیل عظیم آبادی کے نمائندہ افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے متن کی روح میں اترنے کی کوشش کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سہیل کا فن پریم چند سے مختلف تھا۔

1991 سے 2005 تک وہاب اشرفی نے 'تاریخ ادبیات عالم' کی سات جلدیں پیش کر کے اپنی تحقیقی اور قاموسی شخصیت کا لوہا منوالیا۔ ان سات جلدوں میں دنیا کی بیشتر ترقی یافتہ زبانوں کے نمائندہ ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس نوعیت کے پروجکٹ عام طور پر ادارے یا تنظیم انجام دیتے ہیں مگر وہاب اشرفی کی ذات بابرکات کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تن تنہا اس مشکل کام کو نہ صرف پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ مختلف قوموں اور ملکوں کے مرکزی دھاروں کو گرفت میں لے کر قارئین کو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ادب کے گرانقدر خیالات وتصورات سے واقفیت کرانے کا لازوال فریضہ انجام دیا۔ یہاں وہاب اشرفی کی حیثیت ایک انجمن کی سی معلوم ہوتی ہے۔

پروفیسر شمس الرحمن فاروقی ان کی اس ادبی کاوش کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''موجودہ حالات میں جب اردو میں عام مطالعہ کی کتابیں بہت کم ہیں........ وہاب اشرفی کی قاموسی کتاب 'تاریخ ادبیات عالم' نہ صرف بہت بڑی کمی کو پوری کرتی ہے بلکہ اپنی ذات میں خود ایک وقیع علمی کارنامہ بھی ہے۔ وہاب اشرفی کا علم ومطالعہ بہت وقیع تو ہے ہی لیکن اتنی ہی اہم بات یہ کہ انھیں قاموسیات سے ذہنی مناسبت بھی ہے۔ ان دنوں جب بڑے کاموں کے کرنے کی بات کمیٹی اور جلسوں ہی کے ذریعے ہوتی ہے........ جدید اردو تنقید کی پہلی کتاب 'کاشف الحقائق' کا انھوں نے مطالعہ کیا ہے اور اس کو مدون بھی کیا ہے۔ یہ سب اکتسابات ان کی اس صلاحیت پر دال ہیں کہ وہ عالمی ادبیات کی تاریخ لکھنے کے ہر طرح اہل ہیں''۔

(بحوالہ سہ ماہی 'جہان اردو' دربھنگہ)

2007 میں وہاب اشرفی نے ایک اور قاموسی اور تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ تین جلدوں میں 'تاریخ ادب اردو' لکھ کر دنیائے اردو کو حیرت زدہ کر دیا۔ یہ اردو میں اب تک کی سب سے اپٹوڈیٹ تاریخ ہے۔ اس میں 2000 تک کے فنکاروں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب پر موصوف کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ فن سوانح نگاری میں ان کی آپ بیتی 'قصہ بے سمت زندگی کا' سولہ ابواب پر مشتمل ہے، جس میں ان کی ذاتی اور سماجی افکار وزندگی کا ذکر ملتا ہے۔ ساتھ ہی اپنے عہد معاشرت اور معاصرین کے ادبی خیالات سے بھی روبرو کراتی ہے۔

اگر ہم وہاب اشرفی کے اسلوب کی بات کریں تو ان کا پیرایہ اظہار بے حد سلیس، عام فہم، چھوٹے چھوٹے جملوں اور فقروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کی نثری تحریر میں ایک شاعرانہ شگفتگی کا عکس نظر آتا ہے جو قاری کو اسیر کر لیتی ہے۔ بیان میں کسی طرح کا کوئی الجھاؤ یا ابہام نہیں ہے۔ ان کے اسلوب میں پختگی اور ادبی رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے جس کے پس منظر میں مطالعے کی وسعت اور تجربات کی جدت محسوس کی جا سکتی ہے۔

وہاب اشرفی 2012 تک بہ قید حیات رہے اور اپنی ادبی وعلمی سرگرمیوں سے اردو ادب کو مالا مال کرتے رہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت ادیب، نقاد، محقق اور دانشور کی حیثیتوں سے قائم کی ہے۔ موصوف کے بیش بہا کارنامے ان کی یاد کو نہ صرف تازہ کرتے رہیں گے بلکہ ہمارے لیے مشعل راہ بنے رہیں گے۔

■

Faheem Ashraf
Research Scholar
Mohanlal Sukhadia University
University Road, Ganesh Nagar
Udaipur-313001 (Rajasthan)

فکشن تنقید کا سپہ سالار
وارث علوی

آس محمد صدیقی

وارث علوی (11 جون 1928۔ 9 جنوری 2014) اردو کے اہم اور منفرد نقاد ہیں۔ انھوں نے تقریباً دو درجن کتابیں تصنیف کر کے فکشن تنقید میں اپنی انفرادیت اور اہمیت کے پرچم نصب کیے۔ ان کی اہم تصانیف میں تیسرے درجے کا مسافر، اے پیارے لوگو، حالی مقدمہ اور ہم، خندہ ہائے بیجا، کچھ بچالایا ہوں، پیشہ تو سپہ گری کا بھلا، جدید افسانہ اور اس کے مسائل، فکشن کی تنقید کا المیہ، اوراق پارینہ، ادب کا غیر اہم آدمی، لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر، ناخن کا قرض، سرزنش خار، راجندر سنگھ بیدی ایک مطالعہ، گنجفہ باز خیال، اور ریختا نہ چمن وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے کئی مضامین رسائل و جرائد کی زینت بنے جن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مختلف النوع موضوعات پر مضامین تحریر کیے۔

یوں تو وارث علوی کا شمار فکشن کے ناقدین میں ہوتا ہے لیکن انھوں نے اردو شعرا کو بھی اپنے مطالعے کا موضوع بنایا اور متعدد شاعروں پر تنقیدی مضامین تحریر کر کے اس بات کا ثبوت فراہم کیا کہ وہ نہ صرف نثری اصناف ادب کے پارکھ ہیں بلکہ شاعری کی دنیا بھی ان کی نگاہوں میں ہے۔ غالب اور اقبال سے لے کر محمد علوی او رندا فاضلی تک ایسے بے شمار شعرا ہیں جن کے کلام پر وارث علوی نے جامع اور مدلل بحث کی ہے۔

انھوں نے اردو فکشن اور فکشن نگاروں کا فنی و جمالیاتی مطالعہ کیا اور پھر ان پر غیر جانبدارانہ طور پر رائے دی۔ کلاسیکی فکشن نگاروں سے لے کر جدید اور مابعد جدید فکشن نگاروں تک شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر افسانہ نگار ہو جس کے فن کا تنقیدی جائزہ وارث علوی نے نہ پیش کیا ہو، کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ، عصمت چغتائی، رام لعل، عزیز احمد، انتظار حسین، غیاث احمد گدی، ضمیر الدین شاہ، لالی چودھری، فہمیدہ ریاض، شفق، شیر شاہ سید، ترنم ریاض، خالد جاوید اور دوسرے بہت سے فکشن نگاروں پر انھوں نے جامع اور مدلل مضامین لکھے۔ وہ جب کرشن چندر جیسے بڑے فکشن نویس پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا منشا صرف کرشن چندر کی فنی خوبیوں اور خامیوں کو موضوع بحث بنانا ہوتا ہے۔ کرشن چندر کی شخصیت کو وہ بحث کا موضوع نہیں بناتے

ان کا اصل میدان افسانوی تنقید ہے۔ انھوں نے سعادت حسن منٹو پر ایک کتاب 'منٹو۔ ایک مطالعہ' کے نام سے لکھی جس میں منٹو کے متعلق پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اردو کا ایک طبقہ منٹو پر جنس نگاری کا لیبل لگاتا ہے بلکہ اس موضوع کو بنیاد بنا کر ان پر مقدمات بھی قائم کیے گئے۔ اس قسم کے لوگوں میں جلد بازی کا عنصر کچھ زیادہ نظر آتا ہے۔ وہ دور بینی سے بھی محروم دکھائی دیتے ہیں، ان کی نظریں سکے کے ایک ہی رخ کو دیکھ سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ منٹو نے جنسی موضوعات پر قلم اٹھایا بہت بیباکی سے ان پر باتیں کی لیکن ان کے علاوہ بھی موضوعات کی ایک دنیا ان کے یہاں نظر آتی ہے۔ اگر ایک طرف وہ 'ٹھنڈا گوشت' اور 'کالی شلوار' جیسے افسانے لکھتے ہیں تو دوسری طرف 'تماشا' اور 'نیا قانون' جیسے افسانے بھی ہیں جو منٹو کے سماجی اور سیاسی شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ وارث علوی نے منٹو کے فکر و فن کا نہایت ہی سنجیدگی سے مطالعہ کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ منٹو دراصل ایک ایسے فن کار ہیں جو حقیقت اور تخیل کی آمیزش میں کامیاب ہیں، اس تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

''فن کے اس اعلیٰ مقام پر تھا جہاں حقیقت اور افسانہ کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اس لیے یہ فریب پیدا ہوتا ہے کہ منٹو کیمرے کی آنکھ سے ہر چیز کو دیکھتا ہے، کیمرے کی آنکھ سے آرٹ پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ آرٹ حقیقت اور تخیل کی آمیزش کا نام ہے۔ تخیل کے پر لگا کر اڑنا لیکن حقیقت سے اپنا رشتہ نہ توڑنا فن کی معراج ہے۔''[1]

منٹو کے فکر و فن سے آگہی کے لیے دراصل ایک ایسا ذہن درکار ہے جو ادب اور جمالیات کی پرکھ بھی رکھتا ہو اور ادبی نقطہ نظر سے ایک پختہ ذہن کا بھی مالک ہو کیونکہ وارث علوی کے مطابق:

''منٹو اور میراجی نے اپنی نظمیں اور افسانے ناپختہ اور فاتر العقل لوگوں کے لیے تخلیق نہیں کیے۔ ان کی تخلیقات اعصاب سے نہیں کھیلتیں، بلکہ جمالیاتی تجربے

کی تشکیل کی کوشش کرتی ہیں۔"[2]

اسی طرح راجندر سنگھ بیدی پر ایک کتاب 'راجندر سنگھ بیدی۔ایک مطالعہ' کے نام سے لکھی جس میں بیدی کے تقریباً 58 افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ وارث علوی نے افسانے کی تنقید سے متعلق اپنی اس اہم کتاب میں بیدی کے ان افسانوں کو موضوع بحث بنایا ہے جنھیں عام طور پر پڑھنے اور سمجھنے سے گریز کیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افسانے کے عام قاری ان تک رسائی نہ حاصل کر سکے۔ وارث علوی نے اس کتاب کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے،حصہ اول میں انھوں نے بیدی کے فکر وفن اور اسلوب پر سیر حاصل بحث کی تو حصہ دوم میں ان کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے،اس کے علاوہ بیدی کے مشہور ناول 'ایک چادر میلی سی' کا تنقیدی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اس ناول پر اب تک تبصرے اور مضامین کی شکل میں سیکڑوں صفحے سیاہ کیے جا چکے ہیں لیکن وارث علوی نے اس ناول کے کرداروں کا جس طرح اپنے مخصوص اور منفرد اسلوب کے ساتھ مطالعہ پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔اس تعلق سے ساجد رشید 'راجندر سنگھ بیدی۔ایک مطالعہ' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وارث علوی نے جس گہرائی اور گیرائی سے ناول کے مرکزی کرداروں کی نفسیاتی گتھیوں کو کھولا ہے وہ بیدی کے اس فن پارے کو معنویت عطا کرتا ہے۔دیگر ابواب میں افسانوں کو عنوانات کی مناسبت سے یا ان کے موضوع کی مطابقت سے گفتگو کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ بیدی کے اٹھاون افسانوں کی قرأت اور پھر ان کے موضوعات کی تخصیص کوئی سہل کام نہ تھا۔وارث علوی نے افسانوں کے جو باب قائم کیے ہیں وہ ان کی تفہیم کو ضرور سہل بناتے ہیں۔"[3]

وارث علوی نے منٹو اور بیدی کے بعض افسانوی کرداروں کا تجزیہ اس قدر دلچسپ اور سائنٹفک انداز میں پیش کیا کہ کہا جانے لگا ان کی تنقید اتنی ہی دلچسپ ہے جتنے کہ افسانے مثلاً منٹو کے افسانے ہتک، بو اور بابو گوپی ناتھ اور بیدی کے افسانے گرہن، کوکھ جلی، گرم کوٹ وغیرہ۔

وارث علوی نے فکشن کی تنقید میں افسانے اور ناول کی ساخت اور اس کی تکنیک کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ پلاٹ، کردار، واقعہ نگاری، افسانے کی زبان و بیان اور افسانوی ادب کے مختلف لوازمات پر مفصل اور مدلل انداز میں لکھا۔ انھیں خاص طور پر ناول سے حد درجہ رغبت ہے۔اس کا اندازہ ان کے ایک مضمون جس کا عنوان ہی ہے 'ناول بن جینا بھی کوئی جینا ہے' سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ان کے نزدیک ناول کی تعریف یہ ہے کہ وہ انکشاف کرتا ہو، صداقت کا متلاشی ہو اور حقیقت کی تھاہ پا لینے کی کوشش دکھاتا ہو۔ وہ ناول اور افسانہ کو ایک ایسا فریم مانتے ہیں جس کے اندر انسانی زندگی کی تصویر کو زیادہ معنی خیز، بصیرت افروز اور نشاط انگیز طریقہ سے دیکھ سکتے ہیں۔ وارث علوی جدید افسانہ کی مخالفت تو نہیں کرتے لیکن تجربات اور تبدیلیوں کے نام پر جدید افسانہ نگار نہ ہی افسانہ کے روایتی فن میں کوئی سودمند اضافہ کر سکا اور نہ ہی نیا فن تشکیل کر سکا انھیں جدید افسانہ نگاروں سے حد درجہ شکایت ہے کہ:

"نئے افسانہ نگار سے اجتہاد بن نہیں پڑا،اور نہ پلاٹ، نہ کہانی، نہ کردار نگاری، نہ ہی زمان ومکان کی قید اس کے سامنے کسی ایسے جامد اور مجر رسومات تھے جو اس کے لیے نقطۂ انحراف کا باعث بنتے۔انحراف اور اجتہاد دونوں سے محروم نیا افسانہ نگار نہ تو پرانے فارم ہی کو کوئی تازگی دے سکا نہ نیا فارم ایجاد کر سکا۔"[4]

تنقید کا مسلمہ اصول ہے کہ کوئی بھی دعوی بغیر دلیل کے قابل قبول نہیں ہوتا۔اور ظاہر ہے دلائل کی بازیافت کے لیے وسیع مطالعہ درکار ہوتا ہے۔ چونکہ انگریزی، روسی اور فرانسیسی ادبیات کا مطالعہ بھی ان کا گہرا تھا اس لیے ان کی شخصیت نئے نئے افکار و آرا سے مزین تھی اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ٹھوس دلائل پیش کرنے میں کامیاب رہے۔ وہاب اشرفی کی طرح وارث علوی بھی کبھی کسی ازم کا شکار نہیں ہوئے کیونکہ انھیں اپنی نظر پر مکمل اعتماد ہے۔لکھتے ہیں:

"میں ادب آرٹ اور تہذیب کے معاملہ میں کسی تحریک، رجحان یا مکتب سے کمٹ ہونا پسند نہیں کرتا۔ مجھے اپنی نظر پر اعتماد ہے اور نظر کو میں کسی نظریہ کا پابند کرنا گوارا نہیں کرتا۔"[5]

وہ نظریات سے کام لیتے ضرور ہیں لیکن انھوں نے کبھی بھی ایک نظریے کی علمبرداری نہیں کی۔ کیونکہ اگر کوئی تخلیق کار یا پھر تنقید نگار اپنے آپ کو کسی ایک نظریے میں قید کر لیتا ہے تو پھر اس کی تنقید نگاری اسی نظریے کی تعبیر و تشریح کا عکس نظر آتی ہے یا بہ الفاظ دیگر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس نظریے کا علمبردار ہوتا ہے۔وارث علوی نے اپنے کئی مضامین میں یہ بتایا ہے کہ ادب کسی حصار میں مقید رہ کر ترقی کے منازل نہیں طے کر سکتا۔ بلکہ ایک ادیب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ آزادانہ ذہن کا مالک ہوتا کہ اس کی تخلیقات کسی مخصوص نظریے کی تعبیر و تشریح سے یکسر پاک ہوں۔ان کا کہنا ہے ایک اچھے ادیب کا ذہن تمام طرح کی بندشوں سے پاک ہوتا ہے۔وہ بہت سارے خیالات سے فیض ضرور حاصل کرتا ہے مگر کسی ایک خیال اور نظریے کا پابند نہیں ہوتا۔اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

"فنکار تو اپنے فن کے ذریعے اپنی ذات کا عرفان حاصل کر کے پوری کائنات کو سمجھتا ہے وہ تو یہی دیکھتا ہے وہ خود کیا ہے، پرچھائیں یا آدمی۔اگر وہ پرچھائیں ہے تو ایک طرفی میکانکی، تبلیغی اور تلقینی ادب پیدا کرتا ہے۔اگر آدمی ہے تو وہ ادب پیدا کرتا ہے جو پہلودار ہے، آرزوؤں کی انجمن اور اندیشوں کا نگار خانہ ہے، سوز وساز و رومی اور پیچ وتاب رازی کی رزم گاہ ہے۔"[6]

وارث علوی ترقی پسند تنقید سے تو خاصا بدظن نظر آتے ہیں کیونکہ اس کی بنیاد چند ایسے عقائد اور تصورات پر ہے جو ادب نہیں بلکہ ایک مخصوص فلسفہ سے ماخوذ ہیں اور فلسفہ بھی ایسا جو یا تو مبلغانہ ہے یا محاربانہ۔ ایک مبلغ کے نزدیک صحیح اور غلط کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی

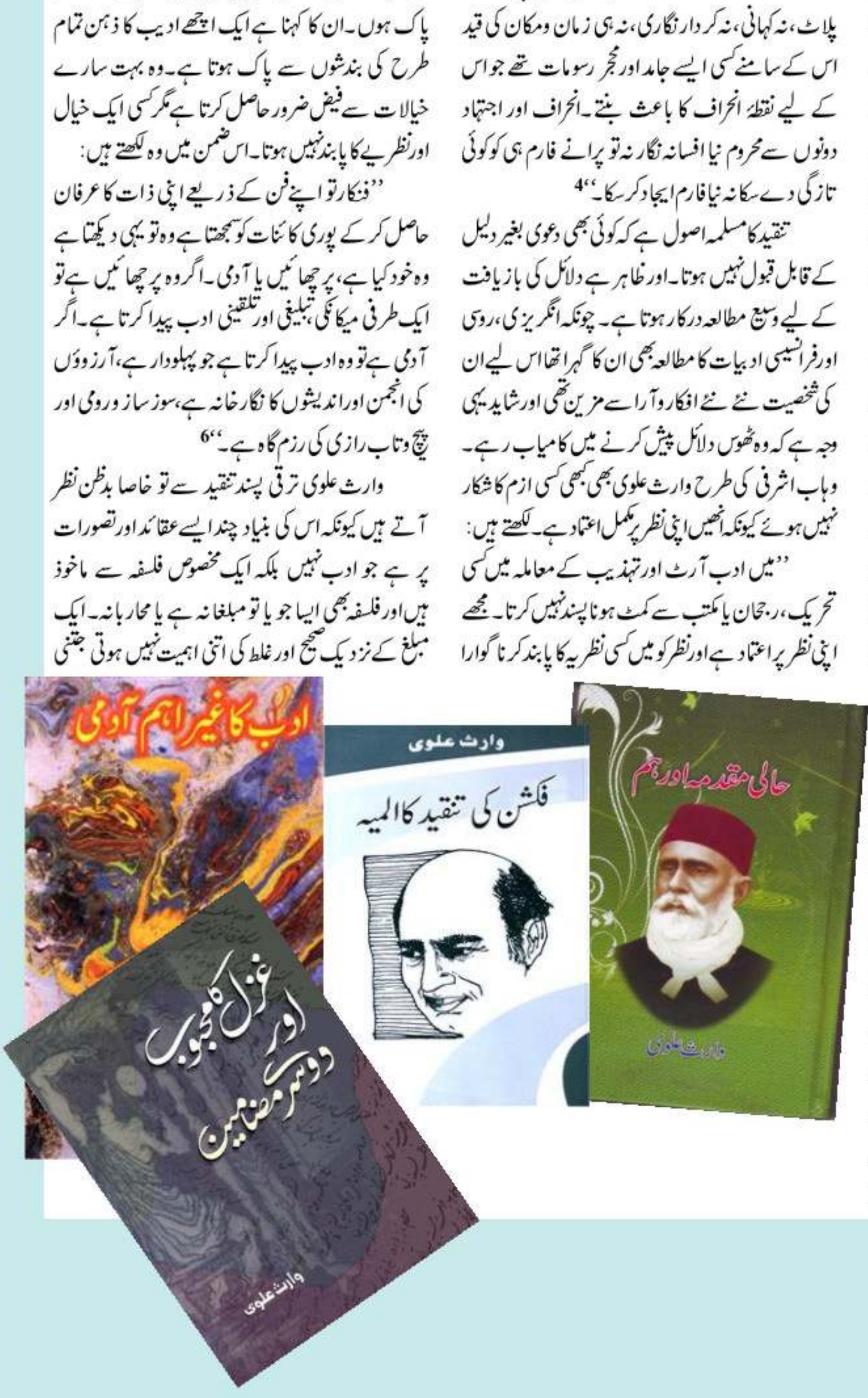

اس کے نظریے کی۔ اسے اس بات سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا کہ دراصل حقیقت کیا ہے، وہ اسی کو حقیقت مان رہا ہوتا ہے جس کے لیے وہ اپنے حواس کو بہت پہلے ہی قائل کر چکا ہوتا ہے اور اب اس کی نظر اپنے اسی نظریے کی تعبیر و تشریح پر مرکوز رہتی ہے۔ اس تناظر میں اگر ہم ترقی پسندوں کو دیکھیں تو بقول وارث علوی وہ اتنے راسخ العقیدہ ہوتے ہیں کہ دوسرے لوگ انھیں دشمن نظر آتے ہیں۔ اپنی کتاب 'خندہ ہائے بیجا' میں وہ لکھتے ہیں:

''جوان کے ہم عقیدہ نہیں انھیں ترقی پسند یا تو اپنا دشمن سمجھتے ہیں یا اگر کشادہ دلی کا ثبوت دیں تو ناگوار دوست۔ ترقی پسند تنقید یا تو مبلغانہ ہے یا محاربانہ اس میں فکر کی کمی اور جذبہ کا وفور ہے۔ آدرش واد اور یوٹوپیائزم کا اتنا غلبہ ہے کہ آنکھ حقیقت دیکھ ہی نہیں پاتی۔ حقیقت سے مراد یہاں زندگی کی حقیقت بھی ہے اور ادب کی حقیقت بھی۔''[7]

محولہ بالا اقتباس کا آخری جملہ قابل غور وفکر ہے۔ وارث علوی نے اس جملے کے ذریعے ترقی پسند تنقید کو یکسر بے معنی بتا دیا ہے۔ کیونکہ جس تنقید یا فن پارے میں زندگی کی بھی حقیقت نہ ہو اور ادب کی بھی تو ظاہر ہے ایسی تنقید اور ایسا فن پارہ چہ معنی دارد؟ لیکن وارث علوی کا یہ اپنا خیال ہو سکتا ہے۔ اپنے تمام تر نقائص اور کمیوں کے باوجود ترقی پسند تحریک اور اس کے زیر سایہ وجود میں آئے ادبی اور تنقیدی کارناموں کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

وارث علوی نے افسانوی تنقید کے علاوہ نظریاتی مضامین بھی لکھے ہیں جو ان کے وسیع مطالعے کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً ادب اور کمٹ منٹ، ادب اور سماج، ادب اور سیاست، فسادات اور ادب، ادب اور پروپیگنڈہ، ادب اور عوام، ادب اور آئیڈیولوجی، وغیرہ۔ مذکورہ بالا مضامین میں انھوں نے اپنے موقف کی وضاحت عالمانہ اور دانشورانہ انداز میں کی ہے۔

ان کی تنقید نگاری کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ پڑھنے میں بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ ان کے متعلق یہ صحیح بات کہی جاتی ہے انھوں نے فلسفے کو پانی کر دیا ہے۔ وہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ مسئلے کو صاف اور ستھرے اور آسان زبان میں پیش کرتے ہیں کہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ دراصل ان کے اسلوب میں طنز ومزاح کا عنصر بھی ہے۔ وارث علوی کے تنقیدی مضامین پر مبنی کتاب 'بت خانہ چین' کے پیش لفظ میں محی الدین بمبئی والا نے لکھا ہے:۔

''ان کو حس ظرافت خدا کی اتنی بڑی دین ہے کہ غالب کی طرح انھیں بھی حیوان ظریف کہا جا سکتا ہے۔ کالج کے پروفیسروں کا تو کہنا تھا کہ جس طرح ڈاکٹر جانسن کے پاس بوسویل تھا جو اس کی ہر ظریفانہ بات نوٹ کر لیا کرتا تھا، وارث صاحب کے پاس بھی ایسا ایک بوسویل ہونا چاہیے تھا۔ ان کی ظرافت ان کے گجراتی ڈراموں میں کھل اٹھی اور کمال یہ ہوا کہ تنقید جیسی سنجیدہ اور اصطلاحوں سے بھری ہوئی صنف ادب کو بھی ان کی ظرافت نے لالہ زار بنا دیا۔''[8]

تنقیدہماری زندگی کے لیے اتنی ہی ناگزیرہے جتنی سانس" ایلیٹ کا یہ جملہ یقینا اپنے اندر معنویت کاایک اتھاہ سمندر لیے ہوئے ہے۔پیدائش سے لے کر موت تک انسان کا تنقیدی شعور زندگی کے ہر قدم اورہر موڑ پر اس کی رہنمائی کر تا ہے۔ اگر محاسن و معائب کی تمیز نہ ہو تو انسانی زندگی اپنے حدود سے باہرہوکر جانوروں کے مماثل قرار پائے اور وہ کبھی دانشمندی کے اس وصف کامستحق قرارنہ پائے جہاں پہنچ کر کہا جاتا ہے

وارث علوی نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں اس وقت کے تنقید نگاروں پر مضامین لکھے۔ ان مضامین میں وزیر آغا، قمر رئیس، ڈاکٹر محمد حسن، سید محمد عقیل، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمان فاروقی اور شمیم حنفی وغیرہ کے نظریات پر ظرافت کے انداز میں بہت ہی بیباک تنقید کی ہے۔ انھوں نے ان ناقدین ادب سے اختلاف ضرور کیا مگر یہ اختلاف نظریاتی تھے انھیں ذاتیات کا حصہ نہ بننے دیا کیونکہ وہ مذہب، مسلک، ذات، گروہ بندی اور علاقائیت جیسی بڑی اور بری بیماریوں سے اوپر اٹھ کر صحت مند ادب کے قائل اور اس کے فروغ میں ہمیشہ کوشاں رہے۔

''تنقید ہماری زندگی کے لیے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی سانس'' ایلیٹ کا یہ جملہ یقیناً اپنے اندر معنویت کا ایک اتھاہ سمندر لیے ہوئے ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک انسان کا تنقیدی شعور زندگی کے ہر قدم اور ہر موڑ پر اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اگر محاسن ومعائب کی تمیز نہ ہو تو انسانی زندگی اپنے حدود سے باہر ہو کر جانوروں کے مماثل قرار پائے اور وہ کبھی دانشمندی کے اس وصف کا مستحق قرار نہ پائے جہاں پہنچ کر کہا جاتا ہے:

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں

تنقید زندگی کا ایک اہم حصہ ہے جس پر بڑی حد تک انسانیت کا دار ومدار بھی ہے۔ وہ تنقیدی شعور ہی ہے جو انسان کو تمام قسم کی گمراہیوں سے بچا کر صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرماتی ہے۔ تنقیدی ذہن کی اہمیت کا اندازہ آپ وارث علوی کے اس اقتباس سے بخوبی لگا سکتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''تنقیدی ذہن کی قدر و قیمت، غیر تنقیدی ذہن سے اسی لیے زیادہ ہے کہ وہ جذبات کو بھڑکانے سہانے خواب دکھانے اور تعصبات کو پالنے دل خوش کن خیالات کا آسانی سے شکار نہیں ہوتا۔ تنقیدی ذہن ہر قوم کی آئیڈیولوجی اور ہر قسم کے فلسفے کا مطالعہ کرتا ہے اور اسے یہ خوف نہیں ہوتا کہ کوئی آئیڈیولوجی اسے بھی اس طرح مغلوب کرے گی جس طرح جاہل عوام کو کرتی ہے۔''[9]

دیگر تمام شعبہ ہائے زندگی کی طرح ادب کے لیے بھی تنقید اتنی ہی ضروری ہے جتنی زندگی کے لیے سانس کیوں کہ تنقید فن پاروں کو وہ حرارت بہم پہنچاتی ہے جس سے ان کی پژمردگی دور ہوتی ہے اور وہ ادبی فن پارے کا حصہ بن پاتی ہے۔ وارث علوی فکشن تنقید کو وہی حرارت اپنی تحریروں سے پوری زندگی پہنچاتے رہے نیز ان کی تحریریں علم کا وہ بحر بے کراں ہیں جن میں غوطہ زنی کے بغیر کچھ ہاتھ نہیں لگتا گہری بات تو کجا۔ ان کا اسلوب الفاظ ومعنی کو برتنے کا ہنر سکھاتا ہے۔

حوالہ جات

1- وارث علوی، منٹو: ایک مطالعہ (وجے پبلشرز، دریا گنج، نئی دہلی، 1997) ص 23
2- وارث علوی، تیسرے درجے کا مسافر (امت پرکاشن، جودھپور، راجستھان، 1981) ص 95
3- ساجد رشید، سہ ماہی نیا ورق (جلد نمبر 10، شمارہ 26، اپریل تا جون، 2007 بمبئی) ص 203
4- وارث علوی، بتخانہ چین (گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر، 2010) ص 532
5- ایضاً ص 92
6- وارث علوی، تیسرے درجے کا مسافر (امت پرکاشن، جودھپور، راجستھان 1981) ص 113
7- وارث علوی، خندہ ہائے بیجا (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 25، 1987) ص 25
8- وارث علوی، بتخانہ چین (گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر، 2010) ص 9
9- وارث علوی، پیشہ تو سپہ گری کا بھلا (گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی 1990) ص 37

■

Aas Mohammad Siddiqui
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

غالب کی ایک اردو غزل فارسی ادب کے تناظر میں

مہتاب جہاں

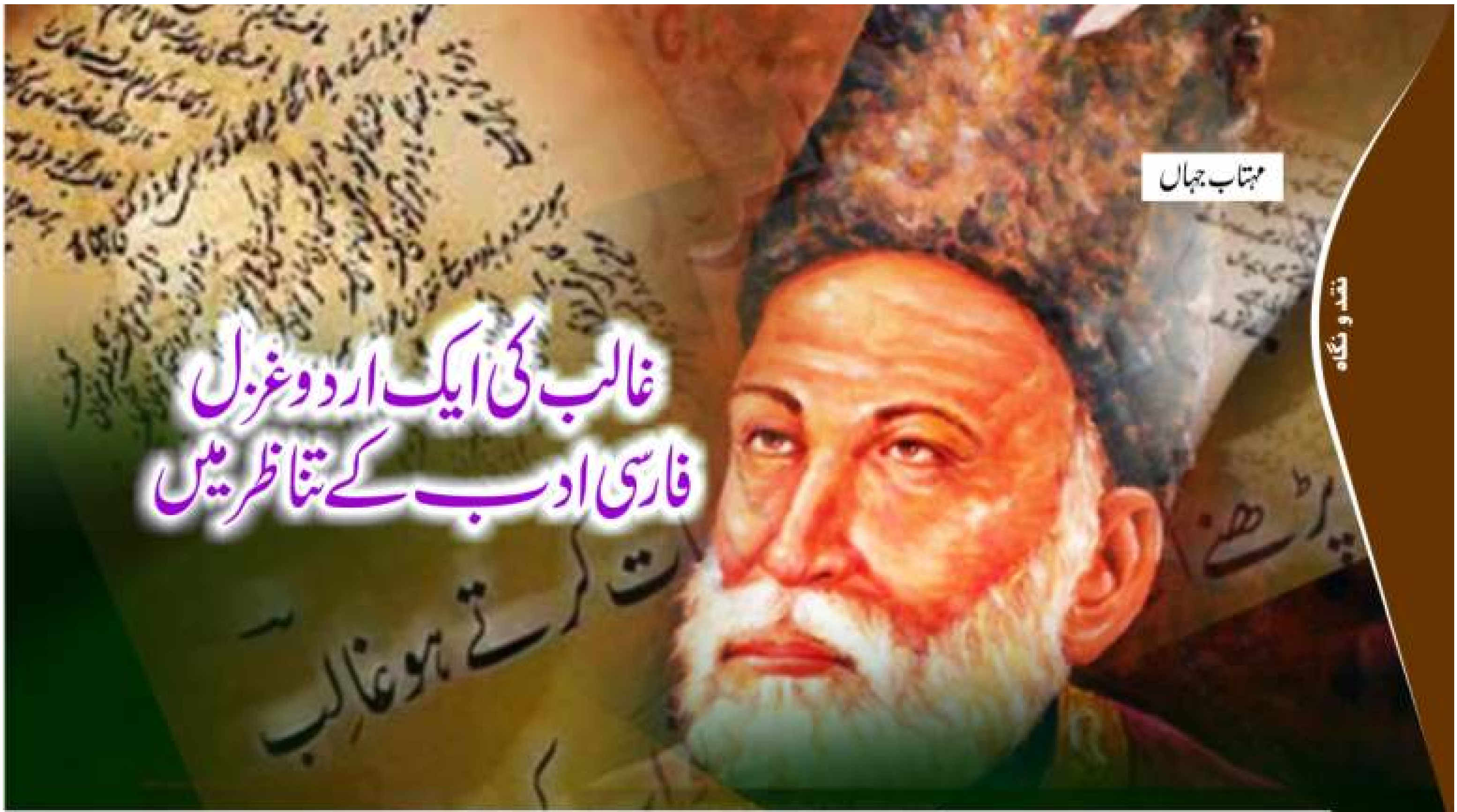

غالب، ہندوستان کا ایک بلند مرتبہ شاعر جو کسی تعارف وتعریف کا محتاج نظر نہیں آتا۔ 'دیوان غالب' کی ہر غزل اپنے معنی و مفہوم کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ پورے دیوان کی ہر غزل اپنے اندر بے شمار تشبیہات و استعارات، لفظوں کی جادوگری غزل کے ہر ہر مصرعے میں جاگزیں ہے۔

غالب کے کلام کی بے شمار شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن لگتا ہے آج بھی کچھ گنجائش باقی رہ گئی ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سربستہ بہت سارے مضمون ومطالب کھلے ہی نہیں جوں کے توں رہ گئے ہیں۔ غالب کے کلام کا یہ امتیاز بڑائی کی دلیل ہے کہ اس میں مضامین نکلتے چلے آتے ہیں۔ شاعری کے ہزار روپ ہیں اور ہر روپ کا اپنا ایک الگ مقام، اپنا جواز اور اپنی دلکشی ہے۔ غزل یا شعر کا اصل مفہوم وہ ہے، جو میرے اور آپ کے دل کو لگے۔ عمل تخلیق بھی ایک مثلث ہے جسے شاعر، کلام اور قاری مل کر پورا کرتے ہیں۔

یہاں غالب کے دیوان کی پہلی غزل کے لفظوں پر کچھ روشنی ڈالی جارہی ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس شعر میں کاغذی پیرہن ایک لفظ آیا ہے۔ اب تک لوگ یہی سمجھتے آئے ہیں کہ کاغذ سے مراد ورق کی وہ جنس ہے جو کپڑے یا گتے کو کوٹ کر بنائی جاتی ہے۔ دراں حالیکہ مرزا غالب کے ذہن میں وہ کاغذ نہیں تھا جس کاغذ کی جنس آج ہم استعمال کرتے ہیں۔ کاغذی پیرہن کی وضاحت اور تاریخی پہلو کچھ اس طرح ہے۔

ساسانی عہد میں ہرن کی کھال کے نیچے کی جھلی کو کھال سے الگ کرلیا جاتا تھا جیسا کہ آج بھی ہمارے یہاں ورق ساز کرتے ہیں۔ درحقیقت مرزا غالب نے اسی جھلی کو کاغذی پیرہن کہا ہے۔ چونکہ اس نوع کی جنس کا کاغذ کمیاب ہوتا ہے، اس لیے اس کو دھو دھو کر بھی استعمال کرلیا جاتا تھا۔ اس وقت ساسانی دور میں یہ قاعدہ تھا کہ مجرم کے لیے کاغذ یعنی وہی جھلی جو ہرن کی کھال سے نکلتی ہے اس کا کرتا بناتے تھے اور اس پر اس کے جرائم لکھے جاتے تھے اور اسی پر اس کی سزائیں متعین کی جاتی تھیں۔ اس شخص یا مجرم کو پورے شہر میں گھمایا جاتا تھا تاکہ لوگ اس کو دیکھیں اور عبرت حاصل کریں اور اس جرم کے مرتکب نہ ہوں۔ گویا کہ اس وقت اس کی (مجرم) قسمت کا فیصلہ حکام بالا کیا کرتے تھے۔ یہاں مرزا غالب بھی شاید یہی کہنا چاہ رہے ہیں کہ نقش اپنے آپ کو مجبور محض تصور کرتا ہے اور دوسرے اس پر جرائم عائد کررہے ہیں۔

اس دور کی مزید تائید اس طرح ہے جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے۔ آنحضرت کی رحلت کے بعد جو قرآن شریف کی خطاطی کی گئی وہ چمڑے پر ملتے تھے اور ضمنی بات ہے کہ ہم سب قرآن پڑھتے ہیں ہم نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی کہ صفحہ اول کیوں منقش ہوتا ہے چمڑے میں نمی دوڑنے سے بدبو پیدا ہوجاتی ہے اس نقص کو دور کرنے کے لیے لوگ ان کے درمیان پھول رکھ دیا کرتے تھے تاکہ پھولوں کی خوشبو کاغذ میں سرایت کرجائے مگر یہاں مشکل یہ تھی کہ پھولوں کی نمی چمڑا جذب کرلیتا تھا اور اس کے اندر کیڑا لگ جاتا تھا اور کاغذ کو کیڑے سے محفوظ رکھنے کے لیے زعفران مَل دی جاتی تھی چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن شریف خواہ وہ مطبوعہ ہی ہوں مگر جن سطروں پر آیات قرآنی درج ہوتی ہیں انھیں زرد کردیا جاتا ہے۔ یہ روایات اسی زمانے سے چلی آرہی ہیں۔ جبکہ عربوں کا اپنا کوئی خط نہیں تھا اس وقت ساسانی عہد کے بادشاہ باقاعدہ حساب کتاب رکھتے تھے۔ ساسانی خاندان کے چوتھے بادشاہ خسرو پرویز کے دربار کے زمانے سے مرتب دیوان خوب قلمبند کیے جاتے تھے۔

غالب کے اس شعر میں تلمیح ہے غالب اس تاریخی واقعہ کی طرف ہمیں متوجہ کرانا چاہتے ہیں۔ اور اپنے اس شعر میں کس خوبصورت اور دلنواز انداز میں کاغذی پیرہن کا ذکر کرتے ہیں۔

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

اس شعر کا عام مفہوم اس طرح نکالتے ہیں کہ محبوب کے بغیر تنہائی کے لمحے گزارنا بے حد دشوار ہے اور ایک ایک لمحہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ کاو سے مراد یہاں رنج پہنچانا، کوشش کرنا، تلاش کرنا یا مصدر 'کاویدن' جس کا مطلب ومعنی کھودنا ہے۔

مگر یہاں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں مرزا غالب شراب سے بہت رغبت رکھتے تھے اس شعر میں انھوں نے

اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے اور کاو سے مراد ہے وہ آواز یا وہ جھلاہٹ جو ایک مے کش کو شراب نہ ملنے کی صورت میں نکلتی ہے شراب نہ ملنے کی وجہ سے اس پر جو ایک خمار کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور اس خمار کی حالت میں جو کچھ بھی وہ بکتا ہے، بڑبڑاتا ہے اس 'کاوکاو' کو ہی غالب نے اس جھلاہٹ اور اس آواز سے وابستہ کیا ہے کہ اس مے کش کی تنہائی کا عالم مت پوچھ کہ اس کے لیے وقت کاٹنا کتنا دشوار ہو گیا ہے یہاں صرف لفظوں پر توجہ کی گئی ہے جو ایک ادنی کوشش تھی۔

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

اس شعر کو لفظی حیثیت سے دیکھنا یا سمجھنا چاہیں تو شعر کے پہلے تین لفظ جذبہ، بے اختیار، اور شوق یہ تینوں لفظ کسی انسان یا جاندار کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مگر ان لفظوں کی معنوی حیثیت کو غالب نے یہاں ایک بے جان شے سے وابستہ کیا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے وہ ایک جاندار چیز ہے اسی طرح شعر کے دوسرے مصرعہ میں غالب نے لفظ سینہ اور دم کو بھی ایک بے جان چیز سے وابستہ کیا ہے۔ جبکہ سینہ اور دم دونوں لفظ ہی جاندار کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن غالب نے تلوار کے لیے یہ تمام الفاظ استعمال کیے جبکہ تلوار کا نہ تو سینہ ہوتا ہے اور نہ ہی دم۔ پھر غالب نے کیوں تلوار کے لیے یہ لفظ استعمال کیے۔ مرزا غالب تلوار کی بناوٹ کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتے ہوئے اس کے خم کو سینہ اور اس کی دھار کو دم کہا ہے۔

جس طرح کسی انسان کی مختلف کیفیات میں مثلاً غصے کی حالت میں، بے حد خوشی کے باعث یا بہت رنج و الم کی شدت سے اس کا سینہ پھول جاتا ہے اسی طرح غالب نے تلوار کی بناوٹ کو دیکھ کر یہ احساس کیا کہ جیسے شمشیر شوق بے اختیاری کے جذبے سے سرشار ہے اور اپنے جوہر دکھانے کے لیے اپنے خول سے باہر آنے کے لیے بے تاب ہے اور اس کوشش میں اس کا دم پھول گیا ہے۔

اس لیے غالب نے تلوار کے خم کو اس کا سینہ اور دھار کو دم سے تشبیہ دی ہے کیونکہ جب بھی ہم تلوار کا نام سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں صرف اور صرف قتل و غارت اور خون خرابے کا ہی منظر ابھر آتا ہے غالب نے بھی اسی تصور کو پیش نظر رکھا ہے۔

کئی شاعروں نے خواہ وہ ہندوستان کے ہوں خواہ وہ ایران کے سب نے ہی تلوار کی شان میں قطعے اشعار و رباعیات کہی ہیں۔ جیسے بہادر شاہ ظفر نے تلوار کی تشبیہ اپنے شعر میں کس خوبی سے پیش کی ہے۔

شمشیر برہنہ مانگ، غضب بالوں کی چمک پھر ویسی ہے
جوڑے کی بناوٹ قہر و غضب، باتوں کی مہک پھر ویسی ہے

آگہی، دام شنیدن جس قدر چاہے، بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

اس شعر کے پہلے حصے میں کئی فارسی الفاظ آئے ہیں، جیسے آگہی، دام شنیدن، آگہی سے مراد ہے واقفیت، خبرداری، ہوشیاری اور دام کے معنی ہیں جال، قید، قفس، پھندا۔

اس طرح شنیدن ایک فارسی مصدر ہے جس کا مطلب ہے سننا دوسرے مصرعے میں ایک لفظ آیا عنقا جس کا ہم اپنے مطابق مطلب نکالتے ہیں جیسے سخت مشکل نایاب، کم یاب وغیرہ۔ یہ الفاظ گاہے بہ گاہے ہماری نظروں سے گزرتے ہی رہتے ہیں۔

اس شعر میں صرف لفظ عنقا کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ یہ ایک عربی لفظ ہے۔ اور لفظ عُنُق سے اخذ کیا گیا ہے۔ عنق سے مراد ہے گردن اور عنقا سے مراد ہے ایک اونچی گردن والا پرندہ۔

اس نایاب اور ناپید پرندہ سے ایک داستان وابستہ ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ کسی حد تک حقیقت پر مبنی بھی ہو۔ کیونکہ زندگی کے حقائق سے ہی افسانے اور داستانیں وجود میں آتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ یہ اونچی گردن والا پرندہ دو بچوں کو اٹھا کر لے گیا تھا اور بہت تلاش و جستجو کرنے پر بھی وہ نہیں مل سکا۔ لوگوں نے بہت جال بچھائے اس کا بہت انتظار کیا مگر وہ ناپید ہو گیا۔ شاید تبھی سے اس کا نام عنقا پڑ گیا۔

مگر دوسرے معنی میں اس شعر کا مطلب بالکل الگ و مختلف ہے جیسے غالب کہتے ہیں کہ کوئی ہماری بات کو سننے کے لیے لاکھ ہمہ تن گوش ہو جائے مگر ہمارا مدعا اتنا دشوار 'سخت' مشکل ہے کہ ہم بیان کرنے سے قاصر ہیں یا جیسے ہی ہم نے اپنا مدعا بیان کرنا چاہا تو ہماری قوت گویائی جاتی رہی۔ اس غزل کا آخری شعر بھی پہلے شعروں کی مانند کچھ فارسی لفظوں سے پُر ہے ان لفظوں کی وضاحت ضروری ہے۔ شعر ہے:

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

شعر کے پہلے مصرعے میں تین فارسی لفظ آئے ہیں جیسے بسکہ اسیری اور آتش زیرپا، لغوی معنی بسکہ کے ہیں اس قدر، بے انتہا، اس طرح اسیری کے لفظی معنی جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں قید کے ہیں۔ قیدی ایک ایسا شخص یا مجرم جو قید کر کے جیل میں ڈال دیا گیا ہو یا جس کے ہاتھوں پیروں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوں مگر یہ بھی کسی حد تک درست ہے اسیر سے ہم یہی تصور کرتے ہیں مگر یہاں اسیر سے مراد وہ شخص یا مجرم ہے جس کے ہاتھ پاؤں اس قدر ہتھکڑیوں سے کس کر بندھے ہوں کہ وہ حرکت بھی نہ کر سکے۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ وہ ایک انگلی کو بھی جنبش نہ دے سکے۔

آتش زیرپا سے مراد ہے بیقراری، اضطرابی، بے چینی، پیروں کے نیچے آگ ہونا۔

اگر تصور کریں تو کتنا ہولناک منظر ہوگا کہ ایک شخص جس کے ہاتھ پاؤں کو کس کر زنجیر سے جکڑ دیا گیا اور اس قدر کہ وہ جنبش بھی نہیں کر سکتا اور اس پر ایک اور آفت کہ اس کے پیروں کے نیچے آگ ہو تو بھلا کس طرح ایک شخص خود کو قابو رکھ سکتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں بھی پہلے مصرعے کی طرح کچھ فارسی الفاظ آئے ہیں۔ جیسے مو سے مراد بال، آتش دیدہ سے مراد، آگ دکھایا ہوا۔

اس شعر میں بہت باریکی سے ان تمام لفظوں کو استعمال کیا گیا ہے، اس مصرعے کا سارا کا سارا زور زنجیر کے حلقے میں آگیا ہے غالب کہتے ہیں کہ میری زنجیر کے حلقے میں میرے پیر اس طرح جکڑے ہوئے ہیں، جس طرح بالوں کو آگ پر رکھ دیا جائے تو وہ سکڑ کر وہیں جم جاتے ہیں۔ لہٰذا میری ہتھکڑیوں نے بھی میرے پیروں کو ان جلے ہوئے بالوں کی مانند جکڑ رکھا ہے۔ خاقانی کے قصیدے کا ایک شعر بھی اس نوعیت کا ہے۔

ان تمام لفظوں کو غالب نے اپنے اشعار میں بہت خوبصورت انداز میں اور برمحل استعمال کیا ہے۔ غالب کی باریک بینی اور تیز نگاہی کا ہم کشادہ دلی سے اعتراف کرتے ہیں۔ غالب ہی کا یہ کارنامہ ہے کہ جنھوں نے بڑی چابکدستی سے ان تمام لفظوں کو ان کی معنوی حیثیت کے ساتھ قبول کیا ہے۔

ماخذ:

1۔ غالب: غلام رسول مہر: عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور طبع چہارم 1946
2۔ شہنشاہ سخن: سید عارف شاہ گیلانی: مطبع مشہور آفسیٹ پریس کراچی، ناشر مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی 1970
3۔ دیوان غالب: غالب
4۔ بہادر شاہ ظفر: ڈاکٹر اسلم پرویز، انجمن ترقی اردو ہندی۔ دہلی 1984
5۔ کلیات ظفر: چہارم سنگ میل۔ پبلی کیشنز، لاہور 1997

Dr. Mahtab Jahan
Dept. of Persian
Delhi University,
Delhi - 110007

ڈاکٹر مرتضیٰ اظہر رضوی

مرثیہ گوئی کی فلسفیانہ روایت اور عرض معنی

فرحت نادر رضوی

ڈاکٹر مرتضیٰ اظہر رضوی کے مراثی کا مجموعہ 'نوائے سکوت' کے نام سے جولائی 1996 کو اردو مرکز سے شائع ہوا جس کی ترتیب جابر حسین صاحب نے کی، اس مجموعے میں ان کے کل سات مرثیے شامل ہیں جن کو جناب مرتضیٰ رضوی بہ زبان خود مسدس کہا کرتے تھے یہ مرثیے اپنے اندر ایک جہان معنی رکھتے ہیں۔ وہ کربلا اور اس سے وابستہ شخصیات کے استعاراتی اور علاماتی پہلو پر زیادہ توجہ صرف کرتے نظر آتے ہیں۔ نیز سامعین کی بدلی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر انھوں نے مراثی میں ممکنہ اختصار سے کام لیا ہے، اور غیر ضروری تفصیلات پیش کرنے سے گریز کرتے ہوئے محض وہی باتیں پیش کی ہیں جو ان کے مرثیوں کے حوالے سے مخصوص تاثر ابھارنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ڈاکٹر مرتضیٰ اظہر رضوی نے اپنے مرثیوں میں واقعہ نگاری کی جگہ فکر و فلسفہ کی پیش کش اور تربیت فکر و نظر پر زیادہ توجہ صرف کی ہے تو درست ہوگا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے روایتی مرثیہ گوئی سے ایک حد تک انحراف کیا ہے اور مرثیے کے بعض عناصر کو حذف کرتے ہوئے مرثیے کہے ہیں۔ اپنے مراثی میں رزمیہ کے روایتی انداز پر خصوصی توجہ صرف کی ہے چنانچہ جہاں انھوں نے جنگ کے مناظر گھوڑوں کی جست و خیز تلواروں کی تیزی، نیزوں کی چمک، جنگی باجوں کی گھن گرج وغیرہ کا بیان کیا ہے وہاں میر انیس کے مرثیوں کی یاد آجاتی ہے مگر یہاں بھی ان کی ایک انفرادی شان بہر حال نظر آتی ہے۔ اس طرح جناب مرتضیٰ اظہر رضوی صاحب نے روایت سے وابستہ رہتے ہوئے قدیم و جدید کی آمیزش سے ایک خوبصورت روایت کی بنا ڈالی ہے۔

تفلسف و تفکر مرتضیٰ رضوی صاحب کی فطرت کا سب سے غالب عنصر ہے جو ان کی شاعری کی مجموعی فضا مرتب کرتا ہے، پھر خواہ غزلیں ہوں نظمیں ہوں مثنوی ہو یا مرثیہ، ہر جگہ ان کا یہ میلان واضح ہے بالخصوص صنف مرثیہ کی ہیئتی وسعت نے ان کے افکار و نظریات کے اظہار کے لیے خاطر خواہ وسعت بہم پہنچائی جس کا انھوں نے مکمل فائدہ بھی حاصل کیا، اور انھوں نے واقعاتی تفصیلات کی جگہ نظریاتی تبلیغ پر زیادہ توجہ صرف کر دی۔

شاعر تخلیق کی اس منزل میں اپنی فکر کی حدت اور سیالیت سے حراساں محسوس ہوتا ہے کہ کس طرح اپنے درکی تجربات کی اس آتش سیال کو لفظی پیکر میں ڈھالے کہ ترسیل کا حق ادا ہو سکے اور قبائے الفاظ بھی خاکستری سے محفوظ رہ جائے۔ اس ضمن میں شاعر کی ذات جس تخلیقی اذیت اور کرب سے دوچار ہے اس کا اظہار مرثیے کے پہلے بند میں ہی ہو جاتا ہے۔

عرض معنی میں قلم سر بہ گریباں ہے آج　　گیسوئے نطق فسوں ساز پریشاں ہے آج
ذہن شاعر میں خیالات کا طوفاں ہے آج　　یعنی اک گونج سی نزدیک رگ جاں ہے آج
دل میں اک آگ کا سیلاب امنڈ آیا ہے　　افق فکر پہ اک مطلع نو چھایا ہے

وسائل ترسیل کی کم مائیگی شاعر کو اذیت میں مبتلا رکھتی ہے، آج اس کے کلام میں حسن معانی کا ظہور ہوتا ہے اور الفاظ اس کا ساتھ نہیں دیتے، لہجے کی لَے ملتا ہیں جب جب لفظوں کے خیموں پر شدت کرتی ہیں ان کا وجود تار تار ہونے لگتا ہے، قبائے الفاظ شعلگی فکر سے خاکستری ہوئی جا رہی ہے.... یہ وہ منزل ہے کہ پَرِ جبریل جہاں جلتے ہیں:

ہے وہ منزل پہ جبریل جہاں جلتے ہیں　　جس کے اظہار میں الفاظ و بیاں جلتے ہیں

شاعر اس منزل پر ایک ایک عنوان کی ٹھہر ٹھہر کر اور سنبھل سنبھل کر تشریح کرتا چلتا ہے کہ آگے انھیں استعاروں اور علامتوں کی بنیاد پر قصۂ جاں رقم ہونا ہے، رموز زندگی کھلنے ہیں اور گیسوئے نطق فسوں ساز کو سنورنا ہے چنانچہ یہ ضروری ہوا کہ پہلے ان بنیادوں کو استوار کر لیا جائے اور دسترس فہم و ادراک میں لے لیا جائے۔

ذات:　　ذات اک شعلۂ رقصاں کے سوا کچھ بھی نہیں
علم:　　علم اک شمع فروزاں کے سوا کچھ بھی نہیں
آدمی:　　آدمی اک شرر جاں کے سوا کچھ بھی نہیں
مادہ:　　مادہ دود پریشاں کے سوا کچھ بھی نہیں

اور پھر علت سبب و مسبب کہ:

عام حالت میں اک انگارہ جہاں ہوتا ہے　　آگ ہوتی ہے وہاں اور دھواں ہوتا ہے

شاعر کے تصورات کے دائرے پھیل رہے ہیں اور اب اس کا تفکر تصوف کی سرحدوں سے ہم آغوش ہو رہا ہے، وہی حسن ازل جس کی طلب اور تلاش نے کاروان حیات کو کہیں تھمنے نہیں دیا، تھک کر بیٹھنے نہیں دیا یہ اسی کا عکس جمیل ہے جو شاعر کے کلام میں بہ رنگ حسن صد رنگ جلوہ افروز ہے۔

ہے وہی شعلۂ اول سبب اخگر و دود　　اس سے ہے سلسلۂ کشمکش بود و نبود
وہی شعلہ ہے کہ ہے شاہد و مشہود و شہود　　اپنی وحدت میں عدم اپنی ہی کثرت میں وجود
دہر ہے جلوہ یکتائی بقول غالب　　مظہر ناز خود آرائی بقول غالب

شاعر اس حسن ازلی کو چشم تصور سے اس عالم کرب و تنہائی میں دیکھتا ہے۔ جہاں صرف وہی وہ ہے، وہ آئینہ، جو آئینہ خانے میں حیراں اپنے عکس کا متلاشی ہے مگر وہ وجود لطیف اس لطف کو کسب کرنے سے قاصر نظر آتا ہے کہ 'لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی' وہ آئینہ جو اپنی وحدت و یکتائی سے حیران تھا.... وہ حسن جو تشہیر ہونا چاہتا تھا، وہ ایک ایسا شعلہ عشق کہ جو متلاشی تھا... فانوس صفت دل کا، اور ان سب پر مستزاد اس کا وہ تقاضائے خلاقیت، وہ لذت تخلیق جو اس خلاق ازل سے مسلسل تقاضا کر رہا تھا.... پھر وہ اس تقاضے کو کیونکر نظر انداز کر سکتا تھا.... کب تک اس سے پہلو تہی کر سکتا تھا، یہ وہ تڑپ تھی جس کو کسی نہ کسی صورت مجسم ہونا ہی تھا

ذوق اظہار بڑھا ذرے میں صحرا سمٹا　　پئے تسکین طلب قطرے میں دریا سمٹا
اک فسوں ہو گیا پھیلا ہوا قصہ سمٹا　　لذت وصل کی آغوش میں شعلہ سمٹا
عشق کی گود میں تشہیر نے انگڑائی لی　　حسن لذت کش رسوائی نے رسوائی لی

اس تمام عالم آرائی کے پس پردہ جذبہ لذت طلبی کی نشاندہی کرتے ہوئے شاعر کی طبع سیال رواں دواں نہ جانے کون کون سے رموز و علائم سے روبرو ہوتی ہے کہ وہ پکار اٹھتا ہے:

روح بیتاب ہوئی لذت پیکر کے لیے　　وا ہوئی چشم نگر حسرت منظر کے لیے
قافلے شوق کے بیتاب ہیں رہبر کے لیے　　ندیاں کب سے سفر میں ہیں سمندر کے لیے
اندھی تقلید ہے منزل کا اگر ذوق نہیں　　شوق منزل سے ہے منزل جو نہیں شوق نہیں

شاعر کا قلم یہاں تھکتا نہیں تھمتا نہیں بلکہ اس کی جولانی قدم بہ قدم بڑھتی جاتی ہے

اس کا جنون اسے خیرہ سری کی اس منزل میں پہنچا دیتا ہے جہاں تفلسف کا عمیق بحر بیکراں اسے فہمائش شناوری دیتا ہے، جہاں عشق اسے خبر آبلہ پائی اور مژدہ گریباں چاکی سناتا ہے اور جہاں تصوف کا نرم رو دریا اسے شفقت سے پکارتا ہے کہ 'آ' کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم اس منزل پر واضح طور پر شاعر کی فکر مادیت کی اسیری اور جوہر و ذرات کی گردش کے درمیان سے بڑی لطافت و نزاکت اور سرعت و رفتار کے ساتھ گزرتی ہوئی عشق کے درِ کہنہ پر دستک دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، کہ یہی تو وہ باب ہے کہ ایک بار جب کسی پر کھل جاتا ہے پھر اس کی دنیا ہی بدل دیتا ہے، موجودات کائنات اور محرکات زندگی کے حوالے سے اس کے ردِ عمل بالکل بدل جاتے ہیں، انسان اس دنیا میں رہ کر بھی وہاں نہیں ہوتا جہاں وہ ماقبل تھا پھر وہ جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اس کو پورے اعتماد اور شعوری کاوش کے ساتھ اپنے زمانے اور آئندہ نسلوں کو منتقل کرتا ہے کیونکہ

فکر کی آنکھ سے دیکھا ہے تو آیا ہے یقیں   کہ بجز مایہ تخلیق کہیں کچھ بھی نہیں
کیوں نہ اس مایہ تخلیق کو شعلہ کہیے   کیا ضروری ہے کہ پھر طور کا قصہ کہیے

اب شاعر اس سطح سے جذبۂ لذت کی تفہیم کرتا ہے اور زندگی اور کائنات کے تمام مظاہروں میں اسے اسی ایک جذبے کی کارفرمائی محسوس ہوتی ہے۔

آگ کی آنچ پہ لوہے کا پگھلنا لذت   خام فولاد کا سانچے میں ہے ڈھلنا لذت
خوں کے ذرات کا نبضوں میں مچلنا لذت   شمع کی لو پہ ہے پروانے کا جلنا لذت
آتشیں نخل محبت کا ثمر دیکھا ہے   ہم نے لذت کو بہ انداز دگر دیکھا ہے

ان تجربات کی تکسیب شاعر کے لیے جس قدر ہلاکت خیز ثابت ہوتی ہے ان کی ترسیل کا مرحلہ اس سے کچھ کم اذیت ناک نہیں، کہ اس کے تجربے درک و احساس کی سرحدوں پر ایسے وسائل ترسیل کے متقاضی نظر آتے ہیں جن کا ابھی تک عرفان نہیں حاصل کیا جا سکا، جو تجربہ کی دسترس سے آج تک باہر ہیں، یہ سامع سے ادراک و حسیات کی ایسی جہتوں کے متقاضی ہیں جو ماقبل کسی تجربے کی تکسیب کے لیے استعمال ہی نہیں کی گئیں۔ شاعر کے تجربات کی شعلگی اس کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے، وہ الفاظ کے انتخاب و ترتیب میں بے حد محتاط ہے اور بے حد اہتمام اور التزام کے ساتھ خیالات کے ان آتشیں پیکر کو لفظوں کے پیراہن بخشتا ہے:

آج منبر سے جو لذت کا بیاں کرتا ہوں   اک ابھکتی ہوئی حالت کا بیاں کرتا ہوں
آتشیں کشت محبت کا بیاں کرتا ہوں   ہم نفس شوق شہادت کا بیاں کرتا ہوں
کون چکھ سکتا ہے زخموں کی حلاوت اے دل   سوز ہی سوز ہے وہ نور کی منزل اے دل

شاعر نے اس مرثیے کے تیئیسویں اور چوبیسویں بند میں امام حسین کے صاحبزادے علی اکبر کی صحرائے کربلا میں آمد کے نقشے پیش کیے ہیں:

رن میں جب نکہت گیسوئے معنبر پھیلی   فوج کیں میں خبر آمد اکبر پھیلی
دھوپ چھپکی ہوئی تنویر پیمبر پھیلی   دشت میں چار طرف نور کی چادر پھیلی
ریگ کے ذروں پہ تاروں کا گماں ہوتا تھا   سورج اپنی ہی شعاعوں میں نہاں ہوتا تھا

مرثیے کے پچیسویں سے اٹھائیسویں بند کے درمیان شاعر نے جس اہتمام و انتظام کے ساتھ امام حسین کے صاحبزادے علی اکبر کی آمد کا نقشہ پیش کیا ہے اس کے حوالے سے ہمیں میر انیس کی یاد آ جاتی ہے۔

پھول چھپکے ہیں بیان رخ خوش خو کے لیے   ہے کماں ہیچ مثال خم ابرو کے لیے
مام فولاد کی تشبیہ ہے بازو کے لیے   لفظ ملتے ہی نہیں اکبر مہرو کے لیے
رن میں اکبر نہیں اک معجزہ اللہ کا ہے   حسن احمد کا ہے تیور اسد اللہ کا ہے

مرثیے کے تیسویں بند کے پہلے مصرعے 'ناگہاں طبل بجا جنگ کا گونجا جنگل' سے شاعر نے مرثیے میں روایتی انداز سے جنگ کے آغاز کا اعلان کیا ہے۔ مرثیے کے تیسویں بند سے شروع ہونے والی جنگ چونتیسویں بند تک پہنچتے پہنچتے اپنی سرعت و رفتار کے نقطۂ عروج تک پہنچ جاتی ہے:

ایسی گھمسان کی میداں میں ہوئی رد و بدل   پڑ گئی شام کے لشکر میں غضب کی ہلچل
قلب ٹوٹا تو سواروں میں در آئے پیدل   صف اول ہوئی آخر صف آخر اول
جنگ اس طرح کی خالق کے ولی لڑتے ہیں   شور تھا فوج میں بھاگو کہ علی لڑتے ہیں
رن میں ٹکراتی تھیں شمشیریں شرر اڑتے تھے   چلے کٹ جاتے تھے سوفاروں کے پر اڑتے تھے
صورت برگ ستمگاروں کے سر اڑتے تھے   طائر جان عدو تول کے پر اڑتے تھے
برق کی طرح سے جب تیغ دو سر گرتی تھی   فرق سے خود تو ہاتھوں سے سپر گرتی تھی

میدان جنگ کا یہ مجموعی منظر ہمیں جنگ کی رفتار، سرعت، تصادم و پیکار کا شدید ترین تجربہ کراتا ہے اور اس خون آشام مقتل میں پہنچا دیتا ہے جہاں پہنچ کر سامع ناظر بن جاتا ہے اور خود کو فوجوں میں گھرا ہوا ہم شکل رسول کے آس پاس ہی کہیں محسوس کرتا ہے۔

صورت صاعقہ گرتی تھی کماں داروں پر   آگ اگل دیتی تھی جب پڑتی تھی تلواروں پر
لال ہوتی تھی جو پڑتی تھی سیہ کاروں پر   سرفراز آتی تھی جب جاتی تھی سرداروں پر
سر تک آئی تو پھر تا بہ کمر جاتی تھی   زین کو کاٹ کے کھیتی میں اتر جاتی تھی

جنگ کے مناظر کے بعد تینتالیسویں بند میں شاعر نے شہادت کا منظر پیش کیا ہے جس کا انداز روایتی ہی ہے مگر بین کے مرحلے میں وہ روایت سے ایک حد تک انحراف بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ آہ و بکا سے زیادہ ضبط و صبر اور تحمل و شکرانے کے جذبات بیدار کرنے کی کاوش میں مصروف نظر آتے ہیں اور اس رویہ کی نشاندہی کرتے ہیں جس کی امید حسین جیسے صابر سے ان عظیم قربانیوں کو دیتے ہوئے کی جا سکتی ہے جن کی تیاری کا آغاز خواب براہیم سے ہوا اور جس ذبح عظیم کا مژدہ کبھی نانا، کبھی بابا، کبھی اماں اور کبھی جبریل سے سنتے رہے اور ایسی آمادگی کے ساتھ راضی بہ رضا رہے جہاں دور دور تک کسی قسم کے اضطراب کی کوئی گنجائش نہیں تھی، حسین کربلا نہیں بلکہ مقام منا میں کعبہ عشق و وفا تعمیر کر رہے تھے وہ ریگزار حیات پر وہ تاریخ رقم کر رہے تھے جو قافلۂ حیات کو حق و باطل کی پیکار کے درمیان ہمیشہ جلا بخشتی رہے گی۔ حسین کو وہ مظلوم تو ظاہر کرتے ہیں مگر بے بس قطعی نہیں، یہ وہ مظلومیت ہے جس کا دبدبہ تا قیام قیامت ظلم کے سینے پر رہے گا لہٰذا شاعر نے شہادت کے بعد بین کے مرحلے میں مزاج کی کاٹ اور حسینی رویے کی دھارداری کو زیادہ نکھارنے کی کوشش کی ہے:

دیکھیے زخم جگر کا شہ ذی جاہ جھکے   خاک پر بیٹھ کے پہلو میں حق آگاہ جھکے
غم سے رخصت ہوئی بینائی تو ناگاہ جھکے   سجدہ شکر میں شہ کھینچ کے اک آہ جھکے
غم کا اک سیل رواں بنکے جہاں سے گزرا   شہ کا وہ سجدہ دل کون و مکاں سے گزرا

مندرجہ بالا بند میں شدت غم بھی ہے اور عزم ضبط غم بھی، جو اگر ایک طرف سامعین کے دل کو برماتی ہے تو دوسری طرف ضبط غم کا حوصلہ بھی دیتی ہے اور باطل کے خلاف سینہ سپر ہونے اور حق کی حمایت میں قربانیوں کی آخری حد تک جانے کی ہمت بھی عطا کرتی ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر مرتضیٰ اظہر رضوی کے مرثیے، مرثیوں کی قدیم و جدید روایت کے درمیان اس کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں جو گذشتہ سے پیوستہ رہ کر مرثیے کے تابناک مستقبل کے لیے بہت مضبوط بنیادیں فراہم کرتے ہیں اور اپنے فکری اور فلسفیانہ میلانات کے مدنظر صنف مرثیہ کو تفکر و تفلسف کی بنیادوں پر استوار کرتے ہیں۔

■

Dr. Farhat Rizvi
E-246/1, Upper Ground Floor
Alama Shibli Road Namani Road
Abul Fazal Enclave, Part II, Shahen Bagh
New Delhi - 110025

تجمل بلہ پوری

آگرہ بازار

حبیب تنویر کا شاہکار ڈراما

جدید اردو تھیٹر کی دنیا میں حبیب تنویر کا نام سنہرے الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ ان کا شمار بلند پایہ تخلیق کاروں میں ہوتا ہے۔ موصوف نے اپنے فن کے ابتدائی سفر ہی میں ناظرین کو اپنی صلاحیتوں سے روشناس کرایا۔ انھوں نے نہ صرف چند شاہکار ڈرامے لکھے ہیں بلکہ بڑی صناعی اور فنکاری کا مظاہرہ اسٹیج پر پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کچھ ڈراموں کی تخلیق بھی کی جسے بعد میں اپنی ہدایت کاری میں پیش بھی کیا۔

تھیٹر سے حبیب تنویر کا باضابطہ تعلق 'اپٹا' تنظیم کے ذریعے ہوا۔ وہ اپٹا تحریک سے ابتدا سے ہی وابستہ رہے ہیں۔ اپٹا تحریک سے ان کا رشتہ اس قدر استوار رہا ہے کہ آج بھی ان کے ڈراموں پر ان کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ 'ہندوستانی تھیٹر' سے قطع تعلق کے بعد حبیب تنویر نے 'نیا تھیٹر' گروپ کی بنیاد 1959 میں رکھی۔ اس گروپ کی تشکیل چھتیس گڑھ کے عوامی لوک آرٹسٹوں کو لے کر کی گئی تھی۔ جس کے پس پشت یہ منشا تھی کہ لوک کلا کاروں اور فن کاروں میں پوشیدہ فن کاری کو منظر عام پر لایا جائے اور اس کے ذریعے سماج و معاشرے پر مبنی نظام اور ظلم واستبداد کو پیش کیا جائے۔ حبیب تنویر نے ہندوستانی ڈرامے کو نئی روایت اور نئے اسلوب سے روشناس کرانے

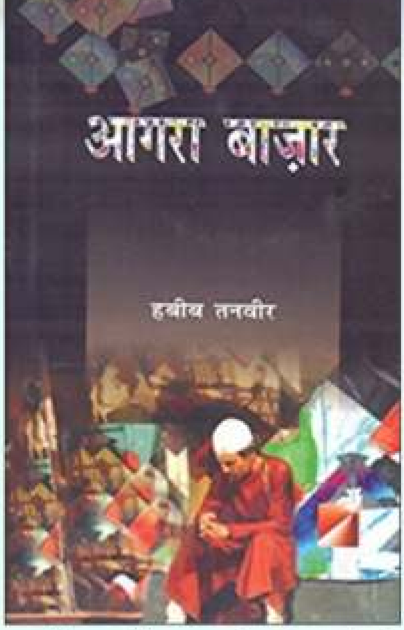

کے لیے بیرون ملک کے ادارے اور تنظیموں سے تھیٹر اور اسٹیج کے رموز ونکات حاصل کیے۔ انھوں نے لندن کے Royal Academy of Dramatic سے ڈگری حاصل کی۔ جرمنی اور روس کا دورہ کیا۔ اسی سفر کے دوران انھوں نے بریخت کے ایپک تھیٹر سے استفادہ کیا اور اسے ہندوستانی فضا میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ گویا حبیب تنویر نے ہندوستانی تھیٹر کو نئی روایات اور نئے اسلوب سے روشناس کرایا اور ہندوستانی ڈرامے کو دوسرے ڈراموں کے ہم پلہ کرنے کی کوشش کی۔

'آگرہ بازار' حبیب تنویر کا ایک ایسا شاہکار ڈراما ہے جسے جدید ہندوستانی تھیٹر میں سنگ میل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کا زمانہ تصنیف 1954 ہے۔ پہلی مرتبہ اس ڈرامے کو ایکانکی ناٹک کی حیثیت سے یوم نظیر کے موقع پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں اسٹیج کیا گیا۔ ڈرامے میں کام کرنے والوں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ، طلبہ و بچوں کے علاوہ کچھ دلی کے لوگ اور دلی کے آس پاس کی دیہاتی عورتیں اور مرد بھی شامل تھے۔ تغلق آباد، بدر پور اور اوکھلا کی منڈلی بھی شریک تھی۔ آگرہ بازار عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی کی زندگی اور ان کے شہر پر مبنی ڈراما ہے، جس میں نظیر اکبرآبادی اور آگرہ کی تہذیبی و سماجی اور معاشی زندگی کو خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ حبیب تنویر کے یہاں تاریخی اور سماجی شعور زیادہ ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس عوامی شاعر کی دلچسپ زندگی کے نشیب و فراز میں معنویت تلاش کرکے اسے ڈرامائی روپ دے دیا۔ عطیہ نشاط 'آگرہ بازار' کے حوالے سے حبیب تنویر کے مقصد کو ظاہر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

''ڈرامہ پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حبیب تنویر کے سامنے دو مقصد ایک ساتھ چل رہے ہیں۔ پہلا نظیر کو آگرے کے عوامی شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا اور دوسرا آگرہ کی زبوں حالی اور اقتصادی زوال کو پیش کرنا۔''[1]

''آگرہ بازار میں جو سماجی اور تہذیبی ماحول کی عکاسی کی گئی ہے اس کا زمانہ تقریباً 1810 کے آس پاس کا ہے اور اس کا مقام آگرے کا کناری بازار کا چوراہا ہے۔ زمانے کے انتخاب کے سلسلے میں خود حبیب تنویر کہتے ہیں:

''ڈرامے کا زمانہ لگ بھگ 1810 ہے اگر عام رائے کے مطابق 1735 نظیر کی تاریخ پیدائش مان لی جائے تو اس زمانے میں نظیر کی عمر کوئی 75 برس کی ہوگی ابھی ان کی زندگی کے بیس سال اور باقی تھے 1830 وفات کا سال ہے۔ میں نے ڈرامے کے لیے یہ زمانہ کئی وجوہات کی بنا پر مقرر کیا ہے۔''[2]

اس ڈرامے کی فضا نظیر اکبر آبادی کی زندگی کے واقعات و حالات، اور ان کی نظموں اور اشعار کے سہارے تیار کی گئی ہے۔ جس میں کورس موسیقی، نظم، غزل، شہر آشوب، سلوگن، پلے کارڈ، سائن بورڈ وغیرہ کا خوبصورت استعمال کیا گیا ہے۔ حبیب تنویر نظیر اکبر آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نظیر کی نظموں کو ذرا غور سے دیکھا تو ہمارے معاشرے کی بہت سی تصویریں نگاہوں کے سامنے کھنچ آئیں، جن کی رنگینی انشا کیا اردو کے بڑے سے بڑے شاعر کے کلام کا پھیکا کر دیتی ہے۔ اس کی نظموں کے آہنگ میں رجائیت اور افادیت کی گونج سنائی دی اور میں اس خیال سے پھڑک گیا کہ نظیر کی آواز اردو کے ہر شاعر سے الگ ہے۔ مگر انسانیت کی آواز ہے اور یہ ہمہ گیری کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔''[3]

ڈرامے کی ابتدا 'شہر آشوب' سے ہوتی ہے۔ پہلے ایکٹ میں پردہ اٹھنے سے پہلے دو آدمی فقیروں کے لباس میں کورس 'شہر آشوب' گاتے ہوئے ہال کی پشت سے حاضرین کی صفوں میں سے ہوتے ہوئے پردے کے سامنے سے اسٹیج پر آکر کھڑے ہو جاتے ہیں اور حاضرین سے مخاطب ہو کر نظم سناتے ہیں اور تال پر کڑے بھی بجاتے جاتے ہیں۔

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے اختیار بند
رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر کا ہے موجدار بند
ہو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند
جتنے ہیں آج آگرے میں کارخانہ جات
سب پر پڑی ہیں آن کے روزی کی مشکلات
کس کس کے دکھ کو روئیے اور کس کی کہیے بات
روزی کے اب درخت ہلتا نہیں ہے پات
ایسی ہوا کچھ آکے ہوئی ایک بار بند

اس شہر آشوب میں آگرہ کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ اس شہر کے سارے کارخانے بند ہیں۔ دکانیں کھلتی تو ہیں لیکن گاہک دکھائی نہیں دیتا ہے۔ نظم پڑھتے ہوئے ایک آدمی دائیں طرف سے اور دوسرا بائیں طرف سے اسٹیج کے باہر چلا جاتا ہے اور ساتھ میں پردہ بڑی تیزی کے ساتھ اٹھتا ہے۔ اسٹیج پر بازار کا منظر ہے

جہاں عجیب سی بے رونقی طاری ہے۔ ککڑی والے اور دوسرے پھیری والے آواز لگاتے ہیں۔ بچے للچائی ہوئی نظروں سے خوانچے والوں کو دیکھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ بچے کھیل کود میں لگے ہوئے ہیں اور گاتے بھی جا رہے ہیں۔ ''کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے'' پان کی دوکان کے اوپر کوٹھے پر کوئی دلربا غزل گا رہی ہوتی ہے۔ کتب فروش کی دکان پر دو گاہک کھڑے کتابیں دیکھنے میں مصروف ہیں۔ تھوڑی دیر میں ککڑی والے اور تربوز والے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن راہ گیر بے نیازی سے گزر جاتے ہیں۔ اتنے میں ایک مداری داخل ہوتا ہے اور بندر کا ناچ دکھانے لگتا ہے۔ لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو کر تماشا دیکھنے لگتے ہیں۔ مداری بندر کو نچاتے ہوئے جو مکالمے ادا کرتا ہے وہ نہایت ہی اہم ہیں۔ ان میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کا دلی پر جھپٹنے اور سورج مل کا آگرہ شہر کو لوٹنے کا پتا چلتا ہے۔ اور پھر فرنگیوں کے ہندوستان آنے اور پلاسی کی لڑائی کا ذکر آتا ہے۔ آخر میں بنگال کے قحط کی تصویر کشی کرتا ہے اور مفلسی اور بھوک مری کا رونا روتا ہے۔ اسی درمیان ککڑی والا مجمع کے قریب آکر ککڑی بیچنے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ سے ککڑی والے اور مداری کے بیچ جھگڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے جھگڑے ختم ہوتے ہی دو کردار اسٹیج پر آتے ہیں اور نظیر کی نظم 'پیسہ' سناتے ہیں۔

پیسہ ہی رنگ و روپ ہے پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے
تیغ و سپر اٹھاتے ہیں پیسے کی چاٹ پر
تیر و سنان لگاتے ہیں پیسے کی چاٹ پر
میداں میں زخم کھاتے ہیں پیسے کی چاٹ پر
یاں تک کہ سر کٹاتے ہیں پیسے کی چاٹ پر
پیسہ ہی رنگ و روپ ہے پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرکے کی مال ہے
پیسہ جو ہو تو دیو کی گردن کو باندھ لائے
پیسہ نہ ہو تو مکڑی کے جالے سے خوف کھائے
پیسے سے لالہ بھیا جی اور چودھری کہائے
بن پیسے ساہوکار بھی اک چور سا دکھائے
پیسہ ہی رنگ و روپ ہے پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے
پیسہ جہاں کے بیچ وہ قائم مقام ہے
پیسہ ہی جسم و جان ہے پیسہ ہی کام ہے
پیسے ہی کا نظیر یہ آدمی غلام ہے
پیسہ ہی رنگ و روپ ہے پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

نظم کے ختم ہونے کے بعد ککڑی بیچنے کی نئی ترکیب آتی ہے۔ کورس پھر شروع ہوتا ہے اور نظیر اکبر آبادی کی نظم 'مفلسی' پڑھتا ہے۔

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر
دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر
جس طرح کتے لڑتے ہیں اک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی
جو اہل فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں
مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اسے بے بتاتے ہیں
وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی
جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز نبھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی
یہ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

نظم کے ختم ہونے کے بعد ککڑی والا ایک شاعر سے ککڑی پر شعر لکھنے کی درخواست کرتا ہے۔

حبیب تنویر نے اس خوبی سے فضا سازی کی ہے کہ یہ فضا دیکھنے والوں کو بے حد متاثر کرتی ہے اور ناظرین اس میں محو ہو جاتے ہیں۔

حبیب تنویر نے ایک مخصوص دور کی عکاسی کے لیے ایسے کردار کا انتخاب کیا جو تاریخی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے اس کام کے لیے نہایت موزوں تھا۔ اس کے پلاٹ میں قصہ در قصہ کا سا انداز ہے۔ ہر حصہ اپنی جداگانہ شناخت رکھتا ہے اور ایک اکائی کی شکل لیے ہوئے ہے۔

'آگرہ بازار' میں بریخت کے ایپک تھیٹر کی تکنک کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ خواہ وہ پلاٹ میں قصہ در قصہ کا انداز ہو یا مختلف وسائل کے سہارے ماضی کے واقعات کو پیش کرتا ہے۔ بریخت کے ایپک تھیٹر کے اثرات اس لیے دکھائی دیتے ہیں کہ بریخت نے اپنے ڈرامے کے اصولوں کے لیے مغرب کے علاوہ ہندوستان سے بھی استفادہ کیا تھا اور حبیب تنویر ڈرامے کے ہندوستانی رنگ کے قائل تھے۔ اس لیے ان کے ڈرامے میں ایپک تھیٹر کی تکنیک دکھائی دیتی ہے۔

کیا پیاری پیاری میٹھی اور پتلی پتلیاں ہیں
گنے کی پوریاں ہیں ریشم کی تکلیاں ہیں
فرہاد کی نگاہیں شیریں کی ہسلیاں ہیں
مجنوں کی سرد آہیں لیلا کی انگلیاں ہیں
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خواص کافر، اسکندرے کی ککڑی

حبیب تنویر نے بریخت کے مانند ہی ناظرین کی جذباتی ہم آہنگی پر ضرب لگائی ہے اور کرداروں اور ناظرین کے مابین فاصلہ کم کرنے کے لیے متعدد وسائل کا خوبصورت استعمال کیا ہے جیسا کہ بریخت نے بھی اپنے ڈراموں میں کیا ہے۔ اس سلسلے میں ظہورالدین رقم طراز ہیں:

''التباس حقیقت کو توڑنے کے لیے حبیب تنویر نظیر کی جو نظمیں استعمال کرتے ہیں وہ بیک وقت جذباتی ہم آہنگی کو ختم کر کے غور وخوض کی ترغیب دینے کا کام بھی کرتی ہیں۔ حبیب تنویر وقتاً فوقتاً جہاں ناظرین پر یہ واضح کرتے ہیں کہ یہ بھری زندگی نہیں بلکہ ماضی میں ہوئے واقعات کا بیان ہے وہیں وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ ناظرین اسٹیج پر ہونے والے عمل میں اس قدر کھو جائیں کہ وہ خود ہی کردار سمجھنے لگیں۔ چنانچہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ کورس کے ذریعے نظیر کی وہ نظمیں پیش کرتے ہیں جو ایک طرف جہاں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہیں وہیں دوسری طرف تنقید وتبصرے کا کام کرتے ہوئے ناظرین کو واقعات کے بارے میں سوچنے کی تحریک کا کام بھی انجام دیتی ہیں۔''[4]

جہاں تک اس ڈرامے کے مکالمے کا تعلق ہے تو اس میں تکلف اور تصنع سے گریز کیا گیا ہے۔ موقع ومحل کے مطابق زبان وبیان کا استعمال ہوا ہے۔ بازار کے بیچ عام آدمیوں کے ذریعے بولی جانے والی زبان خالص بول چال کی زبان ہے لیکن اس کی روانی اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ کتابوں کی دکان پر ادیبوں اور شاعروں کی زبان کا انداز نہایت ادب اور قاعدے کی نفاست لیے ہوئے ہے۔ پتنگ کی دکان یا بائی جی کے کوٹھے پر بولی جانے والی زبان کا محاورہ اس وقت کے عیاش پرست لوگوں کا محاورہ ہے۔ مختلف لوگوں کے مختلف انداز کو ایک ڈرامے میں اس طرح پرونا کہ اس میں قطعی کوئی پیوند نظر نہ آئے اور اس کا پورا اثر اس ماحول کی روح کو برقرار رکھ سکے، یہ ایک بہت بڑا چیلنج کا کام تھا۔ الکھ نندن کو دیے ایک انٹرویو میں حبیب تنویر نے آگرہ بازار کی زبان کے بارے میں کہا ہے کہ:

''آگرہ بازار میں میں نے دلی کی اردو بڑی محنت سے حاصل کر کے لکھی ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی 'دلی کی آوازیں' ایک کتاب ہے اس میں یہ پینچنے والے کٹورے والے، زیرہ پانی بیچنے والے کس کس طرح سے بولی لگاتے ہیں تو اس کی بھی خوبصورتی، کرخنداری بھی اس کے اندر۔ وہ دلی کی زبان کے بارے میں چھوٹی سی کتاب ہے تو اس میں سے میں نے بہت سارے Passage لیے ہیں ان کا استعمال کیا تو بازار کی بولی اور کتاب کی دکان میں جو زبان ہے وہ ہے محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات' ہے۔ اردو لٹریچر کی تاریخ، وہ زبردست اسٹائلش تھے اور ان کی زبان کا بڑا گہرا اثر مجھ پر شروع سے طالب علمی کے زمانے سے تھا تو کچھ اسی انداز کی میں نے زبان لکھی ہے۔''[5]

اس میں زبان کو بنائے رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان کے تلفظ میں پوری اصلیت برتی جائے۔ بازار کے زیادہ تر سین میں تب تک نیا تھیٹر کے چھتیس گڑھی اداکار اپنی اداکاری کا جوہر اور تال کی مہارت سے اپنی خاصی جگہ بنا چکے تھے۔ وہ لوگ اس ڈرامے کے مرکزی تھیم تھے لیکن دوسرے مناظر کے لیے انھوں نے شہری اداکاروں کا انتخاب کیا۔ ان کے شہری انداز کی اداکاری اور اس کی پیش کش میں اعلیٰ طبقے کی بول چال اور طور طریقوں اور نفاست کو جس طرح پیش کیا اس سے آگرہ بازار میں تقویت پیدا ہو گئی ہے۔

آگرہ بازار پیش کش کے لحاظ سے مکمل ہے جسے اسٹیج پر بآسانی پیش کیا جا سکتا ہے اور اسے کسی بھی دور میں پیش کرنے میں زیادہ دقت محسوس نہیں ہوگی۔ گزشتہ ادوار میں یہ ڈراما پچاسوں بار کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا جا چکا ہے اور ہر بار کامیاب رہا ہے۔ یہ اعزاز بہت کم ہی ڈراموں کو نصیب ہوا ہے۔ پہلی بار آگرہ بازار ایکانکی ناٹک کی حیثیت سے سوا گھنٹے میں پیش کیا گیا تھا اور دوسری بار پیش کرتے وقت اسے دو ایکٹ کا بنایا گیا۔ مکالموں اور نظموں میں اضافہ کر کے اسے دو گھنٹے میں پیش کیا گیا۔ آگرہ بازار چھپ کر جب منظر عام پر آیا تو محض پڑھنے والوں کو ذہن میں رکھ کر نظیر کی نظمیں اور اشعار بڑی تفصیل سے درج کر دی گئیں۔ آگرہ بازار میں بھرپور پلاٹ نہ ہونے کے باوجود بیتے ہوئے وقت کی ایسی زندہ تصویر پیش کی جس نے ناظرین کو پوری طرح سے لطف اندوز بھی کیا اور ساتھ ہی سوچنے کے لیے مجبور بھی کیا۔

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ حبیب تنویر نے 'آگرہ بازار' جیسا شاہکار ڈراما پیش کر کے نہ صرف اردو تھیٹر میں بلکہ ہندوستانی تھیٹر میں بھی ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالی اور نئے اسلوب، نیا لب ولہجہ اور ڈراما کو پیش کرنے کے نئے طریقے سے روشناس کرایا۔

■

Dr. Tajammul Ballapuri
Ballapura
Shopian- 192303 Kashmir

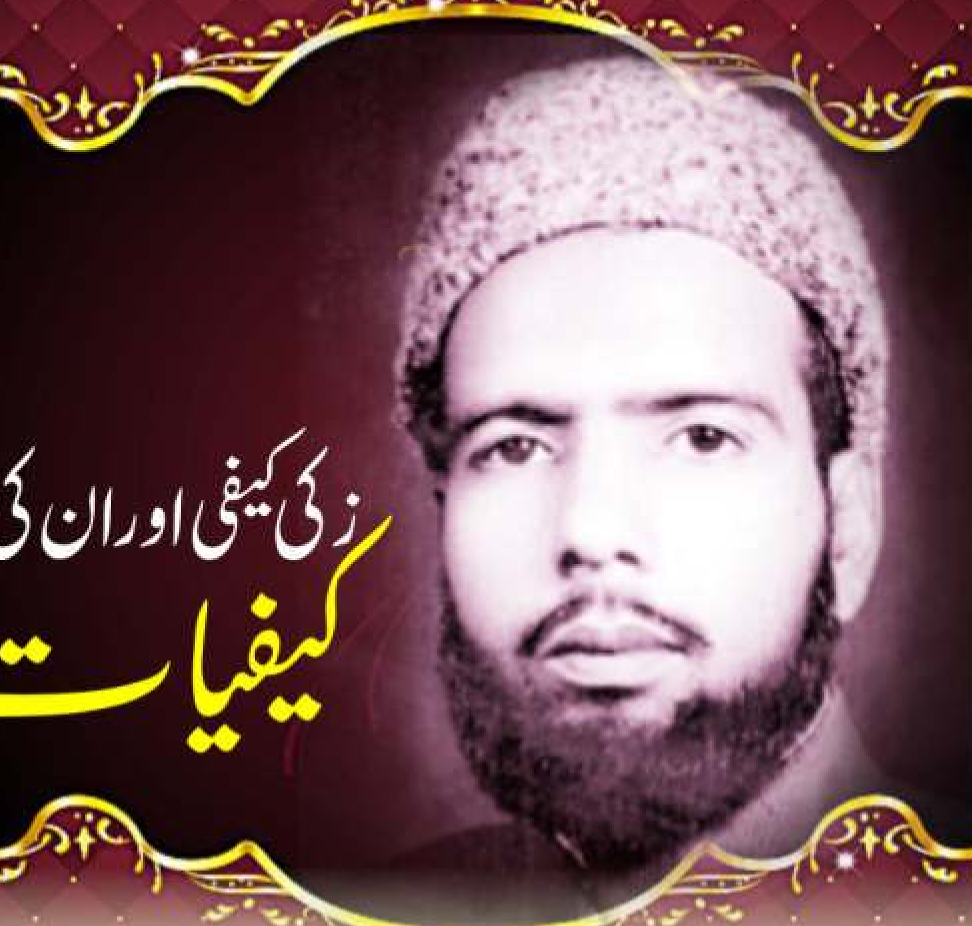

ندیم احمد انصاری

زکی کیفی اور ان کی شعری کیفیات

کیفی کے کلام میں عرفان وآگہی، سنجیدگی وشائستگی، دلکشی و رعنائی اور نرمی و لطافت سبھی کچھ موجود ہے،اس کے باوجود نہ جانے کیوں ان کے شعروفن پر اس طرح توجہ نہیں دی گئی، جس کا وہ بجا طور پر استحقاق رکھتے تھے۔ اس کی ایک وجہ شاید خود ان کی تواضع وکسرنفسی بھی ہے۔ حال یہ تھا کہ سالہا سال کے گہرے روابط کے باوجود ماہر القادری نے 1955 میں انھیں شعر کہتے ہوئے سنا، اس سے قبل وہ خاموش سامع بنے رہے، جبکہ ان کے مکان پر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔اس حساب سے ان کی شعر گوئی کی عمر ان کی وفات یعنی سنہ 1975 تک تقریباً 20 سال ہوتی ہے۔

اب تو زکی کیفی کا کلیات بنام 'کیفیات' شائع ہو چکا ہے، جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ایک حمد اور تیں نعتیں اور دو قصیدے، دوسرے حصے میں ڈیڑھ سو سے زائد غزلیں اور تیسرے حصے میں جذبۂ حب الوطنی سے پُر اٹھائیس ملی نظمیں ہیں۔ برسوں روزانہ ان کا قطعہ روزنامہ 'وفاق' (لاہور) میں شائع ہوتا تھا، جس سے ان کی قدرتِ کلام، مشاقی اور طبیعت میں ہمہ گیری وجودت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

خاندان و ولادت

کیفی کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے: محمد زکی، بن محمد شفیع، بن محمد یاسین، ابن خلیفہ تحسین علی، بن میاں جی امام علی، بن میاں جی حافظ کریم اللہ، ابن میاں جی خیر اللہ، بن میاں جی شکر اللہ۔ (دیکھیے حیاتِ مفتی اعظم، ص:15) جو آگے حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، جس کے لیے کوئی ٹھوس ثبوت تو دستیاب نہیں، لیکن بڑے بزرگوں کا یہی کہنا ہے۔ جیسا کہ ان کے والد صاحب کا بیان ہے:

مجھے اپنے خاندان کا کوئی موثر اور مستند نسب نامہ ہاتھ نہیں آیا، جس سے خاندان کے صحیح اور مستند حالات معلوم ہوتے، مگر اپنے خاندان کے بزرگوں سے بہ تواتر یہ بات سنی ہے کہ ہمارا خاندان حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہے۔ ان کا اصل وطن قصبہ جوراسی ہے، جو قصبہ منگلور کے پاس دیوبند سے تقریباً تیں میل کے فاصلے پر ہے۔(میرے والد ماجد اور ان کے مجرب عملیات، ص:12، ملخصاً)

کیفی کی ولادت ہندستان کے مشہور شہر دیوبند میں 7 مارچ 1926 کو سابق مفتی اعظم ہند ثم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ کے ہاں ہوئی۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے ان کا نام محمد زکی تجویز فرمایا اور تاریخی نام سعید اختر (1345ھ) رکھا گیا (جس میں آٹھ دن حذف کرنے پڑتے ہیں)۔ بعد میں جب انھوں نے شعروسخن کا سلسلہ شروع کیا تو کیفی تخلص اختیار کرلیا۔ ان کی ذہانت وذکاوت اور حاضر جوابی بچپن سے ہی حیرت انگیز تھی۔ (دیکھیے نقوشِ رفتگاں، ص:39)

تعلیم و ابتدایے سخن

کیفی کی ابتدائی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی۔ فارسی وریاضی کی تکمیل کے بعد درسِ نظامی شروع کیا مگر بعض حالات کی بنا پر چوتھے سال کے بعد درسِ نظامی کی تعلیم جاری نہ رہ سکی، البتہ حضرت تھانوی کے علاوہ دیوبند میں مولانا سید اصغر حسین جیسے بزرگوں کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہے۔ اسی کا اثر تھا کہ کبھی کسی ماحول سے مغلوب ومرعوب نہیں ہوئے۔ انھیں کا شعر ہے۔

رنگیں ہے ہم سے قصۂ مہر و وفا کہ ہم
اپنی وفا کا رنگ ترے رخ پہ مل گئے

مطالعے کا ذوق وشوق تھا۔ دین ومذہب، شعروادب اور تاریخ وسیاست تمام ہی موضوعات ان کے مطالعے میں

رہتے تھے، البتہ تاریخ و تصوف سے خصوصی دل چسپی تھی۔ فارسی اور اردو شاعری کا وسیع و عمیق مطالعہ کیا تھا، اور ہر دو زبانوں کے ہزارہا اشعار انھیں یاد تھے۔ فارسی میں حافظ اور سعدی کے علاوہ نظیری اور عرفی کے مداح اور اردو کے قدیم شعرا میں میر، غالب و داغ اور زمانۂ مابعد کے شعرا میں فانی، حسرت، اصغر اور جگر سے متاثر تھے۔

کیفی کے خاندان کے تقریباً ہر مرد و خاتون کو قدرت نے سخن وری کے زیور سے آراستہ کیا۔ آپ کے والد مفتیِ اعظم، مفسرِ قرآن اور کثیر التصانیف عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قادر الکلام اور صاحب مجموعہ شاعر تھے، برادر اصغر جسٹس مفتی تقی عثمانی بھی گو نا گوں عظیم علمی و دینی خدمات کے ساتھ ساتھ شعر و سخن میں بھی داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں اور خود کیفی کے صاحب زادے سعود عثمانی کے بھی کئی مجموعۂ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ اس پورے گھرانے کو عربی، اردو، فارسی اور اب انگریزی میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے۔

کیفی نے نہ صرف اردو میں بلکہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ خاندانی اثرات کہیے یا زور مطالعہ کہ انھوں نے 1945 یعنی فقط انیس سال کی عمر میں باقاعدہ شعر کہنا شروع کر دیا تھا، جو کہ ناپختہ اور ناتجربہ کاری کا زمانہ ہوتا ہے، مگر اس دور میں بھی کیفی کی شعری کیفیات اس درجے کی تھیں کہ جنھیں پڑھ کر ان کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو

تیرے خمارِ عشق ستم میں کمی نہ کر
اتنے تو داغ ہوں کہ گلستاں کہیں جسے

اف تصور کی تیرے رعنائی
تجھ سے بھی کچھ سوا حسیں نکلا

معاصرین ادبا و شعرا

جگر مرادآبادی، احسان دانش، ماہر القادری اور احمد ندیم قاسمی کیفی کے وہ معاصرین ہیں، جن سے ان کے اچھے تعلقات بھی رہے ہیں۔ من جملہ ان کے جگر کافی سینئر ہیں۔ کیفی نے ابتدائے سخن میں جب انھیں اپنی ایک غزل کا یہ مطلع سنایا۔

ہم ہیں قتیل اک بت نازک خیال کے
آلام روزگار ذرا دیکھ بھال کے

تو جگر مرحوم چونک اٹھے، بڑی داد دی اور مشورہ دیا کہ مشق سخن ضرور جاری رکھیں۔ کیفی نے اس مشورے کو احترام کے ساتھ قبول کیا اور اس پر عمل بھی کیا۔

کیفی نے بہت سی زمینوں اور بحروں میں فقید المثال شاعری کی ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں بھی انھیں سلاست کے ساتھ اپنا مافی الضمیر ادا کرنا آتا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو

دنیا ہے اک رین بسیرا
آج مرا کل تیرا ڈیرا

دیگر شعرا کی طرح کیفی نے اسلاف کا تتبع بھی کیا ہے، لیکن اس میں بھی اپنی انفرادیت کو گم ہونے سے بچائے رکھا۔ وہ اسلاف کی استادی کا اعتراف تو کرتے ہیں، لیکن اپنی انفرادیت نہیں چھوڑتے۔ کہتے ہیں۔

خون جگر پلایئے کیفی ابھی کچھ اور
آساں نہیں ہے کہنا غزل میر کی طرح

پھر ایمائی انداز میں گویا ہوتے ہیں۔

یا دل میں اترتی ہیں کسی شوخ کی باتیں
یا میر کا اندازِ سخن رام کرے ہے

وفات

کیفی تقسیم ہند کے دوران 1948 میں پاکستان چلے گئے تھے۔ کراچی پہنچ کر کچھ عرصے کے بعد انھوں نے والدین کے مشورے سے لاہور میں مستقل سکونت اختیار کر لی، اور وہاں انارکلی میں مال روڈ کے قریب ایک وسیع دکان کرائے پر لی اور ادارۂ اسلامیات کے نام سے دینی کتابوں کا ایک کتب خانہ قائم کیا، جو اب تک قائم ہے۔ 1370ھ مطابق 1951 میں والدین کے ہمراہ پہلا حج کیا

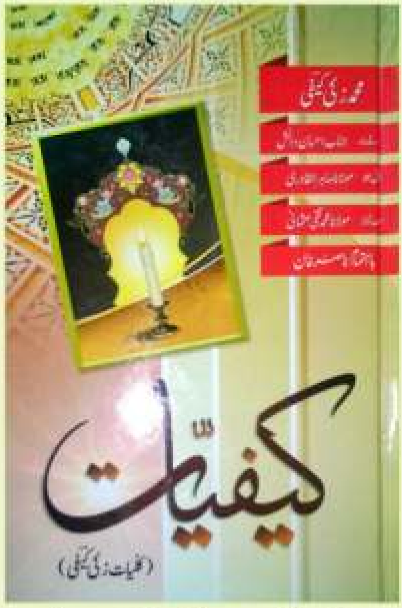

اور اس کے بعد بھی متعدد بار انھیں حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ والدین سے انھیں مثالی تعلق تھا۔ ان سے دور رہنے کے باجود وہ ان کے چھوٹے چھوٹے مسائل اور تمام جزئیات سے پوری طرح باخبر رہتے اور ادا ادا سے انھیں راحت پہنانے کی فکر کرتے۔ لیکن عظیم باپ کا یہ لائق فرزند تقریباً اڑتالیس سالوں کی قلیل عمر پوری کر کے دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔

کیفی کی شاعری اہل نقد و نظر کی نگاہ میں

کیفی کی شعری کائنات پر بعض مشاہیر اہل نقد و نظر کے مختصر مگر جامع تبصرے ملاحظہ ہوں، جو شعر و ادب میں ان کا مقام و مرتبہ معلوم کرنے میں معاون ہیں۔

معروف شاعر و ادیب اور متعدد ادبی رسائل کے مدیر ماہر القادری اردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے کیفی کو مشاعروں کے سامع سے شاعر بنتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ کیفی کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

(ایک عرصے کے بعد) وہ ایک سکّہ بند شاعر (Full Fledged Poet) کی حیثیت سے منظرِ عام پر آگئے۔ غزل کا ہر نقشِ ثانی نقشِ اول سے بہتر، خوب سے خوب تر کی تلاش و جستجو۔ ایسا محسوس ہوا کہ آغاز شباب ہی سے شعر گوئی ان کے اندر بالقوت موجود تھی۔ پاکستان آکر یہ بالفعل بن گئی، لاہور کی ادبی نشستوں میں اب مولانا زکی کیفی کو اصرار کرکے بلایا جانے لگا۔ نظم کے میدان میں بھی زکی کیفی کے توسن فکر و خیال نے جولانیاں کی ہیں۔ غزل زکی کیفی کا اصل میدان ہے۔ غزل ان کی محبوب ترین صنف ہے۔ اُن کی غزلوں میں زبان کا

کیفی کے خاندان کے تقریباً ہر مرد و خاتون کو قدرت نے سخن وری کے زیور سے آراستہ کیا۔آپ کے والد مفتی اعظم، مفسر قرآن اور کثیر التصانیف عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قادر الکلام اور صاحب مجموعہ شاعر تھے، برادر اصغر جسٹس مفتی تقی عثمانی بھی گو نا گوں عظیم علمی و دینی خدمات کے ساتھ ساتھ شعر و سخن میں بھی داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں اور خود کیفی کے صاحب زادے سعود عثمانی کے بھی کئی مجموعۂ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ اس پورے گھرانے کو عربی، اردو، فارسی اور اب انگریزی میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے۔

> **زکی کیفی کی غزل جملہ روایتی آداب غزل گوئی کے باجود بعض خاص انفرادی نقوش کی حامل ہے۔ کیفی کی غزل میں عشق کی باتیں، وقار اور تمکین کے لہجوں میں نمودار ہوتی ہیں، مگر ہر قاری گواہی دے گا کہ اس سے اس تاثیر اور خلوص و صداقت میں سر مو فرق نہیں آیا جو ایک حقیقی غزل کے لوازم میں شامل ہے۔ کیفیات میں پیرایہ ہائے خاص بھی ہیں اور نکتہ ہائے دانش بھی، اور وہ سچائیاں تو ہر حال میں موجود ہیں جن کے بغیر کوئی شاعری شاعری کہلانے کی مستحق نہیں۔**

رچاؤ، اظہار بیان کا رکھ رکھاؤ اور تغزل کا بناؤ سنگھار ملتا ہے۔ان کی شاعری میں رنگینی اور سنجیدگی کا خوش گوار امتزاج وتوازن پایا جاتا ہے۔

(ملخصاً از کیفیات،ص:12-13)

ڈاکٹر سید عبداللہ اردو تنقید میں مسلّمہ مقام کے حامل ہیں۔ انھوں نے کیفی کی غزلوں بلکہ پوری شاعری پر نگاہ ڈالنے کے بعد بڑی ذمے داری کے ساتھ تحریر فرمایا ہے:

میں بلا تردّد کہہ سکتا ہوں کہ ان کی غزل جملہ روایتی آداب غزل گوئی کے باجود بعض خاص انفرادی نقوش کی حامل ہے۔ کیفی کی غزل میں عشق کی باتیں، وقار اور تمکین کے لہجوں میں نمودار ہوتی ہیں، مگر ہر قاری گواہی دے گا کہ اس سے اس تاثیر اور خلوص وصداقت میں سرِ مو فرق نہیں آیا جو ایک حقیقی غزل کے لوازم میں شامل ہے۔ کیفیات میں پیرایہ ہائے خاص بھی ہیں اور نکتہ ہائے دانش بھی، اور وہ سچائیاں تو ہر حال میں موجود ہیں جن کے بغیر کوئی شاعری شاعری کہلانے کی مستحق نہیں۔

(دیکھیے کیفیات،ص:32-33)

معروف شاعر وادیب اور انشا پرداز احسان دانش کا بیان ہے کہ کیفی کے کلام میں سہلِ ممتنع کے باوجود محض داد وتحسین حاصل کرنے والی عمومیت نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں سادگی کے ساتھ معانی کی رنگا رنگی بھی موجود ہے۔ وہ کیفی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

زکی کیفی کے کلام میں سہلِ ممتنع زیادہ ہے، لیکن اس میں وہ عمومیت نہیں جسے اِدھر اُدھر کی داد وتحسین کے ڈونگڑے گھٹیا شہرت دیتے ہیں۔ اُن کے اشعار کی سادگی اپنے معانی کی کیاریوں میں رنگا رنگ گل بوٹے رکھتی ہے، جو اپنے رنگ و بو سے حُسن کی توانائی اور قوت میں اضافہ کرتے ہیں اور شاعر کو جہانِ جاوداں کی داغ بیل سے رخ نہیں بدلنے دیتے۔ (کیفیات،ص:8)

معروف شاعر احمد ندیم قاسمی نے بھی کیفی کے فن کی انفرادیت کا اعتراف کیا اور انھیں سلاست وسادگی اور پُرکاری میں جگر وحسرت کی روایت کا بلیغ نمائندہ قرار دیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

زکی کیفی کی غزل میں جو سلاست اور سادگی ہے، وہ روز مرہ اور پُرکاری کا دوسرا نام ہے۔ جگر اور حسرت کی غزل اس پُرکاری کی عمدہ مثال ہے اور زکی کیفی اس روایت کے ایک بلیغ نمائندے ہیں... ان کے ہاں جذبے کی جو شائستگی ہے، وہ غزل کہنے والے کم ہی شعرا کے حصے میں آئی ہے۔ (کیفیات،ص:36)

نمونۂ کلام

آخر میں ہم باذوق قارئین کی خدمت میں اس امید کے ساتھ کہ آئندہ ضرور اردو کے اس باکمال شاعر کو اس کا واجبی حق دیا جائے گا، بہ طور نمونہ ان کے شعری سرمایے سے بعض منتخب اشعار درج کرتے ہیں۔ مشتے نمونے از خروارے:

خزاں کے بعد دورِ فصلِ گُل آتا ہے گلشن میں
چمن والو خزاں میں پھول مرجھایا ہی کرتے ہیں

——

شبنم تجھے اجازتِ اظہارِ غم تو ہے
تو خوش نصیب ہے کہ تری آنکھ نم تو ہے

——

زندگی کی داستاں ہے ایک دیوانے کا خواب
مدتوں سے کہہ رہا ہوں اور کہا کچھ بھی نہیں

——

جس قدر تسخیرِ خورشید و قمر ہوتی گئی
زندگی تاریک سے تاریک تر ہوتی گئی

——

آجاؤ اس طرح بھی مثالِ نسیمِ صبح
بیٹھے ہیں ہم بھی غنچۂ دل گیر کی طرح

——

دعویٰ وفا کا اور تمنائے قربِ دوست
یہ عشق ہے اگر تو ہوس کس کا نام ہے؟

——

ہوں گی کسی کو تیری جفا سے شکایتیں
میری تباہیوں کا مگر یہ سبب نہ تھا

——

پاسِ ادب سے عشق نے اپنی وفا کا ذکر
اُن سے اگر کیا بھی تو تقصیر کی طرح

——

اب ہُوا معلوم کیا ہے لذتِ احساسِ غم
دل کی قیمت بڑھ گئی کیفی شکستِ دل کے بعد

——

دل کا جو حال ہے لفظوں میں بیاں کیسے ہو؟
سانس لینا مجھے مشکل ہے، فغاں کیسے ہو؟

——

اچھا ہے رہے دل یوں ہی ناکام تمنّا
بنتے ہوئے دیکھا ہے محبت کو ہوس بھی

——

جب عرضِ غم کی کوئی بھی صورت نہ بن سکی
ہم اُن کی بزمِ ناز میں لے کر غزل گئے

——

کہنے کو ایک ذرۂ ناچیز ہیں مگر
تعمیرِ کائنات کے کام آرہے ہیں

——

میں ہوں کہ مرے دم سے ہے میخانے کی رونق
میرا ہی بھری بزم میں اک جام تہی ہے

——

تیرے دیوانوں کو خوفِ دار کیا؟
پھول چننے ہیں تو خوفِ خار کیا؟

——

پھر مری گرد کو بھی پا نہ سکے گی دنیا
جس کو دل سے مرا بننا ہو وہ اب بن جائے

——

تمنائیں ہیں لاکھوں کم ہے لیکن فرصتِ ہستی
اقامت کے ارادے ہیں مگر حالت سفر کی ہے

——

ستارے ڈوبنا شبنم کا رونا شمع کا بجھنا
ہزاروں مرحلے ہیں صبح کے ہنگام سے پہلے

——

قدم بوسی کی دولت مل گئی تھی چند ذرّوں کو
ابھی تک وہ چمکتے ہیں ستاروں کی جبیں ہو کر

■

Nadeem Ahmed Ansari
(Lecturer Dept. of Urdu, IY College)
Postal add. : 403, Mangaldarshan, Turner Road
Bandra (w), Mumbai - 400050 (MS)
Mobile:09022278319

ریاض توحیدی

علامتی افسانہ: تخلیقی مضمرات

لغوی اعتبار سے علامت کے معنی نشان، مارک، سراغ، کھوج، اشارہ، کنایہ وغیرہ ہیں۔اصطلاحی مفہوم میں علامت نمائندگی کا ایک ایسا وسیلہ ہے جو کسی لفظ، شے، کردار یا تصور کو کسی خاص معنی، مقصد یا مفہوم میں پیش کرتا ہے۔مثلاً پھول ایک شے ہے۔یہ محبت کی علامت بھی ہے اور ماتم کی نشانی بھی۔اب یہاں پر پھول کے حقیقی معنی کے برعکس جو دوسرے معنی سامنے آتے ہیں، اس کی نمائندگی علامت کرتی ہے۔ علامت سازی کی اہمیت پر چارلس بودلیئر (Charles Baudelaire) روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاثرات کی تہہ میں جو ایک اساسی عالم چھپا ہوا ہے،اس کے رموز کا اظہار صرف علامتوں کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔''

کسی بھی لفظ یا شے کے علامتی اظہار کا مدار ماحول کی کیفیت میں مضمر ہوتا ہے۔اب شعر و ادب میں علامت نگاری کی بات کریں تو شعر و ادب میں علامت کا استعمال تخلیقی اظہار کا ایک معنی خیز وسیلہ ہے،اسی بنیاد پر علامت کو تخیلی تجربات کی گاڑی (Vehicle for imaginative experience) بھی کہا جاتا ہے۔کیونکہ علامتی اسلوب، کسی بھی تخلیق کی امکان خیز معنویت میں توانا کردار ادا کرتا ہے اور تخلیق کی معنوی جہات میں وسعت پیدا کرنے کا تخلیقی وسیلہ بنتا ہے۔افسانے میں علامتوں کے استعمال اور معنوی تہہ داری پر بات کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''علامتیں ایک طرح کے وسیع استعارے ہیں جن کے شعوری اور نیم شعوری رشتوں کو ابھار کر افسانہ نگار معنوی تہہ داری پیدا کر دیتا ہے۔علامتوں کے حسی پیکر ہوتے ہیں،لیکن بعض علامتوں سے افسانہ نگار فضا آفرینی کا یا محض خاص طرح کے تاثر ابھارنے کا کام لیتا ہے۔ایسے افسانے کا کمال یہ ہے کہ وہ لغوی اور علامتی دونوں سطحوں پر پڑھا جا سکے۔بعض افسانوں میں خاص خاص لفظوں کا استعمال ایسی معنوی وسعت اختیار کر لیتا ہے کہ ان میں علامتی افسانہ کی شان از خود پیدا ہو جاتی ہے۔''

(فکشن کی شعریات،تشکیل وتنقید،ص 251)

علامت کو تخلیق کا حسن بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک علامتی افسانہ یا شعر کی قرأت میں جو فنی حسن اور معنی خیزی کا لطف موجود ہوتا ہے وہی اس کی تخلیقیت کا موثر فنی جواز فراہم کرتا ہے۔

علامتی اظہار میں جو مثبت معنوی ابہام پوشیدہ رہتا ہے وہ تخلیق کی تنقید و تفہیم کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔اسی بنیاد پر کوئی بھی باخبر ناقد اور باشعور قاری علامتی تخلیق کی معنوی جہات کی تفہیم اپنی اپنی علمی بصیرت کے مطابق کرتا رہتا ہے۔تفہیم کا یہ تصوراتی اظہار ہی ایک علامتی تخلیق کی کامیابی ہوتی ہے۔اس کے برعکس ایک معمولی شعر یا افسانے میں جو عام سے خیالات پیش کیے جاتے ہیں وہ معنی کے اکہرے پن کی عکاسی کرتے ہیں۔اس تعلق سے پروفیسر مجید مضمر اپنی تصنیف ''اردو کا علامتی افسانہ،، میں لکھتے ہیں:

''ادب میں علامتوں کا استعمال کئی طرح سے ہوتا ہے۔کہیں الفاظ یا زبان سے،کہیں تصورات سے،کہیں پیکروں سے اور کہیں پر کردار یہ کام انجام دیتے ہیں۔اور کہیں واقعات علامتی روپ اختیار کر لیتے ہیں۔اس لیے یہ مفروضہ بے بنیاد ہے کہ ادب میں صرف زبان یا الفاظ کے ایک خاص استعمال سے ہی علامتوں کی تشکیل ہوتی ہے۔اگرچہ علامت کی ترسیل زبان کے ذریعے ہی سے ممکن ہے کیونکہ ''زبان سے آگے جانے کا راستہ بھی زبان ہی سے گزرتا ہے'' لیکن زبان کا علامتی استعمال علامتی فکر

سے الگ کوئی معانی نہیں رکھتا۔ دراصل علامتی لفظ اور علامتی فکر — دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس کے علاوہ علامتوں کی ایک اور سطح بھی ہے یعنی کبھی کسی ادبی تخلیق میں لفظ، کردار یا کوئی واقعہ بطور علامت استعمال ہوتا ہے، جس سے پوری تخلیق کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور کبھی پوری تخلیق علامتی روپ اختیار کر لیتی ہے۔ ادبی علامت اور علامتی ادب میں اس طرح یہی فرق ہے کہ آخر الذکر ایک علامتی کل ہوتی ہے جبکہ اول الذکر اسی کل کے جز کا کام دے دیتی ہے۔ علامتی تخلیق کے عناصر تخلیق سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتے بلکہ پوری تخلیق کے اجزا بن کر اس کی مکمل ساخت کو تشکیل دیتے ہیں۔''

(اردو کا علامتی افسانہ، ص 25)

علامتی اسلوب کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس اسلوب کی ضرورت ماحول کے تابع ہے یعنی اگر کہیں پر حالات اتنے سنگین ہیں کہ کوئی قلمکار اپنی بات عام فہم انداز سے نہیں کر سکتا ہے تو وہاں پر علامتی اظہار کی ضرورت پڑتی ہے لیکن علمی و فنی نقطۂ نگاہ سے یہ رائے صحیح نہیں ہے کیونکہ علامتی اسلوب، فنی اظہار کا ایک تکنیکی اسلوب (Tecnical Style) ہے جو بقول ڈبلو. بی. ییٹس ''تمام اسلوب کا جوہر ہے'' (The substance of all style)۔ فنی طور پر کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیق میں الفاظ و خیال کا علامتی برتاؤ معنوی جہات کی تفہیمی راہیں استوار کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بطور مثال پروفیسر حامدی کاشمیری کے درج ذیل شعر دیکھیں تو علامتی اسلوب کی معنوی جہات کا تصور واضح ہو سکتا ہے۔

جتنے بھی اہل گلستاں تھے، ہوا کی زد میں تھے
طائران صبح کس کو حوصلہ دیتے رہے
ان کا شوق کوہ پیمائی جنوں انگیز تھا
اہل وادی دیر تک ان کو صدا دیتے رہے

(خواب رواں)

اب افسانے میں علامتی اسلوب کی بات کریں تو اس مناسبت سے کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اختصاراً درج ذیل اقتباسات بھی مناسب رہیں گے۔

''اجنبی سائے چیخ چیخ کر رونے لگے اور بین کر کے موئی سے پوچھنے لگے۔ کیا خوف ہی سب کچھ ہے؟ نہیں.... وہ تو محض ابتداء ہے۔ خون گاڑھا ہو کر جمنے لگا۔ پانی جو سورج کی گرمی سے اڑا تو جمتا خون بساند بھی دینے لگا۔ مہا دیا شکلیں بدل کر ڈرانے لگا مگر اجنبی سائے یونہی ایک دوسرے کا گوشت کھا کھا کر پلنے لگے۔ وہ اپنی دستار پر ستارے سجائے میلے پر قبضہ جمانے لگے۔

پولیس والا ہاتھ میں ڈنڈا گھماتے ہوئے چپ چاپ اپنے قدم آگے بڑھانے لگا۔وہ دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ دھند میں اضافہ ہورہا تھا۔ پھیلتی دھند میں لپٹے سرسبز درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھے کبوتروں کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں اوروہ بکھرتے گھونسلوں کو کوؤں کی یلغار سے بچانے کے لیے اپنے پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ کبوتروں کی بدحواسی دیکھ کر وہ سرد آہ بھرتے ہوئے سوچنے لگا کہ دہائیوں سے ان کبوتروں کی روح زخمی ہورہی ہے، کب انہیں کوؤں کی یورش سے نجات ملے گی۔

ہتھیار آگ برسانے لگے۔ چرند پرند بھاگنے لگے۔ بستیاں لاشوں سے پٹنے لگیں.... محابا، مردہ سایوں کو جگانے لگا۔ اجنبی سائے حیران نظروں سے اس سے پوچھنے لگے.... کون ہیں ہم؟ محابا، اجنبی سایوں میں مسیحا ڈھونڈنے لگا..... محبت کروا پنے جیسوں سے کہ تمہیں اس نے محبتوں سے پیدا کیا اجنبی سائے چیخ چیخ کر جھنے لگے اور بے حیائی سے عیسیٰ سے پوچھنے لگے۔ کیا محبت ہی سب کچھ ہے؟''

(افسانہ ''ستے کے بکھرے ہوئے بال''.....ڈاکٹر بلند اقبال)

''ہوا آئی تو وہ بھی یہی خبر لائی۔ پھر تو جو بھی آیا، یہی خبر لایا۔ ایک ہی خبر.... اور پھر.... خوف اور مایوسی نے جسم کے خوبصورت حصوں پر تعمیر شدہ مسرت، آزادی اور امنگ کی خوبصورت عمارتوں کو منٹوں میں ڈھا دیا اور اپنی جڑیں مضبوط کر لیں۔

ہواؤں کی دیواروں پر لکھی تحریر سے آنکھیں موندی جا سکتی ہیں لیکن پلکوں کی دیواروں پر لکھی تحریریں! تمام دروازے، کھڑکیاں، روزن اور ہر وہ گوشہ بند کر دیا گیا جس سے باہر کے ذرے کے آنے کی امید بھی کی جا سکتی تھی۔

لوگ گھروں میں بند ہو کر بیٹھ گئے لیکن سکون سڑکوں پر آزادانہ گھوم رہا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اسے بند کمروں سے نجات ملی تھی... یعنی بات الٹی ہو گئی تھی، لوگ گھروں میں اور سکون سڑکوں پر۔

میں نے اپنے بچے کھچے دل سے کہا... یہ بہت برا ہوا۔ زبان نے فوراً اس کی تائید کی... بہت برا ہوا۔''

(افسانہ: اندھیرے میں چلنے والے... عبد الصمد)

تخلیق کی کامیابی کا انحصار تخلیقیت (Creativity) پر ہوتا ہے۔ جو ذہن تخلیقی طور پر جتنا زرخیز ہوگا تو اس کی تخلیق میں بھی اتنی ہی تخلیقیت موجود ہوگی۔ علامتی اظہار کا تعلق بھی تخلیقی زرخیزی سے جڑا ہوا ہے۔ اب یہ تخلیق کار کے تخلیقی رویہ (Creative Attitude) پر منحصر ہے کہ وہ تخلیق میں اپنے خیالات کو راست بیانیہ میں پیش کرتا ہے یا علامتی اسلوب اپناتا ہے۔ علامتی اسلوب کے لیے علامتوں کا صحیح اور واضح شعور ہونا ضروری ہے تاکہ تخلیق کار صحیح تصور کے ساتھ کسی علامت کا استعمال کر سکے اور یہ حد سے زیادہ تجریدیت کا شکار ہو کر مہمل تصور نہ بن جائے۔ تخلیق میں علامت کا استعمال پہلو دار معنویت کا غماز ہوتا ہے اور سود مند بھی، لیکن اس میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ جو علامت استعمال کی جا رہی ہے یا تو اس کا تصور تخلیق کار اور قاری کے ذہن میں بھی واضح ہو یا تخلیق میں وہ اس طرح سے مستعمل ہو کہ موضوع کے ماحول کے مطابق وہ اپنی مخصوص معنوی جہت بنا سکے۔ مثلاً، کبوتر امن کی علامت ہے۔ اب اگر یہ بطور علامت کسی تخلیق میں مستعمل ہوگا تو قاری کے ذہن میں پہلے ہی اس کا علامتی تصور یا جواز موجود ہے، اس لیے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی افسانے میں کالا دیو کی علامت لائی جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ یا تو دیو کے اصلی تصور کا فنی اظہار ہونا چاہیے یا پھر یہ علامت کسی مخصوص تصور مثلاً کسی ظالم و جابر قوت، انسان، حکمران، نظام، یا سیاسی و سماجی ظلم و ستم کا تخلیقی اظہار ہونا چاہیے۔ اس قسم کے فنی اظہار کی صراحت درج ذیل اقتباسات سے بھی ہو سکتی ہے:

''پولیس والا ہاتھ میں ڈنڈا گھماتے ہوئے چپ چاپ اپنے قدم آگے بڑھانے لگا۔ وہ دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ دھند میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پھیلتی دھند میں لپٹے سرسبز درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھے کبوتروں کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں اور وہ بکھرتے گھونسلوں کو کوؤں کی یلغار سے بچانے کے لیے اپنے پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ کبوتروں کی بدحواسی دیکھ کر وہ سرد آہ بھرتے ہوئے سوچنے لگا کہ دہائیوں سے ان کبوتروں کی روح زخمی ہو رہی ہے، کب انہیں کوؤں کی یورش سے نجات ملے گی۔''

(افسانہ: سفید کبوتر)

''کالے دیوؤں کا یہ منحوس سایہ کئی دہائیوں سے بستی کے اوپر چھایا ہوا تھا۔ اس جنت نما بستی کے روح پرور مشک بار ماحول کو ان بدصورت کالے دیوؤں کی بدبودار سانسوں نے پلیگ زدہ بنائے رکھا تھا اور ان خبیث

روحوں کی جابرانہ موجودگی کی وجہ سے بستی کے عنبر آگیں چمن زاروں، جھر جھر کرتے آبشاروں، پُر فریب کہساروں اور حُسن خیز سبزہ زاروں پر منحوسیت کے سیاہ سائے چھائے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں یہ چنڈال فطرت بدصورت مخلوق کن بدتہذیب ویرانوں سے نکل کر ہاتھی کے دانت دکھائے بستی کے ریشم مزاج انسانوں کے سروں پر موت بن کر سوار ہو چکی تھی............ یہ بدفطرت کالے دیو بستی کے کسی بھی گھر میں بے دھڑک گھس جاتے اور اپنی خون خوار آنکھوں کا رعب جماتے ہوئے بستی کے مکینوں کی بے بسی اور بے کسی کے ساتھ جس طرح سے چاہتے کھلی اڑاتے رہتے۔ اگر کوئی انسان اپنی آن بچانے کے لیے ان درندوں سے اُلجھ پڑتا تو ان وحشیوں کے خونخوار پنجے اس مظلوم کو نوچ نوچ کر لہولہان کر جاتے اور ان کے معصوموں کو پلک جھپکتے ہی جھپٹ کر لے جاتے۔ بستی کے لوگ ان آدم خوروں کے بجائے ان بے زبان کتوں کی وفاداری اور انسان دوستی کے شکر گزار نظر آتے تھے۔ جو رات کے گھنے سائے میں اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر بستی کے لوگوں کو بھونکتے بھونکتے ان ظالموں کی آمد کا اشارہ کرتے رہتے۔ پھاٹک کے سامنے مارے گئے کتوں کی بدبو سے جب کالے دیو تنگ آگئے تو انہوں نے بستی کے لوگوں کو حکم جابری سنایا کہ وہ ان خون آلودہ کتوں کو اپنے اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر دور کسی نالے میں پھینک دیں۔ بے بس لوگ حکم جابری کی تعمیل کرتے ہوئے کتوں کو کاندھوں پر اُٹھائے جا رہے تھے۔"

(افسانہ: کالے دیوؤں کا سایہ: ڈاکٹر ریاض توحیدی)

افسانے میں علامتی اظہار عنوان، کردار، موضوع، چند جملوں اور کبھی کبھی پورے متن میں بھی چھایا رہتا ہے لیکن اس کے لیے اہم بات یہ ہے کہ تخلیق کار علامتی اسلوب اپناتے ہوئے تخیل کے سیال تصور کو معنی خیز تصور کی ترسیل کرنے پر قادر ہو، نہیں تو وہ تخلیق ایک بے معنی پہیلی کے سوا کچھ بھی نہ ہوگی۔ تخلیق کی کامیابی کا انحصار فنی رموز کی شناسائی اور پہلودار معنویت پر ہے۔ فنی اور معنوی طور پر افسانے کے متن میں تخلیقی رچاؤ ہونا چاہیے نہ کہ کسی واقعہ یا خیال کو صحافتی انداز سے روداد نما بنایا جائے۔ تخلیقی رچاؤ کے لیے علامتی اسلوب بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ متن میں امکان خیز معنویت پیدا کرتا ہے اور قرات کے دوران قاری کا ذہن متن میں پوشیدہ معنی و مفہوم اور کیفیت و تاثر کے کئی تفہیمی جہات انگیز کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی علامتی شعر یا افسانے کی تفہیم باشعور قارئین مختلف زاویوں سے کرتے رہتے ہیں کیونکہ علامتی

زبان و بیان کے اعتبار سے بھی علامتی افسانے میں مستعمل تراکیب اور جملوں کی ساخت کا صحیح ادراک ہونا لازمی ہے تاکہ تخلیق کار کسی بے معنی ترکیب یا جملے کو علامت سمجھ کر خود بھی دھوکے میں نہ رہے اور قاری کوبھی ذہنی الجھن میں نہ ڈال سکے۔ تنقیدی نقطہ نگاہ سے ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ کسی بھی علامتی تخلیق کی تفہیم وتوضیح کے دوران صرف متنی ماحول سے سروکار رکھنا ضروری ہے اور اسی ماحول کے دائرے میں تشریح و توضیح کرنا صحیح طریقہ تجزیہ ثابت ہوسکتا ہے ،نہیں تو معاملہ سوال از آسماں جواب از ریسماں کے مثل بن جائے گا۔

تخلیق کے متن میں معنی سے زیادہ مفہوم کو انگیز کرنا پڑتا ہے، اس لیے علامتی تخلیق میں لفظ کے لغوی مفاہیم کے علاوہ وسعت پذیر معنوی انسلاکیت مضمر ہوتی ہے۔ علامتی اسلوب کی یہ وسعت پذیر معنوی انسلاکیت درجہ ذیل اقتباس سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

"ریوڑ کی حفاظت کی خاطر دائیں بائیں، آگے پیچھے چند خونخوار کتے لمبی لمبی زبانیں نکالے رال ٹپکاتے دوڑ رہے ہیں، بھیڑوں کی معمولی حرکت پر بھی ان کی کڑی نظر ہے۔ دفعتاً اس نے دیکھا کہ ایک بھیڑ ریوڑ سے کٹ کر دوسری سمت مڑ گئی ہے۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلی ہوگی کہ ایک محافظ کتے کی نگاہ اس پر پڑ جاتی ہے اور وہ غرا کر اس پر جست لگا دیتا ہے۔ کتے کے تیز اور نکیلے دانت بھیڑ کی گردن میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ دوسرے کتے بھی غراتے ہوئے اس گمراہ بھیڑ پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں کہ چند لمحوں بعد وہاں ادھ چچھوڑی ہڈیوں، ریت میں جذب لہو کے بڑے بڑے دھبوں اور بھیڑ کی بھوری کھال کے خون آلود چیتھڑوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ دیگر بھیڑیں سہمی ہوئی نظروں سے اس منظر کو دیکھتی ہیں اور خوف و دہشت سے ایک دوسرے میں یوں سمٹ سکڑ جاتی ہیں کہ دور سے پورا ریوڑ زمین میں رینگتے ایک بھورے بادل کی مانند دکھائی دیتا ہے۔"

(افسانہ: معبر... سلام بن رزاق)

افسانے میں علامتوں کا تخلیقی استعمال اسی وقت مفید ثابت ہوتا ہے جب افسانے کی علامتی فضا بامعنی افسانوی اظہار کی حامل ہو اور اس کے متن میں کہانی پن کے ساتھ ساتھ خیالات کا ٹھوس پن بھی موجود ہو، تاکہ افسانے کے علامتی ماحول کی تفہیم میں کوئی بے معنویت یا بے مقصد ابہام موجود نہ رہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی علامتی افسانے میں مستعمل تراکیب اور جملوں کی ساخت کا صحیح ادراک ہونا لازمی ہے تاکہ تخلیق کار کسی بے معنی ترکیب یا جملے کو علامت سمجھ کر خود بھی دھوکے میں نہ رہے اور قاری کو بھی ذہنی الجھن میں نہ ڈال سکے۔ تنقیدی نقطہ نگاہ سے ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ کسی بھی علامتی تخلیق کی تفہیم وتوضیح کے دوران صرف متنی ماحول سے سروکار رکھنا ضروری ہے اور اسی ماحول کے دائرے میں تشریح وتوضیح کرنا صحیح طریقہ تجزیہ ثابت ہو سکتا ہے، نہیں تو معاملہ سوال از آسماں جواب از ریسماں کے مثل بن جائے گا۔

اردو میں کافی تعداد میں علامتی افسانے تخلیق ہوئے ہیں اور آج بھی لکھے جا رہے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے چند افسانوں کا ذکر (جو اس وقت یاد آرہے ہیں) کرنا مفید رہے گا۔

"سلطان، وحشی (احمد ندیم قاسمی)، غالیچہ (کرشن چندر)، آخری آدمی، کایا کلپ، وہ جو کھوئے گئے (انتظار حسین)، ماچس، کمپوزیشن دو (بلراج مین را، دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم، بجوکا (سریندر پرکاش)، لمبے کی موت (غلام الثقلین)، پرندے، چوراہا (انور سجاد)، میگھ ملہار (ممتاز شیریں)، معبر (سلام بن رزاق)، اندھیرے میں چلنے والے (عبدالصمد)، سرنگ (سریندر پرکاش)، اندھے پرندے کا سفر (غیاث احمد گدی)، جلاوطن (عبداللہ حسین)، اپنا گوشت، تفتیش (شوکت حیات)، آسمان، پھول اور لہو (نورشاہ)، شہر کا اغوا (عمر مجید)، پہلا چہرہ (زاہد مختار)، ہاؤس ہوسٹس، عمارت (پروفیسر غضنفر) رنگ، سوچ بورڈ کے نمبر، جنگل کے قیدی (مشتاق مہدی)، کالے دیوؤں کا سایہ، سفید کبوتر، سفید نور کا راز (ریاض توحیدی)، ستیہ کے بکھرے بال (ڈاکٹر بلند اقبال)، بابل کا مینار (ڈاکٹر اختر آزاد)، نقش فریادی (راجہ یوسف)، لاشے، اماوس نگری (سید تحسین گیلانی)، بددعا کرنے والے (سلیم سرفراز) وغیرہ

■

Reyaz Tauheedi
Wadipora Handwara - 193221 (Kashmir)

اردو افسانے میں پانی کی قلت کا مسئلہ

سید احمد قادری

پانی کی قلت کا مسئلہ، اب مقامی کے بجائے بین الاقوامی مسئلہ بن چکا ہے۔ پانی، جو قدرت کا انمول تحفہ اور بیش بہا خزانہ ہے، جو نہ صرف انسانی زندگی بلکہ حیوانات و نباتات تک کے لیے بھی نعمت سے کم نہیں ہے، یعنی ہر جاندار کی زندگی کا انحصار پانی پر ہے، اس ضمن میں ہندی زبان کا بڑا ہی خوبصورت سلوگن سننے کو عام طور پر ملتا ہے کہ 'جل ہی جیون ہے'۔ پھر بھی اس کا استعمال (جہاں موجود ہے) بہت بے دردی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ہم کسی کی دی گئی اس پیشن گوئی پر بھی توجہ نہیں دے رہے ہیں کہ تیسری جنگ اگر ہوئی، تو وہ پانی کے لیے ہوگی۔ ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ پانی زندگی کی اہم ضرورت ہی نہیں بلکہ یہ ہماری سماجی وراثت بھی ہے جس کے بحران نے ہماری انسانیت اور سماجیت کے درمیان بھی بحران پیدا کر دیا ہے۔ ماحولیات اور انسان کے درمیان کے آپسی رشتے کو بھی عصری مادی ترقی اور صارفیت نے شدت سے متاثر کیا ہے۔ ماحولیات کو نظر انداز کیے جانے کا ہی یہ انجام سامنے آ رہا ہے کہ زمین کی تپش بڑھتی جا رہی ہے اور پانی ہماری پہنچ سے دور بہت دور بھاگتا جا رہا ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے کہ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ پہلے ہر شہر، گاؤں اور قصبوں میں کنواں، پوکھر، تالاب اور ندیاں ہوا کرتی تھیں جس کے وجود کو دھیرے دھیرے ختم کر کے ان پر بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کر دی گئی ہیں۔ جو ندیاں بچ رہی ہیں، ان میں اتنے کوڑے کرکٹ، غلاظت، سیوریج، کل کارخانوں سے نکلنے والے تیزاب اور دیگر اشیاء ڈالی جا رہی ہیں کہ ان ندیوں کا پانی نہ صرف آلودہ اور کثافت بھرا ہے، بلکہ یہ ندیاں، دن بہ دن سطح آب کو کھوتے ہوئے اپنے وجود کو بھی ختم کرتی جا رہی ہیں۔ ایسے حالات میں پانی کی قلت کا ہونا لازمی ہے اور جب ہمارے سماج میں کوئی قلت سامنے آتی ہے تو ہمارے سماج کے سوداگر ایسی قلت کو اپنی تجارتی منفعت کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت دنیا کے بیشتر حصوں میں بند بوتل پانی، جسے منرل واٹر کا نام دیا گیا ہے، وہ عام ہے اور اس کاروبار سے، عالمی بینک کے ایک اندازے کے مطابق آج دنیا بھر میں پانی کی فراہمی کا سالانہ کاروبار ایک کھرب ڈالر کے قریب پہنچ چکا ہے جو بلاشبہ عہد حاضر میں دنیا کا سب سے بڑا تجارتی کاروبار بن چکا ہے۔

پانی کی قلت کے بڑھتے عالمی مسئلہ کے مدنظر اس کے تدارک کے لیے اقوام متحدہ نے 22/مارچ 1993 سے ہر سال 22/مارچ کو 'عالمی یوم آب' کے نام سے منسوب کیا ہے تاکہ زندگی سے جڑے اس اہم مسئلے پر غور و فکر اور تدارک کے لیے لائحہ عمل تیار کیا جائے لیکن افسوسناک پہلو یہ ہے کہ پانی کے سوداگروں نے امیروں کے لیے منرل واٹر مہیا کرا کر اس مسئلے کو غریبوں تک محدود کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غریب لوگ اپنی ضروریات زندگی کے لیے کوسوں دور سے پانی لانے یا پھر گندے پانی پینے پر مجبور ہیں۔ جس کے باعث شرح اموات میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ غریب لوگ شہروں میں پوری پوری رات سرکاری نلوں میں پانی کے آنے کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں، اور بیشتر جگہوں پر پانی کے سوداگروں کے جب پانی سے بھرے، ٹینکر محلوں اور قصبوں میں پہنچتے ہیں اور اس وقت جس طرح پانی کے حصول کے لیے مرد، عورتوں اور بچوں کے درمیان آپادھاپی مچتی ہے اور مارا ماری ہوتی ہے، وہ نظارہ یقینی طور پر شرمسار کر دینے والا ہوتا ہے کہ انسان اپنی بے حد بنیادی ضرورت کے لیے کس طرح ایک دوسرے سے پانی جھپٹ لینا چاہتا ہے۔ پانی کے حصول کے لیے ہونے والے جھگڑوں میں

اب تک کئی اموات بھی ہو چکی ہیں۔

پانی کی قلت سے نبرد آزما اس اہم اور بہت ہی نازک انسانی مسئلے کی عکاسی اردو ادب میں بھی بڑے ہی مؤثر انداز میں کی گئی ہے۔ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے، اس لیے اس مسئلے کا فنکارانہ اظہار ادب خصوصاً اردو افسانہ میں بھی کیا گیا ہے۔ اس وقت چونکہ میرا موضوع اردو افسانوں میں پانی کی قلت کا مسئلہ ہے، اس لیے میں افسانوں کے حوالے سے ہی گفتگو کروں گا۔

پانی کے مسئلے کو ہمارے بہت سارے اردو کے افسانہ نگاروں نے مختلف عنوانات اور جہات سے پیش کیا ہے۔ مثلاً پانی کے مسئلے کو ہم آج اس شدت سے محسوس کر رہے ہیں، لیکن ہمارے اردو افسانے کے امام پریم چند نے پیاس کی شدت اور قلت کو اب سے کئی دہائیوں قبل دیکھا، سمجھا اور محسوس کیا تھا، جو آج بھی اسی شد و مد کے ساتھ موجود ہے۔ اس ضمن میں پریم چند کے افسانہ 'ٹھاکر کا کنواں' کا ذکر کرنا چاہوں گا، جس میں قدرت کے انمول خزانہ پانی پر کس طرح بڑی ذات کے لوگوں نے پہرے بٹھا رکھے ہیں، یہاں تک کہ چھوٹی ذات کے لیے مخصوص کنواں میں کوئی جانور گر کر مر گیا ہے اور اس کی سڑاندھ سے پانی آلودہ ہے اور بدبو دے رہا ہے تو بھی گاؤں کی چھوٹی ذات کے بیمار شخص جوکھو کو بڑی ذات کے لیے مخصوص کنواں سے پانی لینے کی اجازت نہیں۔ بیمار جوکھو کی پیاس کی شدت اور اس کی بیوی گنگی کی تڑپ کو پریم چند نے اپنے اس افسانے میں اس کرب کے ساتھ پیش کیا ہے۔

''جوکھو نے لوٹا منہ سے لگایا تو پانی میں سخت بدبو آئی۔ گنگی سے بولا......

یہ کیسا پانی ہے؟ مارے باس کے پیا نہیں جاتا۔ گلا سوکھا جا رہا ہے اور تو سڑا ہوا پانی پلائے دیتی ہے''۔

(افسانہ 'ٹھاکر کا کنواں')

گھر میں پانی ہے نہیں، جوکھو کی بیوی گنگی نے اس پانی کو پینے سے منع کیا کہ سڑا پانی پینے سے بیماری بڑھ جائے گی۔ وہ مضطرب نظر آتی ہے اور رات گئے بڑی خاموشی سے ہمت جٹا کر چپکے چپکے ٹھاکر کے کنواں کے قریب جاتی ہے۔ دھیرے دھیرے کنواں میں ڈول ڈالتی ہے، آہستہ آہستہ ڈول کو رسّی کے سہارے اوپر لاتی ہے، پانی سے بھرا ڈول اب بس اس کے ہاتھ میں آیا ہی چاہتا ہے کہ ٹھاکر کا آدمی باہر نکلتا ہے، کچھ آواز سن کر، تیز آواز میں پوچھتا ہے، ''کون ہے'' اور مارے خوف سے گنگی کے ہاتھ سے پانی سے بھرے ڈول کی رسّی چھوٹ جاتی ہے اور پانی سمیت ڈال کنواں میں ڈوب جاتا ہے۔ گنگی کسی طرح بھاگ کر اور اپنی جان بچا کر گھر پہنچتی ہے تو دیکھتی ہے کہ......

''جوکھو لوٹا منہ سے لگائے وہی میلا گندہ پانی پی رہا تھا۔''

پانی کے لیے غیر منصفانہ اور غیر انسانی سلوک کو پریم چند نے اس افسانہ میں جس طرح غیر معمولی فنی کمال کا مظاہرہ کرتے ہوئے، گاؤں کے ایک غریب اور بیمار شخص کا صاف پانی کے لیے تڑپ اور بے بسی کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کی ہے، اسے پڑھ کر قاری بے اختیار تڑپ اٹھتا ہے۔

پانی پر بٹھائے گئے پہرے اور جبر و ظلم کا فسانہ پریم چند کے عہد سے لے کر عصر حاضر تک کے افسانہ نگاروں کا موضوع اسی کیفیت اور تخلیقی حسن کے ساتھ برقرار ہے۔ معروف افسانہ نگار ابو اللیث جاوید کے افسانہ 'پانی' کا یہ حصہ ملاحظہ کریں:......

''بستی کے کسی بھی کنویں یا ہینڈ پمپ سے ہمیں پانی لینے کی اجازت نہیں تھی، کیونکہ ہم اچھوت تھے۔ ہم گاؤں کے پورب جانب دو میل کے فاصلے پر بہنے والی ایک چھوٹی سی برساتی ندی سے پانی لاتے تھے۔ برسات میں تو پانی آسانی سے مل جاتا تھا مگر اور دنوں میں ندی کی ریت میں دس بارہ فٹ گڑھا کرنے کے بعد جو تھوڑا پانی ملتا، وہی ہم دلتوں کی پیاس بجھاتا تھا............'' (افسانہ 'پانی')

ابو اللیث جاوید نے اپنے اس افسانہ میں پانی پر امیروں اور اونچی ذات کے لوگوں کے ذریعے غریبوں پر بٹھالیے گئے پہروں کے ساتھ ساتھ گاؤں میں پانی کے بڑھتے مشکل حالات کی بڑی بےباک عکاسی کی ہے۔

پانی کی قلت کے مسئلے کو موضوع بنا کر نامور افسانہ نگار کرشن چندر نے بھی ایک بے حد اہم افسانہ 'پانی کا درخت' کے عنوان سے لکھا ہے جس میں انھوں نے اپنے ایک گاؤں کی سوکھتی ندی اور بڑھتی تپش سے ہانپتی زمین کا منظر نامہ اس طرح پیش کیا ہے:

''ہمارے گاؤں میں پانی بہت کم ہے، جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، میں نے اپنے گاؤں کے آسمان کو تپتے ہوئے پایا ہے۔ یہاں کی زمین کو ہانپتے ہوئے دیکھا ہے اور گاؤں والوں کے محنت کرنے والے ہاتھوں اور چہروں پر ایک ایسی ترسی ہوئی بھوری چمک دیکھی ہے، جو صدیوں کی نا آسودہ پیاس سے پیدا ہوتی ہے............''

''مجھے یاد ہے ہماری روپیل ندی سال میں صرف چھ مہینے بہتی تھی، چھ مہینے کے لیے سوکھ جاتی۔ جب چیت کا مہینہ جانے لگتا تو ندی سوکھنا شروع ہو جاتی اور جب بیساکھ ختم ہونے لگتا تو بالکل سوکھ جاتی اور پھر اس کی تہہ پر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے نیلے پتھر رہ جاتے یا نرم نرم کیچڑ............'' (افسانہ 'پانی کا درخت')

اس افسانہ میں راوی اپنے گاؤں کی سوکھتی ندی کے باعث بڑھتی پیاس کی شدت سے ہر وقت ہر لمحہ فکرمند اور مضطرب رہتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں ہر پل اس مسئلے کے تدارک کے لیے آندھیاں سی چلتی رہتی ہیں، کہ ایک شب وہ خواب دیکھتا ہے کہ گاؤں کے مرکز میں ایک بہت بڑا درخت کھڑا ہے یہ درخت سارے کا سارا پانی کا ہے۔ اس کی جڑیں، شاخیں، پھل، پھول، پتیاں سب کی سب پانی کی ہیں اور اس درخت کی شاخوں سے بھی پانی ابل رہا ہے اور یہ پانی گاؤں کی بنجر زمین کو سیراب کر رہا ہے۔

جب خواب سے بیدار ہوتا ہے تو وہ اپنے اندر بے پناہ انبساط اور خوشی محسوس کرتا ہے اور اپنی اس خوشی میں شامل کرنے کے لیے وہ اپنے ابا سے اس خواب کو بیان کرتا ہے۔ لیکن ابا جہاندیدہ شخص ہیں، وہ پورا خواب سننے کے بعد کہتے ہیں۔

''اس خواب کا چرچا کر کے اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ سوکھی ندی ہمیشہ سوکھی رہے گی اور پیاسے سدا پیاسے رہیں گے۔'' (افسانہ 'پانی کا درخت')

کرشن چندر نے اپنے اس افسانہ میں جس مخصوص لب و لہجہ اور منفرد اسلوب میں گاؤں کے لوگوں کی پیاس کی شدت کو جگایا ہے اور ایک خواب کے ذریعہ مختلف تشبیہات اور استعارے کے ساتھ بے بسی اور پیاس کو بجھانے کی کوشش کی ہے، وہ کرشن چندر کو اس خاص مسئلہ کی پیش کش میں ایک خاص مقام عطا کرتا ہے۔

لوگوں کی بڑھتی پیاس کو کس طرح صارفیت، اپنی گرفت میں لیتی ہے، اس کا بڑا ہی مؤثر اظہار خدیجہ مستور کے افسانہ 'ہینڈ پمپ' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اپنے اس افسانہ 'ہینڈ پمپ' میں خدیجہ مستور نے دکھایا ہے کہ ایک غریب خاتون اپنی بے بس زندگی گزارنے کے لیے ایک امیر گھر میں ملازمہ کے طور پر کام کرتی ہے، لیکن جب اس گھر میں، اس غربت زدہ عورت کی ضرورت نہیں رہتی ہے تو اس کی تمام پریشانیوں اور بے بسی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے ملازمت سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ جس کے بعد اس غریب عورت کے سامنے زندگی گزارنے کے تمام راستے مسدود نظر آتے ہیں۔ وہ جسمانی طور پر

نہایت نحیف اور ناتواں ہو چکی ہے۔ پریشانی کے عالم میں اس کے ذہن میں ایک خیال آتا ہے اور وہ اس پر عمل کرتے ہوئے اپنے گھر میں ایک ہینڈ پمپ کسی طرح لگا لیتی ہے اور اس ہینڈ پمپ کا پانی فروخت کرا کے اپنے فاقہ کو دور کرتی ہے۔ اس عورت کے اس عمل کو لوگ بُرا سمجھتے ہیں، لیکن زندگی کے سنگلاخ سفر پر چلنے کے لیے وہ عورت ایسا کرنے پر خود کو مجبور پاتی ہے۔

پانی کی بڑھتی قلت اور اس قلت سے پانی کے سوداگر کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں، اس کا اظہار گلزار نے اپنے افسانہ 'اوور' میں بڑے معنی خیز انداز میں کیا ہے، یہ اقتباس ملاحظہ کریں.........

''ابھی یہاں تو ریگستان ہی میں جا کر جنگل کرآتے ہیں۔ ریت بھی کام آجاتی ہے اتنا پانی یہاں کہاں ملے گا؟ تو نہانے دھونے اور کھانے پینے کو کہاں سے آتا ہے پانی؟

''پائپ لائن تو ہے صاحب جی، لیکن کنٹرول تو جسمیلر میں ہے۔ یہاں آتے آتے پورا نہیں پڑتا۔ اس لیے پانی کے ٹینکر منگانے پڑتے ہیں۔ ٹھیکیداروں کا دھندا پانی بھی چلتا رہتا ہے۔'' (افسانہ 'اوور')

اس افسانہ میں گلزار نے پانی کے مسئلے کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ پانی کا کاروبار کرنے والوں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی ایک مشہور نظم میں گنگا ندی کے تعلق سے کہا تھا کہ گودی میں کھیلتی ہیں، اس کی ہزاروں ندیاں۔ لیکن افسوس کہ گنگا کی گود میں کھیلنے والی ہزاروں ندیوں کا وجود دھیرے دھیرے ختم ہوتا جا رہا ہے۔ خود گنگا اپنے وجود کو کن مشکلوں سے بچائے ہوئی ہے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ گنگا کی گود سے ندیاں نکل گئیں، اب اس کی گود میں دنیا جہاں کی غلاظتیں اور کثافتیں بھری پڑی ہیں اور اس کا تقدس بھی پامال ہو رہا ہے، گنگا کے اس کرب کا اظہار مشہور افسانہ نگار جوگندر پال نے اپنے افسانہ ''گنگا نے تم سے کیا کہا تھا'' میں اپنے منفرد اسلوب میں اس طرح کیا ہے۔

''ہاں فائدہ تو ماں سے ہی پہنچتا ہے۔ سوکھے میں ذرا ذرا بہتی ہے کہ بچے نہا دھو کر سیراب ہوتے رہیں۔''

اس جملے کے بعد جوگندر پال گنگا کی وسعت قلبی کے ساتھ انسانوں کی گنگا کے تئیں ناقدری کو اس طرح افسانوی حسن کے ساتھ بیان کرتے ہیں.........

''شاید وہ کہنا چاہتی تھی، لیکن کسی کے پوتے نے اپنے دادا کی ہڈیوں کے پھول اس کی جھولی میں ڈال دیے اور وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوگئی ....'' (افسانہ 'گنگا نے تم سے کیا کہا تھا')

گنگا میں بڑھتی آلودگی اور روز بروز اس کے سمٹتے وجود پر بنی جوگندر پال کا یہ افسانہ یہ احساس کراتا ہے کہ گنگا اپنی تمام تر کربناکیوں کو سمیٹے ہوئے، اپنی پامالی کے باوجود انسانی خوشیوں کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی ہے، زبان پر کوئی حرف شکایت نہیں۔

گنگا ندی کی عظمت، اس کی خوبصورتی، اس کے بانکپن، اس کی مدھر اور مترنم سرگوشیوں اور اس کی طغیانی اور سرشاری کے اعتراف کے بعد عہد حاضر میں اس کی بڑھتی کثافت اور آلودگی کے ساتھ ساتھ اس کے سمٹتے وجود پر راقم الحروف (سیّد احمد قادری) کا بھی ایک افسانہ بہ عنوان 'درد گنگا کا' کافی پسند کیا گیا ہے۔ جس میں افسانہ کا میں گنگا کی ان جملہ اوصاف کو بیان کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہونے والے سلوک پر اظہار افسوس کرتا ہے۔ جس کے جواب میں گنگا اپنی بے بسی کو بڑے کرب سے بیان کرتی ہے۔ اس افسانہ کا آخری اقتباس دیکھیے:

''میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی......تم واقعی مہان ہو گنگا، جو سارے زمانے کی کثافتوں کو اپنے وجود کے اندر سموئے لے رہی ہو اور تمہیں تو اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ.............

میری بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ گنگا درد بھری آواز میں گویا ہوئی۔

مجھے اپنے ختم ہوتے وجود اور اپنی ماند پڑتی شادابی کی فکر نہیں، مجھے تو اس بات کا غم ہے کہ جو لوگ مجھے امرت سمجھ کر ہونٹوں سے لگاتے ہیں، ان کے لیے میں کہیں وش نہ بن جاؤں..........'' (افسانہ 'درد گنگا کا')

دراصل گنگا کے پانی کو ہندو مذہب میں اس قدر مقدس سمجھا جاتا ہے کہ جو شخص مرنے سے قبل گنگا جل گرہن کرے گا، وہ سیدھا سورگ میں جائے گا۔ لیکن افسوس کہ عہد حاضر میں گنگا کے مذہبی تقدس کا بھی لوگوں کو احساس نہیں ہے اور اس کی آلودگی میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

پانی کے بغیر حیات انسانی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسلم سماج میں مرنے والے کا غسل ضروری ہے۔ لیکن جہاں پانی، پینے تک کو میسر نہ ہو، وہاں میت کا غسل کیسے ممکن ہے۔ اس کرب کو طاہر محمود نے اپنے افسانہ 'پانی کا جبر' میں اس انداز سے بیان کیا ہے کہ قاری درد و غم میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ 'پانی کا جبر' دراصل بلوچستان کے خانہ بدوشوں کی پریشان حال زندگی پر بنی

افسانہ ہے جس میں ان لوگوں کی بے بس اور بے کیف زندگی اور بہت ساری ضروریات اور سہولیات کی عدم فراہمی کے ساتھ ساتھ پانی کی قلت کو بھی بڑے ہی دردانگیز لیکن فنکارانہ حسن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ خاص طور پر اس افسانہ میں پانی کے مسئلہ کو طاہر محمود خاں نے ایک الگ روپ دیا ہے۔ تصویر کے اس رُخ کو دیکھیے..............

''میں سوچ رہا تھا کہ صبح کی پہلی خبر رضائی کی بیوی کی موت ہوگی۔ اس کی موت سے زیادہ مجھے اس کی تجہیز وتکفین کی فکر رہی۔ کیونکہ اس کھلے صحرا میں کوئی ایسا انتظام نہیں تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ بیڈشیٹوں سے یہ کام لیا جاسکتا ہے، لیکن شریعت کا خیال آیا کہ ہم اتنے مہینوں سے ان پر سو رہے ہیں۔ لازماً یہ نجس ہوئے ہوں گے۔ صاف پانی پینے کو نہیں، بھلا بیڈشیٹوں کو کیسے دھویا جائے اور میت کو کیسے غسل دیا جائے گا۔'' (افسانہ 'پانی کا جبر')

افسانہ 'پانی کا جبر' میں اس تلخ حقیقت کی اس تصویر کو دیکھنے کے بعد انسانیت کراہ اٹھتی ہے کہ ایک جانب ہم اپنی غرض میں اس طرح آئے دن پانی کو برباد کر رہے ہیں اور دوسری طرف میت کے غسل کے لیے پانی میسر نہیں ہے۔

پانی کی عدم دستیابی کے عالم میں انسان کس طرح تڑپتا اور بے چین ہوتا ہے۔ اس کا بڑا کربناک منظرنامہ واقعہ کربلا، آبِ زم زم اور عہد حاضر میں پانی کی بڑھتی آلودگی اور سوکھتی ندی، گندے تالاب کے حوالے سے اسلم جمشید پوری نے اپنے افسانہ 'پانی اور پیاس' میں پیش کیا ہے۔ درج ذیل اقتباس میں پانی کی قلت کے باعث موت قریب نظر آتی ہے........

''اب اس کی گھبراہٹ میں خوف در آیا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اگر اور تھوڑی دیر میں پانی نہ ملا تو شاید اس کی جان نہ چلی جائے۔ وہ کیا کرے اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا.... اس کے جسم کی طاقت، سوراخ زدہ غبارے کی مانند نکلی جارہی تھی۔ ہاتھ، پاؤں میں دم نہیں تھا، حلق خشک ہو چکا تھا جیسے دور تک صحرا ہی صحرا ہو، سورج کی تپش بھی شدید ہو اور پانی کا کہیں نام نہ ہو.... آج اُسے پانی کی اہمیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اُس نے کبھی اپنے کمرے میں پانی بھر کر نہیں رکھا۔ کبھی جگ میں رکھ لیا، کبھی گلاس بھر کے.....بس.....ایسا تو علم نہیں تھا کہ بات یہاں تک آجائے گی....'' (افسانہ 'پانی اور پیاس')

حالات کی چیرہ دستی اور جبر وظلم نے کشمیر، جو کبھی ارض جنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں کے پانی کو نہ جانے کتنے خوبصورت نام دیے گئے ہیں۔ وہاں کے

پانی کی قیمت کیا ہو سکتی ہے، اس کااندازہ اس وقت ہوتاہے ،جب انسان پیاس کی شدت سے تڑپتا ہے، بے قراراوربے چین ہوتاہے اوراسے محسوس ہوتاہے کہ مزید تھوڑی دیراسے پیاس بجھانے کے لیے پانی نہ ملا تو اس کی زندگی ختم ہوجائے گی،ایسے حالات میں زندگی پر بن آتی ہے تو وہ اپنی ساری دولت کے بدلے ایک گلاس کیا، پانی کے چند ہی بوند حاصل کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس امرکا اظہار، احمد رشید (علیگ) کے افسانہ 'دھوئیں کی چادر' میں موجود ہے۔اس افسانہ کاایک کردار اپنے دوست سے اس طرح مخاطب ہے۔

آبشار اور جھرنوں کے خوبصورت نظارہ کو جنت کے نظارہ کا نام دیا گیا تھا۔ لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ وہاں کی فضا میں بارود کی مہک رچی بسی ہے تو پانی میں شورے کی آمیزش ہے۔ اس تلخ حقیقت کا اظہار دیپک بدکی نے اپنے افسانہ 'ریزہ ریزہ حیات' میں بڑے خوبصورت پیرائے میں کیا ہے وہ بتاتے ہیں..........

''نہ ہوا میں وہ تازگی رہی تھی اور نہ پانی میں مٹھاس۔ ہوا میں بارود کی وہ تیز بدبو بسی ہوئی تھی، جبکہ پانی میں شورے کی تیزابیت گھلی ہوئی تھی..........''

(افسانہ 'ریزہ ریزہ حیات')

دیپک بُدکی نے اپنے اس افسانہ میں، کشمیر کے عصری حالات کے پیش نظر جس طرح گولہ، بارود، بم، گولی کا بے دریغ استعمال ہو رہا ہے اور ان کے منفی اثرات جس شدت سے مرتب ہو رہے ہیں، اس سے کشمیر کا قدرتی حسن معدوم ہو رہا ہے اور یہاں کی آب و ہوا زہر آلود ہو رہی ہے۔

پانی کی قیمت کیا ہو سکتی ہے، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے، جب انسان پیاس کی شدت سے تڑپتا ہے، بے قرار اور بے چین ہوتا ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ مزید تھوڑی دیر اسے پیاس بجھانے کے لیے پانی نہ ملا تو اس کی زندگی ختم ہو جائے گی، ایسے حالات میں زندگی پر بن آتی ہے تو وہ اپنی ساری دولت کے بدلے ایک گلاس کیا، پانی کے چند ہی بوند حاصل کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس امر کا اظہار، احمد رشید (علیگ) کے افسانہ 'دھوئیں کی چادر' میں موجود ہے۔ اس افسانہ کا ایک کردار اپنے دوست سے اس طرح مخاطب ہے۔

''..........اگر ہندوستان میں قحط پڑ جائے تو ان حالات میں ایک گلاس پانی کی قیمت تمہاری کل جائداد ہو تو تم کیا کرو گے''؟

اس سوال کے جواب سے پہلے ہی وہ کردار، ایک دوسرا سوال کر دیتا ہے کہ......

''جس جائداد کی قیمت پانی کے ایک گلاس کے برابر بھی نہ ہو، اس پر اتنا غرور کیوں؟

(افسانہ 'دھوئیں کی چادر')

یعنی پیاس کی شدت کے آگے، ساری دولت بے کار ہے۔ زندگی باقی ہی نہیں رہے گی، تو پھر یہ دولت کس کام کی۔

پانی کی قلت کے مسئلے پر اردو میں سیکڑوں کی تعداد میں افسانے لکھے گئے ہیں، پانی کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے، جس سے بہت سارے مسئلے جڑے ہوئے ہیں اور ادب، جو کہ حیات وکائنات کا آئینہ ہے تو پھر حیات وکائنات سے تعلق رکھنے والے اس اہم مسئلے کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پانی کے مسئلے کے کئی روپ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک طرف پریم چند کے افسانہ میں پانی پر ٹھاکروں کے پہرے ہیں تو دوسری جانب کرشن چندر کے افسانہ میں Global Warming سے پیدا ہونے والے منفی اثرات اور پانی کی قلت کا فنکارانہ اظہار ہے۔ دیپک بُدکی کے افسانہ میں جہاں بارود کے بڑھتے استعمال سے فضائی آلودگی اور پانی میں گھلتے زہریلے مادے کو موضوع بنایا گیا ہے تو وہیں جوگندر پال کے افسانے میں گنگا ندی کی بڑھتی کثافت کے المیہ کو پیش کیا گیا ہے۔ گلزار کے افسانہ میں پانی کی قلت سے دم توڑتی انسانیت کی چیخ سنائی دیتی ہے تو خدیجہ مستور کے افسانہ میں پانی کی صارفیت کا منظرنامہ ہے۔ ان افسانوں کے علاوہ بھی ہمارے سامنے ایسے بہت سارے اردو کے افسانے ہیں، مثلاً زاہدہ حنا کا 'پانی کے سراب'، سلام بن رزاق کا افسانہ 'ندی'، احسان بلوچ کا افسانہ 'آب مرگ' شموئل احمد کا افسانہ 'منرل واٹر'، انتظار حسین کا افسانہ 'ندی' خورشید حیات کا افسانہ 'پہاڑ ندی عورت' اختر آزاد کا افسانہ 'پانی' اور 'پانی والا انکل' سلمان عبدالصمد کا افسانہ 'دامودر داس' وغیرہ، جن میں پانی کی قلت کے مسئلے کو مختلف عنوانات کے تحت موضوع بنایا ہے۔

■

Dr. Syed Ahmad Quadri
7 New Karimganj
Gaya - 823001(Bihar)

ماحولیات کا تحفظ اور ہماری ذمے داری

پرویز اشرفی

یہ کائنات بنی نوع انسان کے لیے اللہ کی قدرت کا ایک نایاب تحفہ ہے جسے خود انسانوں ہی کے ذریعے دھیرے دھیرے پراگندہ اور آلودہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اب جبکہ اس کے برے اثرات ظاہر ہونے لگے ہیں تو ہم اس کی خوب صورتی، دل کشی اور توازن کو قائم رکھنے کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ ان دنوں ماحولیات کا تحفظ بین الاقوامی سطح پر بھی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ہم نے اس زمین کو جس پر ہم بستے ہیں غلاظتوں اور گندگی کا انبار بنادیا ہے، اس بات سے بے خبر کہ انسانی زندگی اس کے مہلک اثرات کا شکار ہورہی ہے۔ جنگلوں میں درختوں کو اس بے دردی سے کاٹا جارہا ہے کہ اس کے اثرات موسموں پر صاف جھلکنے لگے ہیں۔ ہوا جو سبھی جانداروں کے لیے ضروری ہے وہ کارخانوں کی چمنیوں سے نکلتے دھوئیں، کیمیاوی تجربہ گاہوں سے چھوڑے گئے کچرے اور سڑکوں پر چلتی ہوئی موٹر گاڑیوں کی کثافتوں سے اس قدر آلودہ ہوچکی ہے کہ انسان مختلف قسم کی خطرناک بیماریوں میں گرفتار ہورہا ہے جو اپنے اثرات جلد سے لے کر پھیپھڑے تک پر دکھا رہی ہے جس کی عبرت ناک مثال گزرے دنوں میں 'سارس' نامی بیماری ہے۔ سائنس دانوں نے بہت پہلے اپنی تحقیق سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے کہ اوزون نامی گیس کی پرت جو سورج کی شعاعوں میں موجود الٹراوائلٹ شعاعوں کے مضر اثرات سے بچاتی ہے اس میں سوراخ ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موسم نے اپنا نظام بدل دیا ہے۔ یہ انسانی زندگی کے لیے خطرناک ہے۔ پانی جو کسی بھی جاندار کے لیے دوسری بنیادی چیز ہے اور جس کے بغیر جانداروں کی زندگی کا تصور ناممکن ہے اسے بھی ترقیاتی دور نے زہریلا بنانے سے گریز نہیں کیا۔ ملک کی سبھی ندیاں، جھیل و تالاب آلودہ ہوچکے ہیں۔ ان کے توسط سے کیمیاوی مادے اور ان کے زہریلے اثرات انسانی جسم میں منتقل ہوکر نئی نئی بیماریوں کا سبب بن رہے ہیں۔ پچھلی دہائی میں کئی قومی جنگیں ہوئیں جن میں آتشیں اور جوہری ہتھیاروں کا کھل کر استعمال ہوا۔ حد یہ ہے کہ لیزر شعاعوں کا بھی استعمال ہونے لگا۔ ایسے ہتھیار نہ صرف انسانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں بلکہ ماحولیات پر بھی مضر اثرات ڈالتے ہیں، ان کی وجہ سے درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے جس کے نتیجے میں ماحولیات کا توازن ہچکولے کھانے لگتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کسی چیز کی حفاظت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب اس کے وجود پر خطرہ منڈلانے لگتا ہے۔ اسی لیے ماحولیات کی اصلاح اور پاکیزگی کو قائم رکھنے کی کوشش اس وقت ہورہی ہے جب کہ ماحول پوری طرح کثیف ہوچکا ہے۔

آج ماحولیات میں کثافت پھیل چکی ہے اور دنیا کے ہر گوشے میں اسے پاکیزہ بنانے کی مہم شروع ہوچکی ہے۔ 1400 سال پہلے قرآن حکیم نے آخری رسولؐ کے ذریعے ماحول کو کثافت سے پاک رکھنے اور فضا کو آلودگی سے بچانے کی تعلیم دی تھی۔ اصولی ہدایات، موثر تعلیمات اور عملی اقدامات تینوں طرح سے ماحولیات کو پاکیزہ رکھنے کی تلقین کی۔ پیغمبر آخر الزماںؐ نے بتایا کہ آسمان وزمین، پہاڑ و جنگل، پرندے اور باغات، وادیاں اور آبادیاں یہ سب کچھ اللہ رب العزت کے متوازن نظام کا شاہکار ہیں۔ آپؐ نے اللہ کے اس پیغام کو انسانوں تک پہنچایا۔ ترجمہ: بے شک آسمان اور زمین کو پیدا کرنے میں، رات اور دن کے بدلتے رہنے میں اور کشتیوں میں جو لے کر چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے کام کی چیزیں اور پانی میں جس کو اتارا اللہ نے آسمان سے، پھر جلایا اس سے زمین کو اس کے مرگئے پیچھے اور پھیلائے اس میں سب قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو کے تابعدار ہے اس کے حکم کا درمیان آسمان و زمین کے۔ بیشک ان سب چیزوں میں نشانیاں ہے عقل مندوں کے لیے۔ (البقرہ: 164)

قرآن مجید کی اس آیت پر غور کریں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا تعلق براہ راست ماحولیات سے ہے۔ آسمان، زمین، سمندر، کشتی، دن و رات، بارش، باغات، ہواؤں کی گردش، حیوانات و پرندوں کی زندگی، بادلوں کا فضا میں تیرنا سب کچھ انسانوں کے سامنے پیش کردیا گیا ہے۔ رسول مقبولؐ نے اللہ تعالیٰ کا یہ سبق بھی انسانوں کو یاد کرایا کہ کائنات میں ان ساری چیزوں کو ایک خاص توازن اور اعتدال سے بنایا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ انسان اس توازن کی حکمت کو علمی اور عملی سرگرمیوں کا موضوع بنائے۔ اس سے فائدہ حاصل کرے۔ اس کا توازن برقرار رکھے اور اس میں خلل نہ ڈالے۔

قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک ایک بات کھول کھول کر بیان فرمادی ہے۔ سورہ الرحمٰن کی اس آیت پر غور کریں ''سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں، بیلیں اور درخت سب سجدہ کررہے ہیں اور اسی نے آسمان کو بلند کیا اور ترازو قائم کی کہ ترازو سے تولنے میں حد سے تجاوز نہ کرو اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور تول کم مت کرو اور اسی نے خلقت کے لیے زمین بچھائی، اس میں میوے اور کھجور کے درخت ہیں جن کے خوشوں پر غلاف ہوتے ہیں اور اناج جس کے ساتھ بھس ہوتا ہے اور خوشبودار پھول، تو اے گروہ جن وانس تم اپنے پروردگار کو کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔'' (الرحمٰن: 12-5)

اب ذرا غور کریں چاند اور سورج کی گردش، پیڑ پودوں کی شادابی آسمان کی بلندی، زمین کی تخلیق، اناج، پھل و خوشبودار پھول کی پیدائش ان نعمتوں کو انسان کے سپرد کرنے کے بعد یہ بھی تعلیم دی گئی کہ یہ سب اللہ کے قائم کیے ہوئے خاص نظام کے تحت چل رہے ہیں۔ ان میں خلل نہ ڈالو بلکہ فائدہ حاصل کرو۔ قدرت کی دی ہوئی نعمت کا استعمال صرف خواہش کے مطابق نہیں بلکہ اللہ کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق کرنے سے توازن کا فائدہ خود انسانوں کو ہی پہنچے گا۔ اگر وہ اس نظام وتوازن میں مداخلت کرے گا تو اس کا نقصان بھی انسانوں کو ہی ہوگا اور اس کے برے اثرات بھی وہی بھگتے گا۔ آج ہم

دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کی انسانی آبادی مختلف قسم کی بیماریوں کا شکار ہے۔

ماحول کے تحفظ کے متعلق پیارے نبیؐ نے یہ خاص ہدایت دی ہے کہ سایہ دار درخت کے نیچے اور راستہ میں گندگی نہ پھیلائی جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قربانی کے دنوں میں ذبح ہونے والے جانوروں کے فضلات سڑکوں اور نالیوں میں بکھرے ہوتے ہیں جس سے گندگی پھیلتی ہے۔ اس کے تعفن سے مہلک بیماریاں پھیلتی ہیں۔ حکم یہ ہے کہ قربانی کے فضلات کو دفن کردیا جائے مگر افسوس کہ ہم رسولؐ کی پیروی کرنے والے تو خود کو کہتے ہیں لیکن اپنے نبی کی اسی ہدایت پر عمل نہیں کرتے۔

آج کا دور اپنی سائنسی ایجادات وتحقیقات کی بنا پر ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ دنیا کا ہر انسان اس سے استفادہ کرنے میں جٹا ہے۔ وقت کی ضرورت بھی یہی ہے، مگر جہاں ترقی عالم انسان کو سہولتیں فراہم کررہی ہے وہیں دنیا میں بسنے والے ہر ایک جاندار انسان، چرند پرند اور پیڑ پودوں کے لیے مسائل بھی پیدا کررہی ہے۔ وہ مسائل ہیں فضا کی آلودگی، جانوروں کی نسلوں کا روپوش ہونا، جس سے ماحولیات کا توازن بگڑ رہا ہے اور ہم اُس کے برے نتائج سے دوچار ہیں۔ آخر یہ عدم توازن کیوں ......کہاں پر ہم سے غلطی ہوئی کہ عالمی سطح پر ہر ایک جاندار اس سے متاثر ہوا؟

ہم اپنے گردو وپیش پر نظر ڈالیں تو ہمیں بہت سی ایسی باتیں ملیں گی جس کے باعث محسوس ہوگا کہ ہم نے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا استعمال کم اور اسراف زیادہ کیا ہے۔ جب کہ اللہ کے رسولؐ نے ایسا نہ کرنے کی ہدایت کی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اُس نے آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں انسانوں کے لیے پیدا کی ہیں۔ ایک اور آیت سورۃ الملک میں خدا کا ارشاد ہے: ''وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو تابع بنایا اور اس کی راہوں میں چلو، اُس کا دیا رزق کھاؤ اور اسی کی طرف تم کو اٹھایا جاتا ہے۔'' اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ رب کائنات نے جو نعمتیں عطا کی ہیں اُس کا استعمال ایک سلیقے کے ساتھ ہو، ضرورت کے تحت کسی چیز کا استعمال توازن کو برقرار رکھنے میں معاون ہوسکتا ہے۔ سورۃ الاعراف آیت 31 میں صاف لفظوں میں ہدایت ہے کہ کھاؤ پیو اور فضول خرچی نہ کرو، کیوں کہ فضول خرچ انسان اللہ کو ناپسند ہے۔ لہٰذا پانی، جنگل، معدنیات، پرندے، توانائی، قدرتی وسائل۔ ان تمام چیزوں کا صحیح استعمال کیا جائے اور اسراف سے اجتناب کیا جائے تو ماحولیات کے بگڑے توازن کو سنبھالا جاسکتا ہے۔ مذکورہ آیت کی روشنی میں اسراف سے پرہیز کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ یعنی قرآن نے بتادیا ہے کہ ماحولیات کے توازن کے لیے انسان کو کیا کرنا ہے، پھر بھی ہم قدرتی وسائل کے بے جا استعمال سے باز نہیں آرہے ہیں۔

ٹیلی ویژن پر پانی کے تحفظ سے متعلق عجیب و غریب اشتہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ روزانہ سبھی ٹی وی چینلوں پر Water Conservation سے متعلق اشتہارات آرہے ہیں تاکہ میڈیا لوگوں تک یہ پیغام پہنچادے کہ پانی کا بیجا استعمال ایک دن دنیا کو بوند بوند پانی کو ترسا دے گا۔ اس لیے پانی کا اسراف نہ ہو۔ اس جگہ بھی قرآن نے واضح کردیا کہ پانی انسان کی بنیادی ضرورت ہی نہیں زندگی کی بنیاد بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''ہم نے تمام جاندار چیزیں پانی سے بنائی ہیں۔'' (الانبیاء: 30) ایک اور جگہ سورہ نور میں فرماتا ہے کہ ہم نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا ہے۔ پانی کو اس کی فطری حالت پر باقی رکھنا اور اس کے استعمال میں بہتر طریقہ اپنانا انسانوں کی ذمے داری ہے تاکہ پانی سے زندگی بخشنے والی صلاحیت ختم نہ ہو۔ پانی میں رہنے والے جاندار بھی زندہ رہ سکیں اور پانی کا استعمال کرنے والے بھی زندگی پاسکیں۔

ہدایت کی یہ روشنی بتارہی ہے کہ پانی کو آلودگی سے بچانا ہمارا فرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیارے نبیؐ نے بھی پانی کو گندہ کرنے یا اُس میں غلاظت پھیلانے سے منع کیا ہے۔

آج ہر خاص و عام کی زبان پر Wild life Conservation کی بات آتی ہے۔ جس کے تحت جنگلی جانوروں کے تحفظ کا ذکر موضوع بحث ہے۔ شیر، چیتا، پینڈا، اس کے علاوہ بہت سے پرندوں کی نسل کی حفاظت و دیکھ بھال پر حکومت بھی زور دیتی ہے۔ اس کے لیے وزارت جنگلات قائم کردیا گیا لیکن بہت کم ہی لوگ جانتے ہوں گے کہ اس امر کی طرف اسلام نے بہت پہلے تاکید کردی ہے کہ جانور انسانوں کی ضرورت اور ماحولیات کی زینت ہیں۔ انھیں انسانوں کے استعمال کے لیے اللہ نے بنایا ہے، اس لیے ان کی نسلوں کا تحفظ عالم انسان کی ذمے داری ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری ہے'' بے شک تمھارا پروردگار شفیق و مہربان ہے۔ اُسی نے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کیے تاکہ تم ان کی سواری کرو، وہ تمھارے لیے زینت و رونق بھی ہیں۔ یہ بات Wild life Conservation کو اہم ثابت کرتی ہے جس میں ان جانوروں کی ضرورت، مقصد اور ماحول کو زینت بتایا گیا ہے۔

ماحولیات کے عدم توازن کی بات چل رہی ہے تو اس ضمن میں بھی غور کرتے چلیں کہ ایسا ہونے کا سبب کوئی ایک نہیں ہے بلکہ مختلف اسباب ہیں۔ جن میں بڑھتی ہوئی آبادی بھی اہم ہے، اس نے رہائش کا مسئلہ پیدا کردیا ہے جسے پورا کرنے کے لیے انسان نے بے دردی سے جنگلوں کا صفایا کردیا۔ حالانکہ سائنسی تحقیق یہ اشارہ کرچکی ہے کہ درختوں کی اندھا دھند کٹائی سے ماحولیات کا توازن بگڑ رہا ہے۔ درخت و پودے ماحولیات کو سازگار اور موسم کو اعتدال پر رکھنے میں معاون ہوتے ہیں۔ لیکن سائنس کے اس علم سے پہلے قرآن حکیم میں اللہ پاک نے ہدایت فرمادی ہے کہ زمین پر ہریالی انسانوں کے لیے کتنی مفید ہے، اسی لیے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے کہا: ''بے ضرورت درختوں کو نہ کاٹیں، کیوں کہ ہرے بھرے درخت انسانوں اور جانورں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔'' سائنس کا تجربہ بتاتا ہے کہ درخت فضا سے زہریلی گیسوں کو جذب کرکے صاف ہوا (Oxygen) خارج کرتے ہیں جو انسان و جانوروں دونوں کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس سائنس کی اصطلاح میں 'درخت انسانوں کے دوست ہیں' مگر یہاں ایک بات واضح کردوں کہ علم سائنس کے ارتقا سے بہت پہلے حضور اکرمؐ نے جنگ میں بھی دشمن کے درختوں کو نہ کاٹنے کا حکم دیا جو ثابت کرتا ہے کہ کوئی بھی علم اللہ کے علم سے بڑا نہیں۔ بیشک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اسی لیے آج ملک کے کونے کونے میں شجر کاری ایک مہم کا درجہ لے چکی ہے۔ پیارے رسولؐ نے بھی شجر کاری کا درس دیا ہے۔

ایک روایت جو حضرت انس بن مالکؓ سے منقول ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا جو مسلمان کوئی پیڑ لگاتا ہے یا کاشت کاری کرتا ہے اور اُس پیڑ پودے سے انسان، پرندے یا جانور پھل یا پتے کھاتے ہیں تو یہ پیڑ لگانے والے کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ پیڑ لگانے پر پیغمبر اسلامؐ نے اتنا زور دیا ہے کہ قیامت تک اس عمل کو کرنے کی ہدایت کی ہے اور فرمایا ہے: ''اگر قیامت کا وقت آجائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کھجور کا پودا ہو اور قیامت برپا ہونے سے پہلے وہ اسے لگا سکتا ہے تو اُسے ضرور لگا دینا چاہیے، کیونکہ اس شجر کاری پر اجر ملے گا۔'' (عمدۃ القاری)

لہٰذا ضروری ہے کہ ماحولیاتی تحفظ کے مشن میں حکومت کی مکمل معاونت کریں اور جہاں بھی شجر کاری کا پروگرام منعقد ہو بڑھ چڑھ کر حصہ لیں تاکہ ملک کے ایک شہری کا فرض ادا کرسکیں۔

■

Parwez Alam
D-321, Dawat Nagar, Abul Fazal Enclave
New Delhi-110025
Mob: 9990129128
Email: Perwezashrafi1955@gmail.com

ساجدہ شروانی

گلوبل وارمنگ اور اس کے نتائج

پچھلی تقریباً ایک صدی کے عرصے میں انسانی کوشش، محنت اور عقل کی بدولت جو عظیم الشان سائنسی اور صنعتی ترقی ہوئی ہے کیا اس کا تصور پہلے کبھی کیا جاسکتا تھا؟ جنوں، پریوں اور دیومالائی کہانیوں کے کردار اور عقل سے پرے تصوراتی واقعات آج حقیقت کا روپ لے چکے ہیں۔ طلسمی قالین جس سے پل کے پل میں طویل ترین فاصلے طے ہو جاتے تھے یا طلسماتی سرمہ جس کے لگانے سے دنیا کے کسی کونے میں ہونے والے واقعات کو دیکھا جاسکتا تھا، آج بدلی شکل میں ہمارے سامنے ہیں فرق ہے تو اتنا کہ گذرے زمانے کی ان کہانیوں کا کوئی خاص اثر ہماری نجی یا اجتماعی زندگی پر نہیں پڑتا تھا سوائے وقتی اور شخصی تفریح کے لیکن، آج کے دور کے حقائق ہماری زندگی پر، ہماری دنیا پر بلکہ اس پورے کرۂ ارض پر اثر انداز ہیں جن کے اپنے فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی۔

آج ہم صنعتی ترقی کے نتیجے میں وقوع پذیر ہونے والے خطرناک اور ہولناک اثرات میں سے گلوبل وارمنگ اور اس کے نتائج پر بات کریں گے۔ یہاں ہمارے ذہن میں یہ سوال اٹھنا فطری ہے کہ آخر گلوبل وارمنگ ہے کیا؟

ہم میں سے اکثر لوگ یہ جانتے ہیں کہ ہمارے آس پاس کی فضا میں تقریباً 78 فی صد نائٹروجن، 20 فیصد آکسیجن اور بقیہ 2 فی صد میں کاربن ڈائی آکسائڈ، آرگن اور پانی کی بھاپ قدرتی طور پر پائی جاتی ہے۔ یہ وہ تناسب ہے جو اس زمین پر زندگی قائم رکھنے کے لیے اور دنیا کا نظام بگڑنے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آکسیجن صرف انسانی ہی نہیں بلکہ ہر ذی روح کی زندگی کی اساس ہے۔ ہر جاندار کو سانس لینے کے لیے اس کی ضرورت ہے اور فضا کی آکسیجن کا سب سے بڑا حصہ جانداروں کے سانس لینے میں ہی خرچ ہوتا ہے۔ آکسیجن کا دوسرا سب سے بڑا استعمال آگ کے جلنے میں ہوتا ہے چاہے کوئلہ جلے یا لکڑی یا پیٹرول اور ڈیزل۔ جنگلوں میں آگ لگنے سے اس علاقے میں آکسیجن کی کافی کمی ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں عملی ماحول میں آکسیجن کی مقدار اور تناسب کم کرتے ہیں اور قدرتی طور پر کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار میں اضافہ۔ پیڑ پودے اور دوسری نباتات جو اپنی نشو و نما کے لیے فضا سے کاربن ڈائی آکسائڈ حاصل کرتے ہیں بدلے میں آکسیجن لوٹاتے ہیں اور ماحول کے قدرتی تناسب کو قائم رکھنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

فضا میں موجود یہ کاربن ڈائی آکسائڈ اور دوسری گیسیں سورج کی روشنی اور گرمی کو سطح زمین تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال پاتیں البتہ زمین سے واپس ہونے والی گرمی کو دوبارہ سے اوپری فضا میں جانے کے رستے میں حائل ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کو واپس زمین پر بھیج دیتی ہیں۔ یہ عمل ٹھیک اسی طرح کا عمل ہے جو گرین ہاؤس کے اوپر پڑی شیشے کی موٹی چادر کا جو گرین ہاؤس کی گرمی کو فضا میں نہیں جانے دیتی۔ یہ عمل Green House Effect کہلاتا ہے اور اس طرح درجہ حرارت میں ہونے والے اضافے کو گلوبل وارمنگ کہا جاتا ہے۔

روز افزوں صنعتی ترقی اور پھیلاؤ کی بدولت لاتعداد صنعتی اکائیوں اور سڑکوں پر دوڑتے بھاگتے لاکھوں کروڑوں Auto mobiles سے نکلنے والے دھوئیں اور کیمیائی مادوں کے اخراج کی وجہ سے ہماری آب و ہوا تیزی سے آلودہ اور کثیف ہوتی جارہی ہے۔ گلوبل وارمنگ کے لیے خاص طور سے ذمے دار کاربن ڈائی آکسائڈ کے تناسب میں برابر اضافہ ہو رہا ہے پچھلے تقریباً ڈیڑھ سو سال میں ہمارے آس پاس کے ماحول میں اس کی مقدار میں 31 فی صدی اضافے کا اندراج کیا گیا ہے کاربن ڈائی آکسائڈ کے علاوہ کاربن مانو آکسائڈ، سلفر ڈائی آکسائڈ، نائٹروجنس آکسائڈ، ہائڈروجن سلفائڈ، پانی اور مختلف قسم کے تیزابوں کی بھاپ کے علاوہ میتھین اور کلورو فلورو کاربنس جنھیں گرین ہاؤس گیسیں کہا جاتا ہے۔ ہمارے آس پاس کے ماحول کی حدت میں زیادہ تیز اضافے کے لیے ذمے دار ہیں۔ ان گیسوں کے علاوہ فضا میں کاربن، دھول مٹی، Silica، سیسا، نکل کیڈمیم، ٹین، سیمنٹ اور Asbestos کے ٹھوس ذرات بھی موجود ہیں اور ہمارے ماحول پر، اور رہن سہن پر برے اثرات ڈال رہے ہیں اور کرۂ ارض میں برابر اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے ایک تجزیہ کے مطابق اگلی صدی کے آتے آتے ہمارے گلوب کے درجہ حرارت میں مزید ڈیڑھ سے

موجودہ دور میں مختلف قسم کی الرجیاں، کھانسی، سر اور بدن درد سانس لینے میں پریشانی، دمے کا بڑھتا مرض، بینائی اور آنکھوں سے متعلق امراض، دل، دماغ اور گردوں کی بیماریاں، کینسر کے Cases میں اضافہ، یاد داشت میں کمی، نیند نہ آنے کی شکایتیں، ذہنی طور پر معذور بچوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہمارے ماحول میں پائی جانے والی آلودگی اور اس کی وجہ سے گلوبل وارمنگ کے اثرات ہیں جن کو ہم چاہیں تو یقینی طور پر کم کرنے پر قادر ہیں۔

چھ ڈگری سینٹی گریڈ کا اضافہ ہوسکتا ہے جو کافی تشویش کا باعث ہے۔ گلوبل وارمنگ کے اثرات مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں سے وقوع پذیر ہورہے ہیں۔ موسم میں شدت، کہیں زیادہ بارش، کہیں زیادہ گرمی، کہیں زیادہ آندھیاں اور طوفانی ہوائیں۔ کہیں زیادہ سیلاب اور کہیں قحط سالی گلوبل وارمنگ کے ہی نتائج ہیں 1930 کے مشہور Dust Bowl حالات جس نے سوویت یونین، کناڈا اور مغربی امریکہ کے درمیان سرسبز وشاداب علاقوں کو یکا یک ریگستانوں میں تبدیل کردیا تھا۔ اسی گلوبل وارمنگ کا کرشمہ تھے۔ جسے مصنوعی آب پاشی اور سینچائی بھی قابل کاشت نہ بنا سکی۔ اور جس کا سامنا عالم انسانیت کو کرنا پڑ رہا ہے اور کیوں نہ کرنا پڑے کیونکہ ان سب کی ذمے داری بھی انسان ہی پر ہے جو آنکھیں بند کیے ترقی کی راہ پر دوڑا چلا جا رہا ہے، بغیر اس بات کا احساس کیے کہ ہماری اس دوڑ کے کیا اثرات ماحول پر پڑ رہے ہیں اور کس طرح ان سے بچا جاسکتا ہے۔

گلوبل وارمنگ کا براہ راست اثر دنیا میں برف کے ذخائر میں خطرناک حد تک کی کمی ہونا ہے۔ گذشتہ گرمی کے موسم میں آرکٹک علاقے میں برف کی مقدار میں کافی کمی رکارڈ کی گئی ہے ماہرین کا اندازہ ہے کہ آنے والے 20 یا 30 برسوں میں یہ علاقہ گرمی کے دوران برف سے خالی ہوجایا کرے گا جو انتہائی تشویش کی بات ہے۔

Nature Geo Science نامی میگزین کی اگر مانیں تو انٹارکٹیکا میں بھی برف کے پگھلنے کی رفتار میں 75 فی صد اضافہ ہوا ہے۔ صرف 2006 میں اس علاقے کی 192 ارب من برف پگھل کر پانی ہوگئی تھی یہ مقدار دریائے نیل میں ایک برس کے عرصے میں بہنے والے پانی کی دوگنی مقدار کے برابر ہے جو پگھلنے پر دنیا کے تمام سمندروں میں پانی کی سطح 5 ملی میٹر بڑھ جانے کے لیے کافی ہے ماحولیاتی تبدیلی سے متعلق مطالعہ کرنے والے بین الاقوامی ادارے IPCC کے مطابق 1900 سے 2006 کے درمیان سمندروں کی سطح دس 10 سے بیس 20 سینٹی میٹر اونچی ہو چکی ہے۔ جس کا نتیجہ سمندری طوفانوں، سونامی، کیٹرینا اور ٹورنٹو جیسے حادثات کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ جاپان کی حالیہ تباہی نے پوری دنیا کو بری طرح لرزا دیا ہے۔ IPCC کی ہی آگاہی کے مطابق بائیسویں صدی کے آتے آتے سمندری سطح میں اٹھارہ سینٹی میٹر مزید اضافے کا خطرہ سامنے ہے۔ اور اس سے جو تباہی پھیل سکتی ہے اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو ہی سکتا ہے۔ سمندروں میں موجود ہزاروں چھوٹے بڑے جزائر کا نام و نشان مٹ سکتا ہے۔ ساحلی علاقوں کے زیر آب آجانے سے جان و مال کے زیاں کے بارے میں سوچ کر بھی وحشت ہوتی

ہے قابل رہائش اور قابل کاشت علاقوں کی کمی اور بڑھتی آبادی ایک مستقل مسئلہ ہے۔ یہی نہیں سیکڑوں جانوروں اور نباتات کی نسلیں جو ان علاقوں میں پائے جاتے ہیں ختم ہوسکتی ہیں۔ گلوبل وارمنگ سے سمندری مچھلیوں کی تعداد اور قسموں میں بھاری کمی ہونے کے خطرے کے ساتھ ہی غذا کی کمی سے پیدا ہونے والے مسائل بھی سامنے آئیں گے جن سے نپٹنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔

گلوبل وارمنگ سے جڑا ہوا ایک مسئلہ اوزون گیس کی پرتوں میں سوراخ اور اس کی موٹائی میں کمی کا مسئلہ بھی ہے۔ زمین کی سطح سے تقریباً 15 یا 16 کلومیٹر کی اونچائی پر اوزون نامی گیس کی ایک قدرتی موٹی پرت موجود ہے جو زمین کی فضا کو چاروں طرف سے ڈھانکے رکھتی ہے۔ اور سورج سے نکلنے والی الٹرا وائلٹ ریز Ultra violet rays کو زمین تک پہونچنے سے روکتی ہے۔ اوزون میں سوراخ ہوجائے یا اس کی پرتوں کے پتلے ہوجانے سے یہ Ultra violet rays ہماری دنیا تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکتی ہیں اور زندگی کا خاتمہ کرسکتی ہیں یہ انتہائی خطرناک کرنیں جلد کے کینسر، آنکھوں میں موتیا بند وغیرہ بہت سی لاعلاج بیماریاں تو پیدا کرتی ہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بیماری سے بچاؤ کی قوت اور زمین پر فصل پیدا کرنے کی صلاحیت پر بھی گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ اوزون کی پرت کا ایک اہم کام آکسیجن گیس کو ان کرنوں کے مضر اثرات سے پاک رکھنا اور سانس لینے کے قابل بنائے رکھنا بھی ہے۔ انٹارکٹیکا کے اوپر اوزون کی پرت میں دریافت شدہ سوراخ اگر پھیل جائے تو پوری دنیا کے لیے ایک بڑا خطرہ بن سکتا ہے۔ اوزون کی پرتوں کی موٹائی کمی یا اس کی پرت میں سوراخ ہماری فضا میں موجود آلودگی خاص طور سے وہ آلودگی جس میں کلورین کا عنصر شامل ہونے کے سبب ہوتا ہے ریفریجریٹروں، ائیر کنڈیشنروں مختلف قسم کے خوشبو دار یا بلا خوشبو اسپرے، پلاسٹک فوم سے پیدا ہونے والے Chlorinized کیمیائی مادے اوزون کو ختم کرنے یا نقصان پہنچانے کے ذمے دار ہیں۔ کلورین گیس کا ایک حصہ اوزون کے تقریباً دس ہزار حصوں کو ختم کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ لیکن ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ ان کیمیائی مادوں کا جو اوزون کو ختم کرسکتے ہیں کا استعمال بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے۔

موجودہ دور میں مختلف قسم کی الرجیاں، کھانسی، سر اور بدن درد سانس لینے میں پریشانی، دمے کا بڑھتا مرض، بینائی اور آنکھوں سے متعلق امراض، دل، دماغ اور گردوں کی بیماریاں، کینسر کے Cases میں اضافہ، یاد داشت میں کمی، نیند نہ آنے کی شکایتیں۔ ذہنی طور پر معذور بچوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہمارے ماحول میں پائی جانے والی آلودگی اور اس کی وجہ سے گلوبل وارمنگ کے اثرات ہیں جن کو ہم چاہیں تو یقینی طور پر کم کرنے پر قادر ہیں۔

■

Sajida Shervani
Farsi Cataloger
Rampur Raza Library
Hamid Manzil, Qila Behind Jama Masjid
Rampur - 244901 (UP)

اندھیروں کو مات دینے والی
ہیلن کیلر

سید نوشاد بیگم محمود

انسانی زندگی میں دماغ کا مقام اعلیٰ اور بے نظیر ہے۔ یہ مانتے ہوئے بھی اپنے کند ذہن اور ذہنی طور پر معذور بچوں کے سرپرستوں کے سامنے جو چیلنج ہیں وہ ہیلن کیلر کے والدین کی بہ نسبت کہیں زیادہ سہل ہیں۔ اسی لیے یہ سوانح عمری آپ سب تک پہنچا کر آپ کی کارکردگی میں زبردست لگن، امنگ اور تحریک پیدا کر کے کند ذہن اور معذوروں کے حوصلوں کو دوبارہ بحال کر کے ان کی تیاری اور استحکام کو مزید پائیدار بنا سکتے ہیں اور ہر عام انسان بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ میں مکمل طور پر تندرست و توانا ہوتے ہوئے اس مقام تک کیوں نہیں پہنچ سکتا۔ انسانی حوصلوں کو ایک نیا چیلنج حاصل ہوتا ہے۔ ہیلن کیلر نابینا نوجوان خاتون اس دنیا کو اپنی کھلی آنکھوں سے نہ دیکھ سکتے ہوئے نہ صرف اس کا احساس کرتی ہے بلکہ زندگی میں زبردست چیلنج کا سامنا چالاکی اور شجاعت مندی سے کرتی ہے۔ ہیلن کیلر جیسی بینائی سے محروم شخصیت کی چستی پھرتی اور پر حوصلہ مند زندگی سے ہر کسی کو زندگی کی تحریک کا نیا درس لینے کی ضرورت ہے کیونکہ آنکھوں کے ہوتے ہوئے بھی عظیم خواب نہ ہونا، بینائی سے محروم افراد سے بھی زیادہ بدنصیبی ہے۔

بند آنکھیں نہ کھولے زمانہ اگر
خضر بھی اس کی کیا رو نمائی کرے

''دنیا کی سب سے عمدہ اور خوبصورت اشیا کا احساس بصارت سے نہیں بلکہ بصیرت سے کیا جاتا ہے۔'' یاد آتا ہے یہ دل کو چھو لینے والا قول کس کا ہے؟ بیسویں صدی کو الوداع کہہ کر ستر و سال قبل ہی ہم نے اکیسویں صدی میں پیش قدمی کی شروعات کی ہے۔ سابقہ صدی پر اپنی بے مثال کار آفرینی اور پر اثر شخصیت کی بنا پر جو سکہ جمایا ہے اُن میں سے چند نام شاید زمانے کے تیز رفتار بہاؤ میں دھندلے ہو گئے ہوں لیکن ہیلن کیلر (Helen Keller) کا نام زمانے کی تمام بندشوں کو پھلانگ کر صدی در صدی ہمارے ذہن کے دریچوں میں قائم و دائم رہے گا اور ایک درخشاں ستارے کی مانند آسماں پر چمکتا دمکتا رہے گا۔ اس نابینا، گونگی اور سماعت سے محروم خاتون نے اپنے بے پناہ حوصلے، امنگ اور جوش و ولولے کے باعث دنیا کے تمام معذور افراد کو جو درس دیا ہے وہ ناقابل فراموش بن گیا ہے۔ نہ صرف معذوروں کو بلکہ نسل نو کے پر احساس مضبوط قوتِ ارادی کے مالک اور مستحکم انسانوں کو بھی حیاتِ نو کی جو تحریک بخشی ہے وہ ان کی سوانح عمری بتائے گی۔

بصارت، سماعت اور گویائی سے محروم ایسی تہری معذوری سے جھنجھ دینے والی ہیلن کیلر جن کے لیے اپنی مکمل زندگی وقف کر دینے والی معلمہ کا نام تھا۔ اینی سولیون، خود کی بے پناہ ضد اور اُستانی کے بیش بہا تعاون سے ہیلن کیلر نے تاریکیوں کو شکست دینے والی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ ہیلن کیلر کی ولادت 27 جون 1880 کو جنوبی الواما کے ٹیسکمبیا نامی چھوٹے سے قصبے میں ہوئی۔ بچپن میں ہیلن بھی دیگر بچوں کی طرح ہی نارمل تھی۔ بہت جلد وہ چلنے دوڑنے لگی۔ اپنی فطری معصومانہ حرکتوں سے اُس نے گھر کو مسرتوں سے مہکا دیا تھا۔ وہ بچپن کا دور بہت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا کہ ایک روز کا سورج بہت ہی بھیانک اور سونا طلوع ہوا۔ اور ایک معصوم بچی کے قدموں پر اپنا نشان چھوڑ گیا۔ اسے ایک عجیب و غریب مرض نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شکم اور دماغ میں بہت زیادہ خون کا بہاؤ ہونے کی وجہ سے یہ مرض ہوا۔ یہی

تشخیص ڈاکٹروں نے کی۔ اس جان لیوا مرض سے اس کا بچنا محال تھا۔ یہ سب محسوس کر رہے تھے لیکن اچانک ایک روز ہیلن کو بخار آیا اور اسی طرح خاموشی سے اتر بھی گیا۔ کسی کے تصور میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہاں تک کہ ڈاکٹروں کو بھی سمجھ میں نہیں آیا اس بخار نے ہیلن کو آنکھوں کی بصارت، کانوں کی سماعت اور زبان کی گویائی سے محروم کردیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ اس کے باوجود بچپن کے ابتدائی 19 مہینوں میں ہی سہی ایک طویل سبز جنگل صاف شفاف نیلا آسمان، ہرے بھرے شجر، پھول یہ سب میں نے دیکھے ہیں۔ ان سب کے یادگار نقوش بھی اس کے ذہن اور دل میں بیدار ہوئے۔

ان کی اس تحریک آمیز لیکن محنت، لگن اور جدوجہد سے بھرپور حیات کا سفر اور اس کا خاکہ آپ کے سامنے کس طرح پیش کیا جائے یہ سوال میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔ تب اُن کی سوانح عمری بیان کرنے والی کتاب 'میری زندگی کی کہانی' جس میں تاریکی سے اجالے تک رسائی کرنے والی ہیلن کیلر کے حوصلہ بخش کارناموں سے چند واقعات حاصل کیے جائیں یہ میں نے طے کیا۔

زندگی ڈھالنے والی معلّمہ

استانی صاحبہ نے ہیلن کیلر کو کسی بھی طرح کی کشمکش میں مبتلا کیے بنا ہنستے کھیلتے پڑھائی کروائی۔ عام بچوں کی جانب سے مطلوبہ پڑھائی کروانا کتنا دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے اسے ہم محسوس کرتے ہیں، پھر اس نابینا، گویائی سے محروم لڑکی کو اتنے اونچے معیار کی شخصیت میں ڈھالنا، اُسے عالمی پیمانے پر اتنے اونچے مقام تک پہنچانا کتنی مہارت اور قابلیت کا کام ہوگا۔ اس بات کا تو تصور کرنا بھی محال ہے۔ ہیلن کو اپنے تعلیمی دور کی خوشگوار یادیں اور مسرت کا انمول تحفہ محسوس ہو اس طریقۂ کار کو اپناتے ہوئے این سولین نے یہ تمام کارگزاری انجام دی۔ استانی کی ایک مزید خوبی یہ بھی تھی کہ کسی بھی بات کو خوش کن کہنے کی عادت، سوالات کی بھرمار نہ کرتے ہوئے علم اور سائنس کی معلوماتی باریکیوں کا اظہار کرتے ہوئے تمام موضوعات کو زندگی بخشتے ہوئے اسے دلچسپی کے ساتھ سکھایا۔ صبح جلد بیدار ہوکر اسے قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہونے لے جانا اور ان قدرتی مناظر کو اس طرح بیان کرنا گویا ہیلن اسے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو۔ گھاس اور پھولوں پر پڑنے والی شبنم کا احساس کرواتی۔ گلاب کے خوبصورت پھولوں کی خوشبو، نرم و نازک شاخوں کے تال پر جھومنے والے لیلی کے پھولوں کا رقص، گلوں کے اردگرد اڑنے والی تتلیاں، ان کے پنکھوں کی نازک تھرتھراہٹ اس طرح کا احساس ہم میں سے کتنے افراد محسوس کرتے ہیں؟ یہ سب احساس ہیلن کو محسوس کراکے اس کی زندگی کو شادابی عطا کی۔ ندی پر، ساگر پر لے جاکر خوشگوار ماحول میں، گفتگو کے انداز میں تاریخ کا درس دیا۔ ریاضی جیسا خشک موضوع بھی موتیوں کی مالا اور موتیوں کا استعمال کرکے اس کی قوتِ برداشت کو صبر آزما مرحلے سے گزرتے ہوئے سکھایا۔

تعلیمی اور ادبی میدان میں شرکت

بوسٹن کی 'پارکسن' انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے وہ تھوڑی بہت گفتگو کرنا سیکھ گئیں۔ بعد ازاں انھوں نے تحریری کام بھی شروع کیا۔ وہاں اس معاملے کو لے کر انھیں بحث و مباحثے کے بھنور میں پھنسنا بھی پڑا۔ دیگر زبانوں کا بھی انھوں نے مطالعہ کیا۔ مزید تعلیم نیویارک کے رائٹ ہیومرون اسکول میں ہوئی۔ 1986 میں انھوں نے کیمبرج اسکول میں داخلہ لیا۔ کئی طرح کی جدوجہد کرکے 1990 میں وہ ریڈکلف کالج کی طرف رجوع ہوئی۔ کالج کی تکنیکی تعلیم سے وہ تھوڑا ناراض تھیں۔ یہاں ادبی میدان میں کسی کارکردگی کو عمل

> **گلاب کے خوبصورت پھولوں کی خوشبو، نرم و نازک شاخوں کے تال پر جھومنے والے لیلی کے پھولوں کا رقص، گلوں کے اردگرد اڑنے والی تتلیاں، ان کے پنکھوں کی نازک تھرتھراہٹ اس طرح کا احساس ہم میں سے کتنے افراد محسوس کرتے ہیں؟ یہ سب احساس ہیلن کو محسوس کراکے اس کی زندگی کو شادابی عطا کی، ندی پر، ساگر پر لے جا کر خوشگوار ماحول میں، گفتگو کے انداز میں تاریخ کا درس دیا، ریاضی جیسا خشک موضوع بھی موتیوں کی مالا اور موتیوں کا استعمال کرکے اس کی قوت برداشت کو صبر آزما مرحلے سے گزرتے ہوئے سکھایا۔**

دخل نہیں تھا۔ وہاں انھیں روحانی سکون میسر نہ ہوسکا اور ادب کی تشنگی باقی رہ گئی۔ ان کے شیکسپیئر پڑھانے والے استاد بڑے عالم فاضل تھے۔ ان کی تعلیمی قابلیت کو دیکھتے ہوئے ہیلن کو محسوس ہوا جیسے درحقیقت شیکسپیئر ہی مل گئے ہوں۔ اس قدر اطمینان وہاں انھیں میسر ہوا۔ غریبی، امیری کے مابین کا فاصلہ اور دوری انھیں اداس کردیتی تھی۔ اداس انسانوں کے یاسیت زدہ اور پھیکے چہرے، سخت مشقت کی بنا پر ہاتھوں کے گھٹے اور نشان کھردرے ہاتھ دل پر کاری ضرب کرتے ہیں۔

سماجی تعاون

ہیلن کیلر نے بہت سفر کیا اور ان کے قائم کردہ 'امریکن فاؤنڈیشن فار بلائنڈ' نامی ادارے کے لیے اور خواتین کے حقوق کے لیے تحریک جاری کرکے بہت فلاح و بہبودی کے کام انجام دیے۔ ان کی زندگی پر تیار کی گئی فلم میں اینی سولین اور ہیلن کیلر کے کردار کو ادا کرنے والی دونوں فنکاروں کو آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1994 میں انھیں 'پریسیڈنٹ میڈل فار فریڈم' نامی امریکہ کا سب سے عظیم شہری کا اعزاز عطا کیا گیا۔ ایک شخص نے ان سے پوچھا۔ نظر کی محرومی کی بہ نسبت کوئی بڑی بدقسمتی ہے کیا؟ جس کا جواب انھوں نے اس طرح دیا۔

''نظر ہو لیکن جس کے سامنے عظیم خواب نہ ہوں۔ یہ آنکھوں کی محرومی سے زیادہ بدقسمتی ہے۔''

ہم اگر چاہیں تو پتھر پہ اگا سکتے ہیں پھول
آج مشکل نہیں صحرا کا گلستاں ہونا

■

Syed Naushad Begum Mahmood
Sri Darshan Apartment B/203 Shastri Nagar
Mumbai, Puna Road, Kalwa - 400605
Distt.: Thana (MS)

اندھیرے کا دھواں

مصنف: نجیب محفوظ
مترجم: محمود عالم صدیقی

"نجیب محفوظ کا شمار موڈرن زمانے کے بہت بڑے عرب ادیبوں میں کیا جاتا ھے۔ وہ 1912میں مصر میں پیدا ہوئے اوروھیں 2006میں ان کا انتقال ھوا۔انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد تخلیقی سفر کا آغاز کیا اور اپنی ادبی تخلیقات کی وجہ سے عالمی شھرت حاصل کی۔ناول نگاری میں ان کا اعلیٰ مقام ھے۔ انھوں نے تقریباً 39ناول لکھے۔ ان کے ناول"اولاد حارتنا" کو 1988میں نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ناول نگاری کے علاوہ انھوں نے افسانہ نگاری میں بھی شھرت حاصل کی۔ ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد انیس ھے۔ ان کے افسانے ان کے ناولوں سے کسی طرح کم نھیں ھیں۔انھیں افسانوں میں سے ایک افسانہ "دخان الظلام"یعنی"اندھیرے کا دھواں" جو ان کے افسانوی مجموعہ" القرار الاخیر"یعنی" آخری فیصلہ" سے ماخوذ ھے، کا ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ھے۔ اس افسانہ میں انھوں نے رمزیہ اسلوب اختیار کرتے ھوئے یہ بتانے کی کوشش کی ھے کہ انسان اس دنیا میں آ کر اپنے حقیقی گھر کا راستہ بھول گیا ھے اور دنیا کی بھیڑ میں پریشانی کے عالم میں بھٹک رھا ھے۔جس سے نجات صرف الله کی طرف رجوع کرنے سے ھی ھو سکتی ھے۔یہ افسانہ ان کے عالمی تخیلات اوررمزیہ اسلوب کا عمدہ نمونہ ھے۔"

ایام شباب کے خوش آئند سفروں میں سے ایک سفر میں میں نے اپنے آپ کو پایا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ دن خفیف سردی کے ایام میں سے ہے۔ جس میں آسمان صاف ہوتا ہے اور سورج زمین سے قریب ہوتا ہے۔ ہم لوگ حسب وعدہ میدان میں آئے اس حقیقت کے باجود کہ موت نے ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی رنگین تھیلیاں تھیں جو کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی تھیں اور کھانے اور پینے کی چیزوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ہم لوگوں نے آہستہ آہستہ ہنستے ہوئے میدان کی ان شرقی حدود کو پار کیا جو خالی جگہ کی طرف جا رہی تھیں۔ جہاں پانی کے چشمے، کھجور اور حنا کے درخت موجود تھے۔ حسب عادت ہم لوگ کھانے، پینے، رقص اور بات چیت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ رقص و سرور سے ہم تھک گئے۔ پھر شام کے وقت ہم لوگ خالی تھیلیوں کے ساتھ میدان کی طرف واپس ہونے لگے۔ اب سورج افق کی طرف مائل ہو چلا تھا اور سرد ہوا کے خوش گوار جھونکے چلنے لگے تھے۔ ہم لوگوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا اور تمام دوست احباب اپنے اپنے گھروں کے راستے کی جانب چل پڑے۔

میں نے اپنے گھر کے قریب پہنچ کر میدان میں تھوڑی دیر کے لیے اطمینان کی سانس لی، جہاں میں نے اس راستے میں دن کے اس آخری حصہ میں راہ گیروں کے نہ ہونے کی وجہ سے خود کو لگ بھگ تنہا پایا۔ چنانچہ میں نے اپنے گھر کے راستے کا رخ کیا جو میدان سے ہو کر گزرتا ہے۔ میں بہت زیادہ خوش اور آسودگی کی حالت میں مارکیٹ کی دو لائنوں کے درمیان چلتا چلا گیا جن دو لائنوں میں خرید و فروخت اور صنعت و حرفت کے لیے دکانیں، کمپنیاں اور ورک شاپس موجود تھیں جن سے گاہکوں کی آوازیں ہانڈیوں کے ابلنے اور ہتھوڑے سے لوہے پر مارنے کی مانند نکل رہی تھیں۔ صرف رات میں گاڑیوں کے چلے جانے اور پیسوں کے تجوریوں میں اپنی جگہ لے لینے کے بعد ہی اس نقل و حرکت اور شور و غل میں کمی آتی تھی۔ یہ وہی سڑک تھی جس میں میں پلا بڑھا تھا اور کام کے لائق بنا تھا۔ مجھے اس سڑک کے ہر زاویے پر بہت زیادہ گھومنے کا موقع ملا تھا (یعنی میں اس سڑک کے گوشے گوشے سے واقف تھا)۔ جب میں اس سڑک کے آخری حصہ پر پہنچا تو اچانک میرے سامنے پتھر کی ایک دیوار آ گئی جس سے نکلنے کے راستے کو مضبوطی سے بند کر دیا گیا تھا۔ میں حیران ہوا اور مجھے غصہ بھی آیا اور اپنے آپ سے سوال کیا کہ یہ دیوار کب کھڑی ہوئی؟ اور کون ہیں جنہوں نے اس دیوار کو کھڑا کیا؟ اور اس کے پیچھے کون سا مقصد کارفرما ہے؟ پھر میں اپنے اردگرد دیکھنے لگا تو میں نے دیوار کے داہنی جانب ایک شخص کو اپنے خالی آفس، جس میں صرف ایک ٹیلیفون تھا، میں بیٹھا پایا اور جب میں نے اسے غور سے دیکھا تو خوف کی وجہ سے میں اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ شخص اپنے گندے خوفناک چہرے کے ساتھ میری طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ میرے خیالات کو چیلنج کر رہا ہو۔ اس آدمی کی ناک کی جگہ ہاتھی کی طرح ایک چھوٹی سونڈ تھی، اس کی ایک آنکھ کے نیچے ایک سوراخ تھا جو ٹھیک اس کی پیشانی کے درمیان واقع تھا۔ میں نے اپنی نگاہیں جلد ہی پھیر لیں اور اپنے آپ سے سوال کرنے لگا: کیا وہ کوئی انسان ہے یا پھر کوئی جانور؟ اور یہ کس قسم کا جانور ہے؟ اور اس کی نسل کیا ہے؟ مگر میں نے دیکھا کہ لوگ اپنے اپنے کاموں میں منہمک ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا ہے۔ تو ایسی صورت میں مجھ پر مزید حیرت طاری ہوئی اور مجھے اس مکان سے خوف آنے لگا پھر میں نے خود پر کنٹرول کیا اور پوری توجہ اپنے آپ کو اس انوکھی سڑک سے بچانے میں لگا دی جس کو میں غلطی سے اپنے گھر کا راستہ سمجھ بیٹھا تھا۔

پھر میں نے اپنے آپ کو دوسری مرتبہ میدان میں پایا جہاں اچانک ایک راہ گیر سے میرا سامنا ہوا۔ میں نے مدد مانگنے کے لیے اس کا راستہ روکا اور اس سے بند راستہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: اس راستہ میں کیا چل رہا ہے؟ مگر اس نے مجھے راستہ روکنے کی وجہ سے غصہ میں دیکھا اور چیختے ہوئے بولا: ہٹو میرے پاس فالتو باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ پھر مجھے ایک طرف دھکیلتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے بعد میں صرف یہی سوچتا رہا کہ جلد از جلد کسی بھی طرح اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ درحقیقت اس سفر نے میرے سر کو چکرا دیا تھا۔ شاید میرا راستہ دوسرا والا ہے۔ میرے دوست احباب کتنے حیرت زدہ ہوں گے جب میں ان سے یہ سب کچھ بیان کروں گا جو میں نے اس راستہ میں دیکھا۔ میں دوسرے راستہ کی طرف

چل دیا۔ یہ پہلے راستہ سے بھی زیادہ تنگ تھا۔ اس راستہ میں میں نے کوئی ایسی علامت نہیں دیکھی جو اس بات پر دلالت کرے کہ یہ میرے ہی گھر کا راستہ ہے۔ اس کے باوجود بھی میں چلتا ہی رہا کیونکہ مجھے اپنی یاد داشت پر بھروسہ نہیں رہا تھا۔ یہ راستہ بھی تقریباً خالی تھا۔ تاہم اس کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے کافی ہاؤس واقع تھے جن میں کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کافی ہاؤسوں سے عجیب وغریب ہوائیں آ رہی تھیں جو دلوں پر سحر کر رہی تھیں۔ ان میں بیٹھے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے نہ وہ سن سکتے ہوں اور نا ہی سمجھ سکتے ہوں۔ اور نا ہی انھیں کسی کام سے سروکار تھا اور نا ہی زندگی سے ان کا کوئی تعلق تھا۔ میں تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا آنے والی مصیبت سے بھاگنے لگا۔ یہاں تک کہ جب میں اس راستہ کے اخیر میں پہنچا تو دوسری مرتبہ پھر میرے قدم جم گئے۔ میری رگوں میں خوف طاری ہو گیا اور مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میں نے دیکھا کہ ہڈیوں کے ڈھانچوں کا ایک گروپ علاقائی رقص کر رہا ہے۔ دراصل یہ موت ہی تھی جو میری آنکھوں کے سامنے بنا موسیقی کے رقص کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں بے ہوش ہو جاتا میں دوڑتے ہوئے واپس ہوا۔ دنیا کو کیا ہو گیا ہے؟ کاش اس بیاباں میں مجھے کوئی پولس مل جائے۔ تاکہ میں اس سے مدد حاصل کر سکوں۔ یقیناً میں اپنے گھر جانے سے قبل پولس تھانے جاؤں گا تاکہ اس جان لیوا مصیبت سے چھٹکارا پا سکوں۔ میدان ایک دوراہ گیر سے خالی نہیں ہوتا تھا لیکن میں نے اس وقت وہ سخت سبق یاد کیا جو مجھے پہلے شخص سے ملا تھا۔ مزید برآں میں اس وقت کسی چیز پر بھروسہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت سب سے بڑا مقصد میرے لیے میرا گھر پہنچنا تھا۔

شاید یہ تیسرا راستہ ہی میرے گھر کا راستہ ہے۔ ضرور میں اسے بھی آزماؤں گا اور باقی سب اللہ کے حوالے۔ بہرکیف یہ ایک زندہ جاوید راستہ ہے جس پر سیکڑوں لوگوں کی آمد ورفت جاری ہے، جسے شاید میں نے بھلا دیا تھا۔ اس راستہ میں ہر اس جگہ جہاں کھایا اور پیا جاتا ہے بیچنے والوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گراہک خالی ہاتھ آ رہے ہیں اور تھیلیوں لفافوں اور کاغذوں سے بوجھل ہو کر واپس ہو رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے مجھ میں تھوڑی سی امید جاگی اور میں تیز تیز قدموں سے امید کے ساتھ چلنے لگا۔ لیکن اے میرے خدا یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ گراہکوں میں سے کوئی اپنے آنسو پوچھتے ہوئے واپس ہو رہا ہے یا پھر کوئی ایسے چیختے ہوئے واپس ہو رہا ہے جیسے کسی نے اسے ڈس لیا ہو یا پھر کوئی آگ کی چنگاری سے کاغذوں کو جلا رہا ہے پھر وہ اپنی انگلیوں کو چوستا ہے تاکہ اسے ٹھنڈا کر سکے۔ (یہ خوفناک منظر دیکھ کر مجھے تکلیف بھی ہوئی اور الجھن بھی۔ لیکن اس صورتِ حال میں بھی میں چلنے سے نہیں رکا۔ میں چلتا ہی رہا یہاں تک کہ راستہ کے آخری سرے میں میں نے ایک سر کا گوشت بیچنے والے کو دیکھا جو اپنی میز پر آدمیوں کے کٹے ہوئے سروں کو بترتیب رکھ رہا ہے۔ یہ خوف ناک منظر دیکھ کر مارے گھبراہٹ کے میری چیخ نکل گئی۔ جس کی وجہ سے وہ دکان دار میری طرف بڑھا اور میرے سر کے ارد گرد منڈلانے لگا۔ جس کی وجہ سے میرا رواں رواں کانپ اٹھا اور میری رگوں میں بجلی دوڑ گئی۔ میں دوڑتے ہوئے ایسے بھاگا کہ پھر میں نے کسی بھی چیز کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ پھر سے میں نے اپنے آپ کو میدان میں پایا ....اے میرے پروردگار..... کیا میں پاگل ہو گیا ہوں؟

اب چوتھے راستہ کے سوائے کوئی اور راستہ نہیں بچا تھا۔ اب کیا ہوگا اگر قسمت نے اس میں بھی دھوکہ دے دیا تو.. پھر میں زور سے چلایا:

دنیا کو کیا ہو گیا ہے؟

ایسے میں ایک غصہ ور شخص مجھ پر یہ کہتے ہوئے چلایا:

تو نے مجھے ڈرا دیا۔ خدا تجھے کبھی معاف نہ کرے۔

میں نے اس آدمی کی طرف معذرت کے ساتھ دیکھا اور آخری راستہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ خدارا میری مدد کیجیے کیونکہ میں پریشان ہوں اور مجھے ایک دوست کی ضرورت ہے۔ پھر اس شخص نے میری طرف شکیہ نظروں سے دیکھا اور کہا مجھے افسوس ہے: اللہ پر بھروسہ رکھو..

وہ شخص مجھ سے دور ہو گیا...اب میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا سوائے یہ کہ میں اپنی قسمت آزماؤں۔ شام ہو رہی تھی اور یہ راستہ بھی میرا راستہ نہیں تھا لیکن مجھے اس بات کی امید تھی کہ شاید یہ راستہ مجھے کسی آبادی تک پہنچا دے۔ یہ ایک بڑی سڑک تھی جس میں چہل پہل اور کافی رونق تھی۔ ممکن ہے کہ آپ اسے عمدہ کافی ہاؤس اسٹریٹ کا نام دیں۔ اس گلی میں کافی ہاؤسوں کے نام بجلی کی لائٹوں سے لکھے گئے تھے جو بیباکی، ایمان داری اور چیلنج کے ساتھ اپنے نام کا اعلان کر رہے تھے۔۔ پاکٹ ماروں کا کافی ہاؤس، جوابازوں کا کافی ہاؤس، فاحشہ عورتوں کے دلالوں کا کافی ہاؤس، رشوت خوروں کا واحد کافی ہاؤس۔ پہلی بار میں مسکرایا۔ ان کافی ہاؤسوں میں جو ہوتا ہے ہو۔ میرے لیے سب سے اہم یہ ہے کہ میں اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ یہ سارے کافی ہاؤس اور ان کے اندر بیٹھے ہوئے لوگ اپنی بے حیائی کے ساتھ بھاڑ میں جائیں۔ میں تیز تیز قدموں سے آگے کی جانب بڑھا جنھیں امید اور شوق قوت بخش رہی تھی۔ پہلی بار میں نے سڑک کے کنارے کچھ ایسا دیکھا جس نے میرے قلب کو مطمئن کیا اور سکون بخشا۔ میں نے سیکورٹی گارڈوں میں سے ایک کو ایک خوف ناک آدمی کے ماتحت پایا۔ اس وقت مجھے کسی طرح کا شک نہیں ہوا کہ میں تھوڑی سی چنگی لینے والا ہوں جس کا مقصد تادیب ہے۔ میں خوشی سے چلایا: خدا آپ سب کی حفاظت کرے۔ کیا آپ لوگوں کو علم ہے کہ ان دیگر راستوں میں کیا ہو رہا ہے۔

یہ جملہ کہتے ہی مجھ پر بہت ساری سرد نگاہیں پڑیں جو کسی مصیبت اور برائی کی آمد سے ڈرا رہی تھی۔ اس وقت میرے دماغ میں یہ خوف داخل ہوا کہ شاید وہ لوگ مجھے گرفتار کر لیں۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کی شناخت سے متعلق میرے دل میں شکوک وشبہات داخل ہو گئے۔ چنانچہ میں وہاں سے بنا رکے دوڑ کر بھاگا اور مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ اب میرے پاس بچاؤ کا کوئی دوسرا راستہ نہیں بچا ہے۔

میں حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا جس سے نجات کی میرے اندر طاقت بھی نہیں تھی۔ اب یہ میدان ظاہری طور پر خالی نہیں تھا۔ اس کے چاروں جانب بہت سارے لوگوں کے سایے موجود تھے۔ پراسرار آوازوں نے اس کی فضا کو بھر دیا تھا۔ پھر ان سے نعرے ظہور پذیر ہونے لگے۔ جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے غصہ والی، دھمکانے والی اور گھٹاٹوپ اندھیرے میں لڑنے کے لیے بالکل تیار آوازیں۔ مجھے خطرے کا اندیشہ ہوا۔ اور اس وقت میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا سوائے میری خالی تھیلی کے۔

یہ تمام لوگ کہاں سے آئے؟ اور کیا چاہتے ہیں؟ کیا یہ لوگ دوست ہیں یا پھر دشمن؟ کیا یہ لوگ خلا سے آئے ہیں یا پھر وحشی سڑکوں سے۔ پھر ان نعروں کے بیچ دوسری آوازیں آنے لگیں جن میں گندے گانے، دینی غزلیں اور فوجی موسیقی شامل تھی۔ جس کی وجہ سے میرا سینہ تنگ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ میری جان گھٹنے لگی۔ اور مجھ پر بربادی، نقصان اور مایوسی کا احساس غالب ہونے لگا۔ مارے غصہ کے میں نے اپنی تھیلی سے اپنے سر پر زور سے مارا۔

——

اچانک معجزے کے مانند یہ جہنم ختم ہو گیا اور آزادانہ مملکت جو آسمان میں قائم ہوئی تھی، سے اچانک بیداری نازل ہو گئی، جس بیداری میں روشنی، مٹھاس، سلامتی، اطمینان، خوشی اور آرام شامل تھی۔ جو محبت اور خوشحالی کی بشارت دے رہی تھی... میں نے اپنی نگاہوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا کہ افق اپنے چمکیلے سورج کی کرنیں بکھیر رہا ہے۔

■

Dr. Mahmood Alam Siddiqui
Assist. Prof. of Arabic
Satellite Campus of Kargil
University of KashmirKargil

اردو مشینی ترجمے کا آغاز و ارتقا

اے ایم کے صدیقی

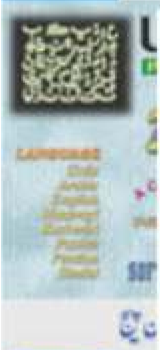

اردو مشینی ترجمہ کی تاریخ بہت مختصر ہے، جس وقت یورپ اور امریکہ بالخصوص جاپان نے مشینی ترجمہ پر تحقیق کے پچاس سال مکمل کر لیے تھے، اس وقت اردو زبان کمپیوٹر کی طرف مائل ہو رہی تھی۔ ترقی یافتہ ممالک میں مائیکرو کمپیوٹر کے آغاز کے ساتھ ہی 1947 میں مشینی ترجمے پر انفرادی کوششوں کا آغاز ہو چکا تھا، جس کا نظریہ ان اقوام میں بہت پہلے سے ہی موجود تھا۔ 1980 میں اردو زبان کا تختۂ کلید (کی بورڈ) منظرِ عام پر آیا جو صرف کمپیوٹر کی مدد سے طباعت میں معاون تھا پھر ان پیج اردو سافٹ ویئر نے اس عمل کو فروغ دیا۔ تاہم 1991 میں اردو یونی کوڈ نظام، مقتدرہ قومی زبان پاکستان کی جانب سے متعارف کروایا گیا جس کے ساتھ ہی اردو زبان کی یونی کوڈ کمپیوٹری تختۂ کلید کو حتمی صورت میں منصۂ شہود پر لایا گیا۔

اسی مرحلے کو اردو کمپیوٹری لسانیات کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اس سے قبل اردو زبان کمپوٹر پر صرف تصویری روپ میں دیکھی جاسکتی تھی مگر اب حقیقی معنوں میں کمپیوٹر نظام کی ایک اکائی بن گئی۔

تفسیر احمد خان جن کی پیدائش کراچی میں 24 اپریل 1975 کو ہوئی، انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے ماسٹر آف کمپیوٹر سائنس کی ڈگری حاصل کی اور مختلف میدانوں میں کئی سافٹ ویئرس بنائے، اور 1999-2001 کے دوران فطری زبان کاری کے نظام کے تحت انھوں نے انگریزی سے اردو ترجمہ فراہم کرنے والے سافٹ ویئر 'اردوان' کی بنیاد رکھی، جو اردو مشینی ترجمہ کی تاریخ کا پہلا سافٹ ویئر ہے اس سافٹ ویر کی تیاری میں صدف علوی آپ کے ساتھ رہیں۔ انھوں نے مشینی ترجمہ کے اس نظام میں منتقلی کے طرز کو اپنایا۔ اس کے بعد 2002 میں ان پیج سے یونی کوڈ میں ڈاٹا کی تبدیلی کا نظام متعارف کروایا۔ اور 2002-2003 کے دوران اردو اور پاکستانی علاقائی زبانوں کے لیے ایک معیاری تختۂ کلید بھی منظر عام پر لایا گیا۔ مقتدرہ قومی زبان پاکستان سے شائع شدہ کتاب 'اردو اطلاعیات' کی جلد دوم میں مشینی ترجمہ کے موضوع پر ایک مفصل انٹرویو شامل کیا گیا ہے۔ جس کا عنوان 'اردو مشینی ترجمہ کے موجد تفسیر احمد سے گفتگو' ہے۔ جس میں انھوں نے مشینی ترجمہ کی تاریخ اور اس کے مسائل، مشکلات، طریقۂ کار، اور اردو کے حوالے سے ان کے ایجاد کردہ سافٹ ویئر میں موجود ڈاٹا وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

اس سلسلے میں بذریعہ ای میل موصوف سے رابطہ پیدا کیا گیا اور اردو کے پہلے مشینی ترجمے کے سافٹ ویئر 'اردوان' کی اولیت سے متعلق پوچھا گیا تو ان کی جانب سے مورخہ 5 جولائی 2016 کو ایک ای میل موصول ہوا

جو یوں تھا: ''بطور محقق اس بات کا دعویٰ کرنا بہت مشکل ہے، لیکن اُردوان سے قبل کوئی سافٹ ویئر تیار کیا گیا اس کے بارے میں میں نے نہیں سنا۔'' اور آپ نے حسبِ وعدہ ایک تحقیقی مضمون بھی ارسال کیا، جس میں اُردو مشینی ترجمہ کے کامیاب تجربے کی جانب اشارہ ہے اور اس میں اردو کے مشینی ترجمہ کے مسائل ومشکلات سے متعلق معلومات بھی دستیاب ہیں۔

اس کے بعد 2003 میں شہزاد خان، محمود مدثر، پرویز ذیشان، مصطفیٰ فواد، حسن اسامہ اور ان کی جماعت نے مل کر نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (این یو ایس ٹی) راول پنڈی، پاکستان میں علم پرمبنی مشینی ترجمے کا نظام پیش کیا جس میں انگریزی اور اردو کے کئی قواعدی نمونے شامل تھے۔

اس مشینی ترجمے کی خاصیت یہ تھی کہ وہ اردو زبان کا رومن رسم الخط کا بھی ترجمہ فراہم کرتا تھا۔ جو سافٹ ویئر ایسے افراد کے لیے مفید تھا جو انگریزی حروف تہجی سے بخوبی واقف ہوں، لیکن انگریزی زبان پر کامل عبور نہ رکھتے ہوں، جس مشینی ترجمے کے نظام سے متعلق مکمل معلومات، ساتویں بین الاقوامی ہمہ موضوعی کانفرنس (آئی، این ایم آئی سی) مورخہ 9-8 دسمبر 2003 کی رپورٹ میں صفحہ نمبر 663-163 پر شائع ہوئی جس کو بعد میں انھوں نے ایکسپرٹ سسٹم کے طور پر بنام 'مترجم' متعارف کروایا۔

2004 میں محمد کاشف شیخ، حسین حیدر، علی خواجہ، محمد مزمل، احمد خان اور ان کی جماعت نے مل کر سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان میں پہلی مرتبہ انگریزی سے اردو (بالعکس) مصنوعی ذہانت کے ذریعے مشینی ترجمہ اور فطری زبان کاری کے نظام پر توجہ دی۔ بالخصوص معیاری یونی کوڈ نظام، مختلف طرح کے فاؤنٹس وغیرہ پر توجہ مرکوز کی گئی۔ جس میں لسانیات کے تحت زبان کے قواعد، نحوی اور صرفی ساختوں کو مدنظر رکھتے ہوئے متن کی تجزیہ کاری اور ترتیب کاری کا عمل انجام دیا جاتا تھا؟ جس سے متعلقہ معلومات بعنوان 'اردو متن کا ترجمہ مع فطری زبان کاری' انجینئرنگ، سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اسٹوڈنٹ کانفرنس میگزین، ص58-18 میں شائع ہوئیں۔

2005 میں محمد عزیر، کاشف بلال، آصف خان، محمد ناصر خان اور ان کی جماعت نے مل کر انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی واہ کینٹ، قائد ایونیو، پاکستان نے 'آغاز' نامی انگریزی-اردو مشینی ترجمہ کا سافٹ ویئر پیش کیا جس میں فطری زبان کاری کے ذیلی زمرے کارفرما تھے اور اس مشینی ترجمہ میں الکٹرانک ڈکشنری موجود تھی اور یہ سافٹ ویئر اصول پرمبنی مشینی ترجمہ کے طرز کا حامل تھا۔ جس میں اُردو اور انگریزی کے قواعد و الفاظ مساوی طور پر استعمال کیے گئے تھے جس میں دستاویزات کے ترجمہ کے دوران ذولسانی قواعد کی پاسداری کی جاتی تھی۔ اور ترجمہ شدہ متن یونی کوڈ میں موجود تھا جس میں مرکب الفاظ کے اظہار، نحوی وصرفی اصول، اور اسم معرفہ وغیرہ کا بہتر حل تلاش کرلیا گیا تھا۔

2009 میں مریم ظفر اور آصف محمود نے مل کر نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (این۔ یو۔ ایس۔ ٹی) راول پنڈی، پاکستان نے مثال پرمبنی متعامل اردو مشینی ترجمہ کا سافٹ ویئر متعارف کرایا۔ یہ اردو انگریزی کا پہلا ایسا مشینی ترجمے کا سافٹ ویئر تھا جس میں مثال پرمبنی مشینی ترجمہ کے طرز کو استعمال کیا گیا تھا۔ جس میں ایک صارف اپنی پسند اور ضرورت کے لحاظ سے ترجمے کا انتخاب کرتا تھا، جس میں بہ محاورہ ترجمے کا مناسب حل موجود تھا۔ اور متن کی تفہیم کے لیے بعض ذولسانی کارپس بھی اس میں موجود تھے۔ جس کی چند تصاویر انٹرنیشنل جرنل آن کمپیوٹر سائنس اینڈ انجینئرنگ،

اردو مشینی ترجمہ کی تاریخ میں ایک بہت ہی بڑا کردار (پیان) پروجیکٹ کا ہے جو ہمیشہ اپنی مسلمہ حیثیت کو برقرار رکھے گا یہ پروجیکٹ ایشیائی زبانوں میں کمپیوٹر کی فراہمی اور آنے والی نسلوں کو مادری زبان میں ٹکنالوجی کی تعلیم فراہم کرنے کی غرض سے ایشیا کے دس ممالک (انڈونیشیا، بنگلہ دیش، بھوٹان، پاکستان، تھائی لینڈ، چین، سری لنکا، کمبوڈیا، لاؤس، منگولیا اور نیپال) کی مشترکہ کوشش تھی جس کی فنڈنگ ایجنسی انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ ریسرچ سنٹر، کینیڈا نے کی تھی

متن جانب مریم ظفر، جلد سوم 2009، 282-275) میں شائع ہوئیں۔

2009 میں آر۔ یم۔ کے سنہا جو آئی آئی ٹی کانپور میں شعبہ کمپیوٹر سائنس اینڈ انجینئرنگ میں پروفیسر ہیں انہوں نے 30-26 اگست 2009، اوٹاوا، کینیڈا میں ایک عربی اسکرپٹ سے متعلقہ ورکشاپ کے دوران، اردو انگریزی بالواسطہ ہندی کے مشینی ترجمہ کے متعلق ذکر کیا اس سافٹ ویئر کی تیاری میں ٹی ڈی آئی یل نے حکومتی سطح پر تعاون کیا اور پروجیکٹ کی ڈاٹا میپنگ پری-ڈیک نویڈا نے کی۔ یہ نظام دراصل محصولہ ہندی ترجمہ کے متن کی میپنگ کرتا ہے جو پی ایل آئی ایل- ہندوستانی زبانوں کے لیے لنگوسیڈ واصول پرمبنی مشینی طرز پر کام کرتا ہے۔

اس کے بعد ہندوپاک میں اردو مشینی ترجمہ پر تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا۔ تاہم 2009 میں ادارہ تحقیقات اردو کی جانب سے انگریزی اردو مترجم سافٹ ویئر کو حکومتی اعانت سے منظر عام پر لایا گیا جس ادارے کے ڈائریکٹر پروفیسر ڈاکٹر سرمد حسین ہیں انھوں نے 1997 میں اسپیچ سائنس میں نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی جن کا کردار، اردو مشینی ترجمہ میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 2004 دسمبر میں 'لوکلائزیشن فوکس' کے زیر عنوان ایک انٹرنیشنل جرنل ایس ڈی ایل (بین الاقوامی مشینی ترجمہ پر کام کرنے والے ادارے) کی جانب سے شائع ہوا جس میں ایک مضمون درجہ ذیل سرخی کے ساتھ شامل کیا گیا تھا۔

'پاکستان میں مقامیانہ: ڈاکٹر سرمد حسین اور ثنا گل پاکستان میں مقامیانے کی صنعت پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔'

اس مجلے میں اردو مشینی ترجمے پر جاری کام کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا گیا ہے۔

'فی الوقت پاکستانی برقی۔ حکومت ایک اردو مقامیانے پاک اردو گورنمنٹ کے پروجیکٹ پر کام کررہی ہے۔ جس کا مقصد انگریزی سے اردو مشینی ترجمہ کی تیاری ہے تاکہ اس کے ذریعے شہری انٹرنیٹ کی مدد سے انگریزی میں دستیاب معلومات کو مقامی زبانوں میں اخذ کرسکیں۔ اس پروجیکٹ کا ایک اور اہم مقصد غیر تعلیم یافتہ اور معذورین کی آبادی کو مقامی زبان میں تقریری نظام کی فراہمی تھا تاکہ لوگ متن کا ترجمہ کے اس نظام سے استفادہ کرسکیں۔ یہ تین سالہ پروجیکٹ جون 2006 میں مکمل کرلیا جائے گا۔'' مگر یہ پروجیکٹ 2009 میں مکمل طور پر منظر عام پر آیا۔

مذکورہ پروجیکٹ کے سلسلے میں حصول معلومات کی غرض سے بذریعہ ای میل آپ سے رابطہ کیا گیا تو انھوں نے جواباً یہ ای میل ارسال کیا۔ جس میں، کچھ لنکس فراہم کیے گئے، ارسال کردہ سافٹ ویئر کی لنک دراصل انگریزی

اردو مترجم کی ہے جو مرکز برائے تحقیقات اردو کی جانب سے منظرِ عام پر آیا جس کو حکومتی حمایت حاصل رہی۔ جس سافٹ ویئر کی شکل ذیل میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

اردو مشینی ترجمہ کی تاریخ میں ایک بہت ہی بڑا کردار (پیان) پروجیکٹ کا ہے جو ہمیشہ اپنی مسلمہ حیثیت کو برقرار رکھے گا یہ پروجیکٹ ایشیائی زبانوں میں کمپیوٹر کی فراہمی اور آنے والی نسلوں کو مادری زبان میں تکنالوجی کی تعلیم فراہم کرنے کی غرض سے ایشیا کے دس ممالک (انڈونیشیا، بنگلہ دیش، بھوٹان، پاکستان، تھائی لینڈ، چین، سری لنکا، کمبوڈیا، لاؤس، منگولیا اور نیپال) کی مشترکہ کوشش تھی جس کی فنڈنگ ایجنسی انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ ریسرچ سنٹر، کینیڈا نے کی تھی، ممکن ہے کہ اس پروجیکٹ میں ہندوستان کو متبادل کے طور پر نیشنل انفارمیشن کمیونیکیشن ٹیکنالوجی ڈیولپمنٹ اتھارٹی، کمبوڈیا کو شامل کیا گیا ہو، اس پروجیکٹ کے تین مراحل رہے جس میں ہر مرحلے کے لحاظ سے الگ الگ اہداف متعین تھے لیکن منشور میں یہ بات طے تھی کے مشینی ترجمے کو بھی فروغ دیا جائے گا۔

جس پروجیکٹ کے سرکردہ محقق پروفیسر ڈاکٹر سرمد حسین صاحب رہے، ذاتی دلچسپی اور تحقیقی مزاج کی بنا آپ نے کئی طلبا کی توجہ کمپیوٹری لسانیات اور لسانی تکنالوجی کے سافٹ ویئرس کی جانب مبذول کروائی جس کے نتیجے میں کئی طلبہ نے ایم سی اے کے تحقیقی مقالات، اردو رسم الخط، اردو صوتیات، اردو قواعد، مشینی ترجمہ، وغیرہ پر جمع کروائے۔ اور مختلف تکنیکی مسائل پر تحقیقات پیش کیں۔ جن کی مفصل رپورٹ، سی ایل ای کے آفیشل ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔

اسی اثنا یعنی 2006 میں ہندوستانی حکومت کی جانب سے مختلف اداروں کے اشتراک سے ایک آن لائن ترجمے کا نظام سمپرک کا آغاز ہوا جس کو 2009 میں تجرباتی طور پر، پنجابی، اردو، تمل، مراٹھی اور ہندی کے لیے پیش کیا گیا۔ جس پروجیکٹ کا ایک حصہ جو اُردو مشینی ترجمہ سے متعلق تھا، آئی آئی ٹی حیدرآباد کے زیر نگرانی مکمل ہوا جس کو پروفیسر ڈاکٹر یوسف زئی کی نگرانی میسر رہی، مشینی ترجمے سے ذاتی دلچسپی کے باعث انھوں نے اردو مشینی ترجمہ پر کام کا آغاز کیا اور یہ جدوجہد آج بھی جاری ہے۔ اس پروجیکٹ کے ڈیولپمنٹ کے دوران ہی میں مرکز برائے تحقیقات اردو پاکستان کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر سرمد حسین صاحب سے اردو زبان کے مشینی ترجمے کے تناظر میں تبادلہ خیال کیا جب وہ دو مرتبہ انٹرنیشنل ورک شاپ کے موقع پر ہندوستان تشریف لائے تھے، پہلی مرتبہ 2007 میں اور پھر دوسری مرتبہ آپ 2008 میں اردو زبان کے مختلف مسائل ومشکلات کے حل کے لیے دونوں اصحاب ایک دوسرے سے رابطے میں رہے۔ تاہم سمپرک کی رسم اجرا سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام صاحب مرحوم کے ہاتھوں 3 مارچ 2010 میں انجام پائی جس وقت اس سافٹ ویئر میں ہندوستانی السنہ کے بشمول اُردو زبان بھی موجود تھی۔

اردو مشینی ترجمہ کو ایک بڑی کامیابی 13 مئی 2010 کو ملی جب گوگل کے مشینی ترجمہ کے صدر فرانز جوزف اوچ نے اس کو اپنے ہمہ جہتی و متعدد لسانی شماریاتی مشینی ترجمہ کے پلیٹ فارم پر متعارف کروایا۔

14 جون 2010 میں غلام رسول طاہر، سہیل اصغر، نیئر مسعود نے مل کر شعبہ کمپیوٹر سائنس، محمد علی جناح یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان نے معلومات پر مبنی اردو مشینی ترجمہ کا سافٹ ویئر متعارف کرایا جس میں متعدد لسانی ساختیات اور لغوی مسائل کا حل تلاش کرلیا گیا تھا۔ اور یہ نظام مکمل طور پر فطری زبان کاری اور کمپیوٹری لسانیات کے ہم آہنگ تھا جو اس وقت تک موجود انگریزی اُردو ترجمہ کار سافٹ ویئرس میں سب سے بہتر تھا۔ جس سے متعلقہ معلوماتی انفارمیشن اینڈ ایمرجنگ ٹیکنالوجیز 2010 بین الاقوامی کانفرنس میں صفحہ 1-5 میں شائع ہوئیں ہیں۔

ایک اور کامیابی 2012 میں ہوئی جب دنیا کی سب سے قدیم مشینی ترجمہ سے وابستہ کمپنی سسٹران نے انگریزی اردو مشینی ترجمہ کا نظام متعارف کروایا۔ پھر اس کے بعد مائیکروسافٹ نے انٹرنیشنل مدر لینگویج ڈے 2013 کے موقع پر جے این یو کے اشتراک سے اردو انگریزی اور مشینی ترجمہ کے پروجیکٹ کی رسم اجرا انجام دی۔ جس پروجیکٹ کے سراہراہ ڈاکٹر گیریش ناتھ جھا، رہیں۔ اس کے ساتھ ہی مختلف مشہور ادارے، اپرتم، ایس ڈی ایل، ایشیا آن لائن، ہیلون، اینڈاکس وغیرہ نے اردو مشینی ترجمہ کو فروغ دیا۔

فی الوقت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ میں مشینی ترجمے سے متعلق بہت ساری تحقیقات جاری ہیں جس کا سہرا شعبے کے صدر ڈاکٹر محمد خالد مبشر الظفر کے سرجاتا ہے جو اس میدان میں اپنی شخصی دلچسپی سے شاندار خدمات انجام دے رہے ہیں اور آپ اردو، انگریزی اور ہندی کے مختلف مشینی ترجمے کے پروجیکٹس کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر محمد جنید ذاکر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ ترجمہ مانو بھی اس میدان میں اپنی نمایاں خدمات کے معترف ہیں، راقم الحروف نے ان دونوں اصحاب کی زیر نگرانی اپنے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کی تکمیل ہے۔

اس مضمون کا مقصد قارئین کو اردو مشینی ترجمے کی مختصر و جامع تاریخ سے روشناس کرانا ہے، جس میں حتی المقدور یہ کوشش رہی کہ اس میدان میں کام کرنے والے ہر ایک ادارے اور افراد کی کوششوں کا احاطہ کیا جائے، موثق وسائل سے جتنی معلومات فراہم ہوئیں ان سبھی کا مختصراً ہی سہی ذکر کیا گیا ہے تاہم اس میدان میں مزید تحقیق کی گنجائش ہے۔

- اردو انگریزی، مشینی ترجمے میں مرکب الفاظ کے اظہار کا طرز، آئی، این۔ ایم۔ آئی، سی مورخہ 8 دسمبر 2003 ص 613 تا 63
- اردو متن کا ترجمہ مع فطری زبان کاری، انجینئرنگ، سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اسٹوڈنٹ کانفرنس میگزین صفحہ 58-18، مورخہ 30 دسمبر 2004
- انٹرنیشنل جرنل آن کمپیوٹر سائنس اینڈ انجینئرنگ، من جانب مریم ظفر، جلد سوم 2009، 282-275
- دی انٹرنیشنل جرنل فارلوکلائزیشن، دسمبر 2004، ص 31

Abu Mazhar Khalid Siddique
12-2-825/7,JILT Ansari Complex, xnd Floor,
Mehdipatnam, Hyderabad-500028 (Telangana)

جھوٹ کی تفتیش

نسیم سعید

اکثر اوقات ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ کسی مخصوص بیتے ہوئے حالات و واقعات کے اظہار کے پیش نظر انسان کے چہرے کا رنگ اُڑ جاتا ہے، بعض اوقات وہ اپنے ہوش وحواس کھو دیتا ہے۔ چہرے کا رنگ پھیکا پڑ جانا، چہرے کے تاثرات بدل جانا، چہرے کے خدوخال اور اُس کے نقوش میں تغیرات کا واقع ہونا اور اُس کے اطوار میں واضح تبدیلیاں نمایاں ہونا اس بات کا اظہار ہے کہ مطلوبہ انسان کسی نہ کسی دلخراش واقعے، حادثے یا سازش کا شکار ہوا ہے، جس کے باعث اس کے جذبات و احساسات متاثر ہوئے ہیں۔ غصّے سے چہرہ سرخ ہو جانا، ڈر سے چہرہ زرد پڑ جانا جیسی کہاوتوں کو ہم بلاشک وشبہ اپنی زبان میں بطور اظہار مقصد کے لیے بخوبی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن کم لوگ ہی اس بات سے واقف ہیں کہ انسان کے جذبات واحساسات بدلنے کے ساتھ ہی اُس کے جسم میں خون کے بہاؤ کی شرح میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ رگِ خون کے بہاؤ کی اس تبدیلی کے سبب چہرے کا رنگ فق ہوتا نظر آتا ہے۔ مختلف جذبات واحساسات کے اظہار کے ماتحت چہرے پر ہونے والی رنگوں کی تبدیلیوں کے باعث مختلف نقوش اُبھر کر سامنے آتے ہیں اور یہ عمل دوران خون کی شرح کے متاثر ہونے سے ہوتا ہے۔

اس کے برعکس چہرے کے رنگوں کی بنیاد پر بھی کسی انسان کے جذبات واحساسات کی شناخت کی جاسکتی ہے۔ عموماً الگ الگ جذبات واحساسات میں انسان کی ناک، بھوؤں (Eyebrow) اور گال کے رنگ بدل جاتے ہیں۔ 75% معاملات میں چہرے کا یہ بدلتا رنگ دیکھ کر کسی انسان کے جذبات و احساسات کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ انسان کے چہرے کے بدلتے تاثرات اور رنگ کا تعلق مرکزی عصبی نظام سے ہوتا ہے۔ جب انسان میں مختلف جذبات پیدا ہوتے ہیں تو پہلا اثر اس کے جسم میں دوڑنے والے خون کی رفتار پر پڑتا ہے۔ یہ اثر زیادہ خوشی یا زیادہ غم، ڈر، غصہ، ندامت اور پشیمانی جیسے جذبات میں دکھائی دیتا ہے۔ ایسی حالت میں مرکزی عصبی نظام جسم کو اشارہ دیتا ہے۔ یہ اشارہ ملتے ہی خون کے دوڑنے کی رفتار اور خون کی ساخت میں جذبات واحساسات کے مطابق فرق نظر آتا ہے۔ فی الحال کسی انسان کا چہرہ دیکھ کر اُس کے جذبات واحساسات کے تعین کرنے والے کمپیوٹر پروگرام پر کام جاری ہے۔ اگر انسان اپنی سانس بھی روک لے، پلک بھی نہ جھپکائے تو بھی یہ پروگرام 90% باریک بینی کے ساتھ اُس کے جذبات واحساسات کو بیان کردے گا۔

اسی طرح خطرناک مجرموں کی شناخت اور اُن کے جرائم کے انکشافات وتصدیق کے لیے پولیس وخفیہ محکمہ کے اعلیٰ افسران و عہدہ داران عموماً نارکو ٹیسٹ (Narco Test) کے تعاون سے مطلوبہ مقدمے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس کی مدد سے بہت سے پوشیدہ پہلوؤں اور مٹ گئے ثبوتوں کو یکجا کیا جاتا ہے۔ لیکن دقّت یہ پیش آتی ہے کہ عدلیہ اُسے ہر معاملے میں قبول نہیں کرتی۔ ملزم بھی اس کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس طرح کے معاملوں یا مقدموں کے فیصلوں میں پس وپیش کا سامنا کرنا عام بات ہے۔ دُنیا کے کئی ملکوں کی عدالتوں نے اس ٹیسٹ کو ناقابل قبول قرار دیا ہے کیونکہ بعض وجوہات کی بنا پر یہ ایک ناقابل اعتبار عمل ہے، جس میں حقوق انسانی کی خلاف ورزی بھی شامل ہے۔ ہمارے ملک میں اس ٹیسٹ کو استعمال کرنے کا مقصد دوسرے ثبوتوں میں مدد حاصل کرنا ہے۔ لیکن اگر ملزم اس قسم کی جانچ پڑتال کے لیے تیار نہ ہو تو زبردستی ایسا کرنا انسانی حقوق کے خلاف ہے۔

عام طور سے الزامات و جرائم کی تصدیق، معاملات کی سچائی، غلط بیانی کے انکشافات اور مٹے ثبوتوں کو اُجاگر و یکجا کرنے کے لیے ملزم پر حسب ضرورت Brain mapping , Narco test یا Polygraph test کیے جاتے ہیں۔ Narco Analysis لفظ Narc سے ماخوذ ہے۔ اسٹیفن ہارسلے (Stephen Horsley) نے پہلی بار نار کو لفظ کا استعمال کیا تھا۔ 1922 میں تجزیہ (Analysis) اس اصطلاح کا رواج تب عمل میں آیا جب رابرٹ ہاؤس ٹیکساس میں ایک ماہر طبیب (Obstetrician) نے دو قیدیوں پر سچ اُگلوانے کے لیے Scopolamine نامی منشیات کا استعمال کیا تھا۔ اس کا کیمیائی نام Hyoscine اور سالمی ضابطہ C17H21NO4 ہے۔

اکثر جھوٹ بولنے کے لیے انسان تصورات، خیالات اور تغیرات کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ بعض معاملات و مقدمات میں ایسی صورت حال کو اُجاگر کرنا ممکن نہیں ہو پاتا۔ اس تفتیش کے دوران ملزم کو نیم بے ہوشی (Semi Concious) کی حالت میں لایا جاتا ہے

جس کے بعد وہ حادثات و واقعات کی صحیح صحیح معلومات دیتا ہے۔ اس جانچ میں ملزم کو سوڈیم پینٹو تھال (Sodium Pentothal) یا Sodium Amytal نامی منشیات (Drug) کا انجکشن دیا جاتا ہے۔ یہ ملزم کی عمر، جنس، صحت اور جسمانی ساخت و حالت کی بنیاد پر دیا جاتا ہے۔ مناسب مقدار میں خوراک نہ دی جائے تو ملزم غیر طبعی نیند (Coma) کی حالت میں داخل ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ منشیات کی بنیاد پر مشتمل جانچ (Drug based test) ہے۔ منشیات کے استعمال کے اثر سے نہ صرف انسان نیم بے ہوشی کی حالت میں چلا جاتا ہے بلکہ اس کی منطقی اور عقلی صلاحیت بھر کام کرنے کے لائق نہیں رہتی۔ ایسے وقت انسان صرف وہی بتاتا ہے جو اس کی یادداشت میں محفوظ ہے یا حقیقت میں ایسا ہوا ہے۔

سچ کا پتہ لگانے کی دوسری جسمانی تفتیش کا نام Brain mapping test ہے۔ یہ P300 wave technique کے نام سے بھی موسوم ہے۔ جب دماغ ایک انسان کو یا اُس کی آواز کو شناخت کرتا ہے تو اس وقت دماغ میں ایک خاص قسم کی برقی لہر پیدا ہوتی ہے جو کہ P300 کہلاتی ہے۔ اس عمل کے دوران اشتعال انگیزی (Stimuli) کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جذبات کو اُبھارنے والی چیزوں، تصاویر اور بعض مخصوص طریقوں کے ذریعے سے دماغ میں چل رہی سرگرمیوں سے یہ سراغ لگایا جاتا ہے کہ کیا ایسا انسان مطلوبہ معاملے سے منسلک کچھ طے شدہ، متعین اور وقوع پذیر اطلاعات یا حادثات یا واقعات سے متعارف ہے۔ اس جانچ میں متعلقہ معاملات و مقدمات سے تعلق رکھنے والے عناصر ERP یعنی دماغ سے نکلنے والی برقی لہروں کی پیمائش کی جاتی ہے۔ یہ لہریں اُسی وقت نکلتی ہیں جب دماغ کسی باہری چیز کو جذب کرتا ہے۔ اس جانچ میں مطلوبہ انسان کے سر پر برقیرہ (Electrode) لگائے جاتے ہیں۔ جو لہروں کی Generation کی پیمائش کرتے ہیں۔ یہ جانچ بالکل الگ اور ایر کنڈیشن والے کمروں میں کی جاتی ہے تاکہ اُس پر باہری ماحول یا کسی بیرونی عناصر کے اثرات مرتب نہ ہوں۔ نارکو اور کثیر نگاری (Polygraph) جانچ کی طرح اس میں بھی ممتحن اور معائنہ کار کے درمیان باہمی ربط ہونا انتہائی ضروری ہے۔ ان کی مدد سے مختلف تحقیقات (Probe) یعنی جذبات کو اُبھارنے والی تصاویر، الفاظ، آوازیں، حادثات، واقعات اور اس سے تعلق رکھنے والی چیزوں کو ڈیزائن کیا جاتا ہے۔ ان Probe کی دو اقسام ہیں۔

(1) موادی تحقیقات Material Probe

(2) غیر جانبداری تحقیقات Neutral Probe

یہ wave Optics کی مدد سے تیار کی گئی تکنیک ہے۔ اس میں دماغ کی الگ الگ تصاویر کی بنیاد پر سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ تمام اقسام کی Neuro imaging دماغ کی پیمائش کا ہی حصہ ہیں۔ Brain mapping میں Data Processing یا Data analysis جیسے افعال کے ذریعے دماغ کے مختلف حصوں کے برتاؤ کا خاکہ کھینچا جاتا ہے۔ اب اس تکنیک میں لگاتار ترقی ہو رہی ہے۔ یہ ایک بھروسہ مند اور قابل اعتماد تکنیک ہے۔ اس سے صحت مند اور غیر صحت مند انسانوں کے دماغ کی یادداشت، سیکھنے اور سمجھنے کی گنجائش، عمر اور منشیات کے اثرات کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔

جھوٹ کا پردہ فاش کرنے کی تیسری تکنیک کا نام کثیر نگاری جانچ (Polygraph Test) ہے۔ اسے Lie Detector test بھی کہا جاتا ہے۔ اس طریقے میں ایک مخصوص مشین کی مدد لی جاتی ہے۔ جس کے ذریعے ملزم سے جوڑے گئے Sensors سے آرہے اشارے (Signal) کو ایک متحرک ترسیمی کاغذ (Movinag graph paper) پر ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ اس تکنیک کے استعمال کے دوران شک و شبہات میں ملوث انسان سے پوچھے جانے والے سوالات کے سلسلوں کی ایک کڑی کے دوران اُس میں ہونے والے جسمانی تغیرات جیسے خون کا دباؤ، نبض کی حرکت، سانس اور جلد میں ہونے والی تبدیلیوں پر مسلسل نظر رکھی جاتی ہے۔ جب مشکوک انسان سوالوں کے غلط یا غیر معتبر جواب دیتا ہے تو اُس کی ان جسمانی سرگرمیوں میں مشاہدہ کیے گئے تغیرات صحیح جواب دیتے وقت ہونے والی تبدیلیوں سے بالکل الگ اور منفرد ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ ایک سینسر پر مشتمل جانچ (Sensors based test) ہے۔ اس test کی تین خاص تکنیک ہیں۔

(1) متعلقہ۔ غیر متعلقہ (Relevent-irrelevant)

(2) منضبط سوالات (Control Question)

(3) ہدایت شدہ جھوٹ پر کنٹرول (Directed lie control)

دراصل اس تکنیک میں جس مشکوک انسان پر جانچ ہوتی ہے اس کے دلوں کی دھڑکن، سانس اور خون دباؤ کے نشیب و فراز کو ترسیم کی صورت میں درج کر لیا جاتا ہے۔ ابتدا میں نام، عمر اور پتہ پوچھا جاتا ہے اور اس کے بعد اچانک اس دن کے خاص حادثے یا واقعہ کے بارے میں تفتیش کی جاتی ہے۔ اس اچانک تفتیشی طریقے سے مشکوک انسان پر نفسیاتی دباؤ پڑتا ہے اور ترسیم میں یہ تغیرات نمایاں اور واضح ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی ہے تو مطلوبہ انسان سے حسب ضرورت کچھ سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ اُن میں چار یا پانچ سوالات اس حادثے یا واقعے سے متعلق ہوتے ہیں۔

اس طرح کی جانچ کے کچھ منفی اور کمزور پہلو بھی ہیں۔ اس جانچ سے قبل ملزم یہ طے کر سکتا ہے کہ اسے کیا جواب دینا ہے۔ جانچ کے بارے میں پوری معلومات قبل از وقت جمع کی جا سکتی ہے اور اُس کی تیاری کی جا سکتی ہے۔ ملزم کے پاس وقت بھی ہوتا ہے اور وہ اُسے ایک تربیت کی صورت میں ہی لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی خود اعتمادی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسے سوچ سمجھ کر جھوٹ بولنے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے۔ یہ پوری جانچ کا عمل مشینوں پر منحصر ہے جس سے اس بات کی کوئی صحیح توقع نہیں کی جا سکتی کہ ملزم سچ ہی بول رہا ہے یا پھر جھوٹ۔ یہ ایک برقی عمل یا کیمیائی تجزیہ ہے۔

لیکن ملک کی عدالت عالیہ نے سائنسی بنیاد پر کی جانے والی تینوں تفتیش Testo polygraph examination، Brain electrical Activation profile (BEAP) اور Narco Analysis کو انسانی حقوق کے تحفظ کی رو سے غیر قانونی، غیر آئینی اور غیر انسانی فعل قرار دیا ہے کیوں کہ عموماً ان اقسام کی جانچ خود کی مرضی سے نہیں بلکہ جبراً اور زیر دباؤ کی جاتی ہیں۔ اس کے ذریعے انسانی جسم اور اُس کے دماغ کے ساتھ غیر ضروری چھیڑ چھاڑ کی جاتی ہے۔ غیر ضروری اور غیر متوقع سوالوں کی کثرت سے ایک غلط پیغام کی زد میں معاشرہ گھر جاتا ہے۔ یہ ایسے سوالات ہوتے ہیں جن کے جوابات ہر اعتبار سے صحت مند انسان بھی نہیں دینا چاہتا۔ ان ہی اسباب کی بنا پر ایسی جانچ کو قانون میں شہریت کے حامل انسانی حقوق کے حق کو چھیننے کے مترادف قرار دیا ہے۔

ہمارے ملک میں موجود قانونِ شہادت یا ثبوت ایکٹ (Evidence Act) کے تحت ان طریقوں سے یکجا کی گئی اطلاعات کو ثبوت تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ اس لیے Lie Detector test انسانی حقوق کا تحفظ، دستور، تکنیک اور سائنسی اصولوں کے استعمال کے درمیان اُلجھا ہوا ایک پیچیدہ اور غیر اطمینان بخش معاملہ میں شمار ہے۔

■

Naseem Sayeed
Rabbani School, Kampti
Distt.: Nagpur (Maharashtra)

نوٹ پیڈ (Notepad)

آپ پڑھ چکے ہیں کہ ونڈوز آپریٹنگ سسٹم میں کئی ایسے کارگر پروگرام موجود ہیں، جو کمپیوٹر کے صارفین (یوزرس) کے لیے بہت معاون ہوتے ہیں۔ ان کی مدد سے ہم بہت سے ایسے کام منٹوں میں کرسکتے ہیں، جن کو کسی دوسرے طریقے سے کرنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ ایسے چند اہم پروگراموں کے نام اور ان کے استعمال کے طریقے ذیل میں دیے جارہے ہیں۔

1۔ **نوٹ پیڈ (Notepad):** یہ ایک ٹیکسٹ (متن) کو ایڈٹ کرنے والا پروگرام ہے۔ اس کی مدد سے ہم بغیر کوئی تیاری کیے ٹیکسٹ فائل بناسکتے ہیں اور ان میں ترمیم واضافہ کرسکتے ہیں۔ اس میں ٹیکسٹ کو فارمیٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور سارا ٹیکسٹ ایک ہی فونٹ اور سائز میں دکھایا جاتا ہے۔

2۔ **ورڈپیڈ (Word Pad):** یہ ونڈوز کا اپنا ورڈ پروسیسنگ پروگرام ہے۔ اس کی مدد سے ہم اپنے پسندیدہ فارمیٹ میں خوبصورت دستاویز تیار کرسکتے ہیں اور ان میں تصویر وغیرہ بھی لگا سکتے ہیں۔ اس میں حروف کو مختلف قسم کے فونٹ اور سائز میں سیٹ کیا جاسکتا ہے۔

3۔ **پینٹ (Paint):** یہ ایک ڈرائنگ بنانے کا پروگرام ہے۔ اس کے ذریعے ہم اپنے کمپیوٹر کی اسکرین پر رنگ برنگی تصویر بناسکتے ہیں۔

4۔ **کیلکولیٹر (Calculator):** یہ عام اور سائنٹفک الیکٹرانک کیلکولیٹر کی طرح کام کرنے والا پروگرام ہے۔ اس کی مدد سے ہم اپنے کمپیوٹر کے مانیٹر پر ہر قسم کے حسابیاتی کام ٹھیک اسی طرح کرسکتے ہیں، جس طرح کسی الیکٹرانک کیلکولیٹر پر کیے جاتے ہیں۔

یہ بھی پروگرام ونڈوز آپریٹنگ سسٹم کے Accessories سب-مینو میں موجود ہیں اور ان سب کو چلانے کا طریقہ بھی ایک جیسا ہے۔ اس باب میں آپ نوٹ پیڈ کا استعمال کرنے کے بارے میں تفصیل سے پڑھیں گے۔ بقیہ تینوں پروگراموں کے بارے میں سلسلہ وار آگے کے ابواب میں تفصیل سے بتایا جائے گا۔

نوٹ پیڈ شروع کرنا (Starting Notepad)

اگر آپ کے ڈیسک ٹاپ پر نوٹ پیڈ کا شارٹ کٹ بنا ہوا ہے، تو آپ اسے ڈبل کلک کرکے فوراً ہی نوٹ پیڈ شروع کرسکتے ہیں۔ اس کو چلانے کا سب سے آسان طریقہ اسٹارٹ مینو کے ذریعے ہے، جو درج ذیل ہے:

- اسٹارٹ بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے اسٹارٹ مینو کھل جائے گا۔
- اسٹارٹ مینو میں 'All Programs' کلک کیجیے۔ اس سے اسٹارٹ مینو میں ایک مینو کھل جائے گا۔
- اس مینو میں 'Accessories' آپشن پر کلک کیجیے۔ اس سے 'Accessories' کے تحت سب-مینو کھل جائے گا۔
- اس سب-مینو میں 'Notepad' آپشن کو کلک کیجیے۔ اس سے نوٹ پیڈ پروگرام شروع ہوجائے گا۔

نوٹ پیڈ پروگرام شروع ہوتے ہی آپ کی اسکرین پر اس کی ونڈو تصویر W-7.1 کی طرح کھل جائے گی، جس میں آپ نئی ٹیکسٹ فائل بناسکتے ہیں یا پرانی ٹیکسٹ فائل کو کھول سکتے ہیں۔

نوٹ پیڈ کی ونڈو کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جن کی جانب نام سے اشارہ کیا گیا ہے۔ ان حصوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

ٹائٹل بار (Title Bar): نوٹ پیڈ ونڈو میں سب سے اوپر کی لائن جس کا ٹائٹل بار ہے، اس میں اس دستاویز یا ڈاکیومنٹ کا کام دکھایا جاتا ہے۔ اگر کوئی ڈاکیومنٹ کھلا ہوا ہے تو اس کا نام بھی اس بار میں بائیں کونے میں دکھایا جاتا ہے، ورنہ 'Untitled' لفظ نظر آتا ہے۔

مینو بار (Menu Bar): ٹائٹل بار کے ٹھیک نیچے مینو

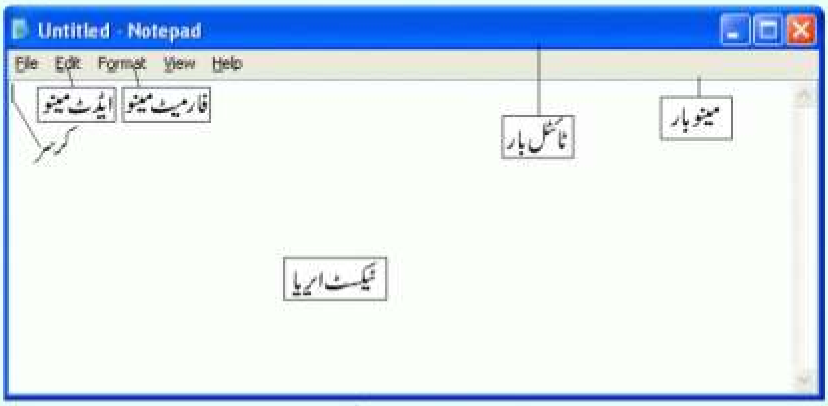

تصویر W-7.1: نوٹ پیڈ کی ونڈو

بار ہوتا ہے، جس میں کئی مینو- نام شامل ہیں۔ ہر مینو- نام (Menu name) ایک پل ڈاؤن مینو سے وابستہ ہے، جس میں کئی آپشن ہوتے ہیں۔

متن کی جگہ (Text Area): اسکرین (ونڈو) کا زیادہ تر حصہ ایک مستطیل (Rectangle) باکس کی شکل میں مینوبار کے نیچے ہوتا ہے، جسے ٹیکسٹ ایریا کہتے ہیں۔ ٹائپ کیا ہوا یا بھرا ہوا متن اسی حصہ میں نظر آتا ہے۔

کرسر (Cursor): ٹیکسٹ ایریا میں ایک کھڑی لکیر (|) کی شکل کا کرسر ہوتا ہے، جس سے کی بورڈ پر ٹائپ کیے جانے والے ٹیکسٹ کے مقام کا اشارہ ملتا ہے۔ آپ تیر کے نشان والے بٹنوں کا استعمال کر کے اس کو ٹیکسٹ ایریا میں اپنی خواہش کے مطابق کسی بھی جگہ پر لے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح ماؤس پوائنٹر کو ونڈو میں کہیں بھی کلک کر کے آپ کرسر کو ایک بار میں ہی وہاں لے جاسکتے ہیں۔

اگر نوٹ پیڈ کی فائل میں ٹیکسٹ زیادہ ہے، جو ایک بار میں اسکرین پر دکھائی نہیں دے سکتا، تو اس ونڈو میں اپنے آپ ہی عمودی (Vertical) اسکرول بار بن جاتا ہے، جس کی مدد سے آپ اوپر نیچے جاسکتے ہیں۔

نوٹ پیڈ پر کام کی شروعات (Getting Started with notepad)

اوپر بتائے گئے طریقے سے نوٹ پیڈ شروع کرتے ہی اس کی خالی ونڈو تصویر W-7.1 کی طرح کھل جاتی ہے۔ آپ اور کچھ کیے بغیر اس میں سیدھے ہی اپنا ٹیکسٹ

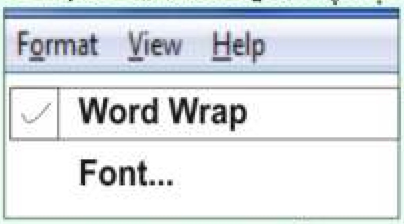

تصویر W-7.2: Format مینو

ٹائپ کرنا شروع کرسکتے ہیں۔ یہ ٹیکسٹ کرسر کی جگہ پر جڑتا جاتا ہے۔ جیسے ہی ونڈو میں ایک لائن بھر جاتی ہے، کرسر اپنے آپ اگلی لائن میں آجاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو رہا ہو تو 'Format' مینو میں 'Word Wrap' آپشن کو کلک کر کے سیٹ کر دیجیے، جیسا کہ تصویر W-7.2 میں دکھایا گیا ہے۔

نوٹ پیڈ میں ٹیکسٹ ایریا میں بھرا یا ٹائپ کیا ہوا سارا ٹیکسٹ پہلے سے سیٹ کیے ہوئے فونٹ اور سائز میں نظر آتا ہے۔ اگر آپ اس فونٹ یا سائز کو بدلنا چاہتے ہیں، تو 'Format' مینو میں 'Font' آپشن چنیے۔ اس سے تصویر W-7.3 کی طرح 'Font' کا ڈائیلاگ باکس کھل جائے گا۔

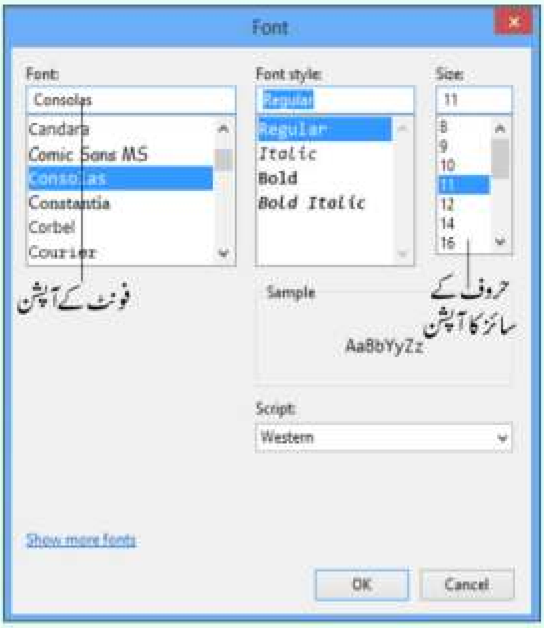

تصویر W-7.3: Font کا ڈائیلاگ باکس

اس ڈائیلاگ باکس میں فونٹ، اسٹائل اور سائز کو چننے کے لیے الگ الگ لسٹ باکس ہوتے ہیں۔ آپ ان میں سے اپنی سہولت کے مطابق کوئی بھی آپشن کلک کر کے چن سکتے ہیں۔ فونٹ چننے کے بعد 'OK' بٹن کو کلک کرنے پر آپ کے ذریعے منتخب کردہ فونٹ لاگو ہو جائے گا اور اگلی بار پھر سے بدلنے تک لاگو رہے گا۔ مشق کے لیے نوٹ پیڈ میں نیچے دیا گیا پیراگراف ٹائپ کیجیے۔

These days, there are very few topics hotter than Internet. In fact, Internet has become the talk of the town these days. Even the presidents, vice-presidents and prime ministers of various countries have put a presence on Internet. You may already have an idea about internet. The simplest definition of Internet is that it is the largest computer network in the world.

جب تک آپ نوٹ پیڈ ونڈو میں لگائے گئے ٹیکسٹ کو ڈسک پر محفوظ نہیں کر دیتے، تب تک وہ صرف میموری میں ہی رہتا ہے۔ اس لیے اس کو محفوظ (سیو) کرنا ضروری ہے۔ اس کے لیے درج ذیل کام کیجیے۔

1۔ مینوبار میں 'File' مینو کلک کیجیے۔

2۔ 'File' کے پل ڈاؤن مینو میں 'Save As' آپشن کو کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی آپ کی اسکرین پر تصویر W-7.4 کی طرح 'Save As' کا ڈائیلاگ باکس نظر آئے گا۔ اس ڈائیلاگ باکس میں اس فولڈر کا نام بتایا جاتا ہے، جہاں نوٹ پیڈ فائل کو اسٹور کرنا ہے۔ ساتھ ہی فائل کا کوئی نام بھی رکھا جاتا ہے۔

3۔ اس ڈائیلاگ باکس کے سب سے اوپر کے لسٹ باکس میں کسی فولڈر کا نام بھریے۔ اگر فولڈر کا نام یاد نہیں آرہا ہے، تو اس باکس کے بائیں جانب نیوی گیشن پین

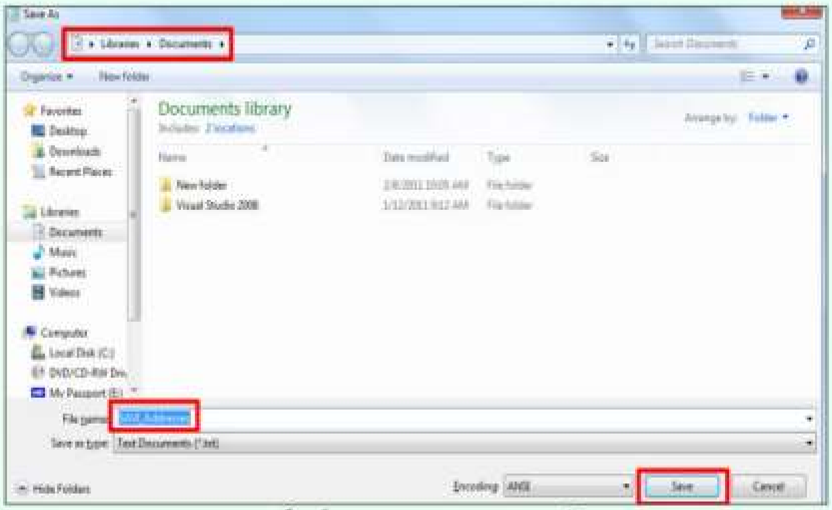

تصویر W-7.4: Save As کا ڈائیلاگ باکس

کے تحت دیے گئے مناسب آپشن پر کلک کیجیے۔ جو بھی فولڈر آپ چنیں گے، وہ لسٹ باکس میں نظر آنے لگے گا اور اس فولڈر میں شامل فائلوں کے نام بیچ میں خالی جگہ پر دکھائی دینے لگیں گے۔ یہاں ہم 'Documents' فولڈر میں ہی اپنی فائل کو اسٹور کر رہے ہیں۔

4۔ اب نیچے 'File name' کے ٹیکسٹ باکس میں اپنی فائل کا کوئی نام ٹائپ کیجیے۔ یہ نام کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ونڈوز آپریٹنگ سسٹم میں کسی فائل کا نام 255 حروف یا نشانات تک کا ہوسکتا ہے اور اس کے بیچ میں خالی جگہیں بھی ہوسکتی ہیں۔ یہاں فائل کا نام آپ درج ذیل کی طرح ٹائپ کیجیے:

My first notepad file

5۔ 'Save' بٹن کو کلک کیجیے۔

اس سے آپ کی فائل بتائے گئے نام سے بتائی گئی جگہ یا فولڈر میں اسٹور کردی جائے گی۔ فائل اسٹور کرتے

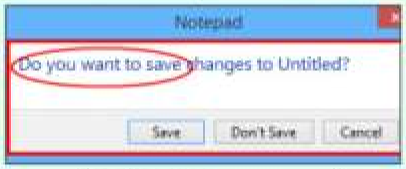

تصویر W-7.5: وارننگ کا ڈائیلاگ باکس

ہی اس کا نام نوٹ پیڈ ونڈو کے ٹائٹل بار میں بائیں جانب نظر آنے لگتا ہے۔

اگر آپ فائل کو اسٹور کیے بغیر اس ڈائیلاگ باکس سے باہر نکلنا چاہتے ہیں، تو کبھی بھی 'Cancel' بٹن کو کلک کر دیجیے۔

نئی فائل بنانا (Creating a New File)

اگر آپ نوٹ پیڈ میں ایک نئی فائل بنانا چاہتے ہیں، تو 'File' مینو میں 'New' ہدایت دیجیے۔ اگر نوٹ پیڈ ونڈو میں ایسا ٹیکسٹ بھرا ہوگا، جسے محفوظ نہیں کیا گیا ہے، تو آپ کو تصویر W-7.5 کی طرح وارننگ کا ڈائیلاگ باکس دے کر اسے محفوظ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ اگر آپ اس دستاویز کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں، تو 'Save' بٹن کو کلک کیجیے، ورنہ 'Dont Save' بٹن کو کلک کر دیجیے۔

اس ڈائیلاگ باکس سے باہر نکلنے پر آپ کی اسکرین پر نوٹ پیڈ کی ونڈو خالی کردی جائے گی، جس میں آپ اپنی خواہش کے مطابق نیا ٹیکسٹ لگا سکتے ہیں۔

کسی فائل کو کھولنا (Opening a File)

اگر آپ پہلے سے اسٹور کی ہوئی ٹیکسٹ فائل میں کچھ اور رد و بدل کرنا چاہتے ہیں، تو ایسا کرنے کے لیے

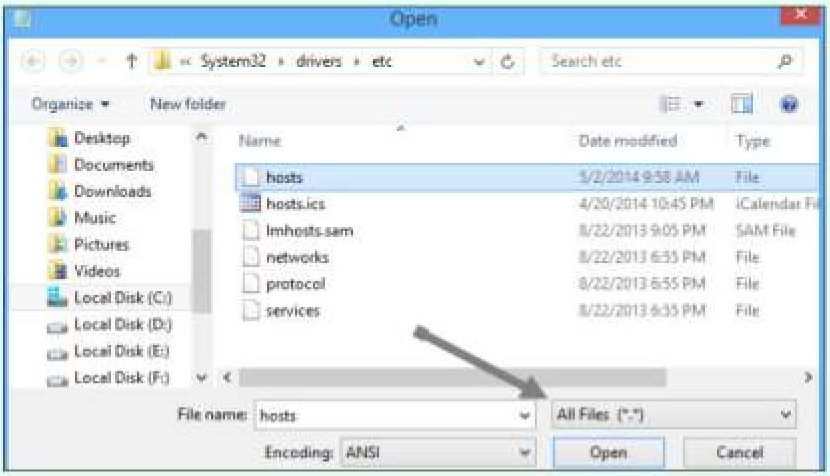

تصویر W-7.6: Open کا ڈائیلاگ باکس

آپ کو اس فائل کو پہلے کھولنا ہوگا۔ اس کے لیے آپ کو اس فائل کا نام اور اس کے فولڈر کا نام بھی معلوم ہونا چاہیے۔ فائل کھولنے کے لیے درج ذیل کام کیجیے۔

1۔ اگر نوٹ پیڈ پہلے سے نہیں چل رہا ہے، تو اسے شروع کیجیے۔ اس سے نوٹ پیڈ کی ونڈو کھل جائے گی۔

2۔ مینو بار میں 'File' مینو کے آپشن کو چنیے۔

3۔ File کے مینو میں 'Open' آپشن کو چنیے۔ اس سے Open کا ڈائیلاگ باکس تصویر W-7.6 کی طرح کھل جائے گا۔ یہ ڈائیلاگ باکس تصویر W-7.4 کے 'Save as' کے ڈائیلاگ باکس سے بہت ملتا جلتا ہے۔ صرف 'Save' بٹن کی جگہ 'Open' بٹن ہے۔

4۔ لسٹ باکس میں فولڈر کا نام بھریے یا بائیں جانب نیوی گیشن پین میں دیے گئے آپشنز میں سے کسی فولڈر کا نام چنیے۔ ایسا کرنے پر آپ کو اس فولڈر میں شامل سبھی ٹیکسٹ فائلوں کے نام بیچ کے سفید علاقے میں نظر آئیں گے۔ اگر اس لسٹ میں اس فائل کا نام نہیں ہے، جسے آپ ڈھونڈ رہے ہیں، تو اس کا مطلب ہے کہ آپ نے فولڈر کا نام غلط دیا ہے یا فائل اس میں نہیں ہے۔

5۔ جس فائل کو آپ کھولنا چاہتے ہیں، اس کے نام کو کلک کیجیے۔

6۔ اب 'Open' بٹن کو کلک کیجیے۔

ایسا کرتے ہی آپ دیکھیں گے کہ اس فائل میں بھرا ہوا ٹیکسٹ نوٹ پیڈ کی ونڈو میں نظر آنے لگا ہے اور اس کا نام ٹائٹل بار میں بھی آ گیا ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ نوٹ پیڈ میں آپ کسی بھی ٹیکسٹ فائل (یعنی ایسی فائل، جس کے نام میں txt. حصہ جڑا ہوا) کو کھول سکتے ہیں، خواہ اسے کسی بھی پروگرام سے بنایا گیا ہو۔ آپ نوٹ پیڈ میں ایسی ٹیکسٹ فائلوں کو ہی کھول سکتے ہیں، جس کا سائز 64 کلو بائٹ سے زیادہ نہ ہو۔ اگر اس سے بڑی ٹیکسٹ فائل کو کھولنا ہو، تو ورڈ پیڈ پروگرام کا استعمال کرنا چاہیے، جس کے بارے میں آپ اگلے باب میں پڑھیں گے۔

نوٹ پیڈ پروگرام میں ایک وقت میں صرف ایک ہی فائل کھلی رہ سکتی ہے۔ اس لیے کوئی نئی فائل کھولنے کے لیے پہلے سے کھلی ہوئی ٹیکسٹ فائل (اگر کوئی ہو) کو محفوظ کرنا یا نوٹ پیڈ کی ونڈو کو خالی کرنا ضروری ہے۔

ٹیکسٹ کو ایڈٹ کرنا (Editing the Text)

نوٹ پیڈ میں کسی فائل میں بھرے گئے ٹیکسٹ کو درست کرنے یا اس میں کوئی تبدیلی کرنے کی کارگر

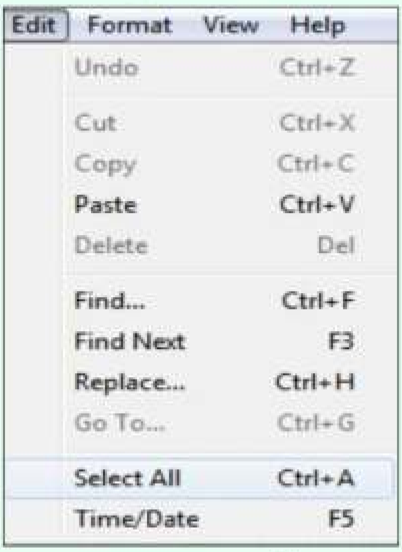

تصویر W-7.7: Edit مینو

سہولیات موجود ہیں۔ اس کے لیے Edit کی مختلف ہدایتوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ مینو W-7.7 میں دکھایا گیا ہے۔ اس میں ٹیکسٹ کو ایڈٹ کرنے کے لیے چار ہدایتیں ہیں۔ ان ہدایتوں کا اثر درج ذیل طریقے سے ہوتا ہے:

Cut: یہ ہدایت دینے سے منتخبہ ٹیکسٹ فائل سے ہٹا کر کلپ بورڈ میں رکھ دیا جاتا ہے۔

Copy: اس ہدایت سے منتخبہ ٹیکسٹ کلپ بورڈ میں نقل کر دیا جاتا ہے۔

Paste: یہ ہدایت دینے سے کلپ بورڈ میں رکھا ہوا ٹیکسٹ کرسر کی جگہ پر نقل کر دیا جاتا ہے۔

Delete: یہ ہدایت دینے سے منتخبہ ٹیکسٹ فائل سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

ان ہدایات کو آپ یا تو Edit مینو سے دے سکتے ہیں یا ان کا شارٹ کٹ اپنے کی بورڈ سے دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر Cut ہدایت کا شارٹ کٹ Ctrl+X ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کنٹرول کنجی کے ساتھ X کنجی دبانے سے یہ ہدایت لاگو ہو جائے گی۔ اسی طرح Copy کا شارٹ کٹ Ctrl+C، Paste کا شارٹ کٹ Ctrl+V اور Delete ہدایت کا شارٹ کٹ Del یا Delete کنجی ہے۔ شارٹ کٹ ہدایتوں کے استعمال سے کام زیادہ تیزی سے ہوتا ہے، اس لیے تجربہ کار صارف مینو کی بجائے شارٹ کی ہدایتوں کا ہی استعمال کرتے ہیں۔

ان میں سے کسی ہدایت کا استعمال کرنے کے لیے پہلے کسی ٹیکسٹ کا انتخاب کیا جاتا ہے اور پھر وہ ہدایت دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر، اگر آپ کسی ٹیکسٹ کو ہٹانا چاہتے ہیں، تو پہلے وہ ٹیکسٹ چن لیجیے اور پھر Delete ہدایت دیجیے۔ اسی طرح دوسری ہدایت کے بارے میں سمجھا جاسکتا ہے۔

کوئی ٹیکسٹ چننے کا طریقہ یہ ہے کہ اس ٹیکسٹ کے شروع میں ماؤس پوائنٹر سے کلک کرکے ماؤس بٹن کو دبا لیجیے اور اسے دبائے رکھتے ہوئے ماؤس پوائنٹر کو دائیں جانب یا نیچے کی طرف کھینچیے۔ آپ جہاں تک ماؤس پوائنٹر کو کھینچ لے جائیں گے، وہاں تک کا ٹیکسٹ چن لیا جائے گا اور وہ الٹے رنگ میں دکھائی دے گا۔ ضروری ٹیکسٹ چننے کے بعد ماؤس بٹن کو چھوڑ دیجیے۔

ٹیکسٹ کو آپ اپنے کی بورڈ کی مدد سے بھی چن سکتے ہیں۔ اس کے لیے پہلے اس جگہ پر کرسر پہنچائیے جہاں سے شروع کرکے آپ ٹیکسٹ چننا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے یا تو اس جگہ پر ماؤس پوائنٹر سے کلک کیجیے یا تیر کے مختلف بٹنوں کا استعمال کرکے اس جگہ تک کرسر کو لے جائیے۔ اب شفٹ کنجی کو دبا لیجیے اور اس دبائے رکھ کر تیر کے بٹنوں کو دبائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ کرسر جہاں تک جائے گا، شروع سے وہاں تک کا سارا ٹیکسٹ چن لیا جائے گا۔ ضروری ٹیکسٹ چن لینے کے بعد شفٹ کو چھوڑ دیجیے۔

ان طریقوں سے آپ ٹیکسٹ کا کوئی بھی حصہ چن سکتے ہیں، جس میں ایک حرف سے لے کر متعدد پیراگراف اور مکمل ٹیکسٹ تک ہوسکتا ہے۔ کلپ بورڈ ایک مستقل جگہ ہے، جہاں پر آخری بار Cut ہدایت دینے پر وہ ٹیکسٹ کرسر کی جگہ پر جوڑ دیا جاتا ہے۔ آپ ایک ہی ٹیکسٹ کو کئی بار اور کئی جگہ Paste کر سکتے ہیں۔ اس ہدایت کو دینے سے پہلے کم از کم ایک بار Cut یا Copy ہدایت دینا ضروری ہے۔

اگر ٹیکسٹ کی ایڈیٹنگ کرتے وقت کوئی غلطی ہو جاتی ہے، جیسے کسی ٹیکسٹ کو غلطی سے Delete کر دیا جاتا ہے، تو آپ Edit مینو کی Undo ہدایت دے کر اس غلطی کو ٹھیک کر سکتے ہیں، یعنی ٹیکسٹ کو واپس لا سکتے ہیں۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ Delete کے فوراً بعد Undo ہدایت دے دیں۔ اس ہدایت سے صرف آخری ایڈیٹنگ کے عمل کو الٹا جاسکتا ہے۔ اس ہدایت کا شارٹ کٹ Ctrl+Z کنجی کے ذریعے ہے۔

مشق کے لیے، اپنی ٹیکسٹ فائل My first notepad file کو کھولیے اور اس میں درج ذیل طریقے سے ایڈیٹنگ کیجیے۔

1- 'Even the presidents... on Internet.' جملہ کو منتخب کیجیے اور اسے Delete ہدایت کے ذریعے ہٹا دیجیے۔

2- ہٹائے ہوئے جملہ کو Undo ہدایت دے کر واپس لائیے۔

3- 'You may already... about Internet.' جملہ کو چن کر Cut ہدایت دیجیے۔

4- ماؤس پوائنٹر سے کلک کرکے کرسر کو 'In fact' الفاظ سے پہلے لائیے اور Paste ہدایت دیجیے۔ اس سے Cut کے ذریعے ہٹایا گیا جملہ وہاں جڑ جائے گا۔

5- 'Internet' کو چن کر Copy ہدایت دیجیے۔ اس سے وہ کلپ بورڈ میں نقل ہو جائے گا۔

6- کرسر کو ٹیکسٹ میں کسی جگہ لگا کر Paste ہدایت دیجیے۔ ایسا تین چار بار کیجیے۔

کسی ٹیکسٹ کو ڈھونڈنا (Searching Text)

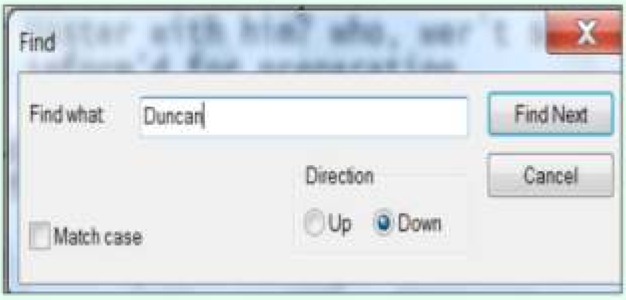

تصویر W-7.8: Find کا ڈائیلاگ باکس

نوٹ پیڈ میں کھولی یا بنائی ہوئی کسی فائل میں آپ کسی ٹیکسٹ (لفظ یا فقرہ) کو آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے درج ذیل کام کیے جاتے ہیں:

1- 'Edit' مینو میں 'Find' ہدایت دیجیے۔ اس سے آپ کی اسکرین پر 'Find' کا ڈائیلاگ باکس تصویر W-7.8 کی طرح کھل جائے گا۔

2- اس ڈائیلاگ باکس کے 'Find What' ٹیکسٹ باکس میں تلاش کیا جانے والا لفظ یا فقرہ ٹائپ کیجیے۔

3- اگر آپ چھوٹے (Small) اور بڑے (Capital) حروف کو الگ الگ ماننا چاہتے ہیں، تو 'Match Case' چیک باکس کو کلک کرکے سیٹ کیجیے۔

4- اگر آپ کرسر کی جگہ سے اوپر کی طرف تلاش کرنا چاہتے ہیں، تو 'Up' ریڈیو بٹن کو کلک کرکے سیٹ کیجیے اور اگر نیچے کی طرف تلاش کرنا چاہتے ہیں، تو 'Down' ریڈیو بٹن کو سیٹ کیجیے۔

5- اخیر میں 'Find Next' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے تلاش شروع ہو جائے گی اور اگر وہ ٹیکسٹ فائل میں ہوگا، تو کرسر وہاں پہنچ جائے گا اور وہ ٹیکسٹ چنا ہوا دکھائی دے گا۔ اگر وہ ٹیکسٹ نہیں ملے گا، تو ایک چھوٹا سا ڈائیلاگ باکس کھل جائے گا، جس میں 'Cannot find' پیغام دیا جائے گا۔

6- تلاش جاری رکھنے کے لیے 'Find Next' بٹن کو پھر کلک کیجیے۔ ایسا آپ تب تک کر سکتے ہیں،

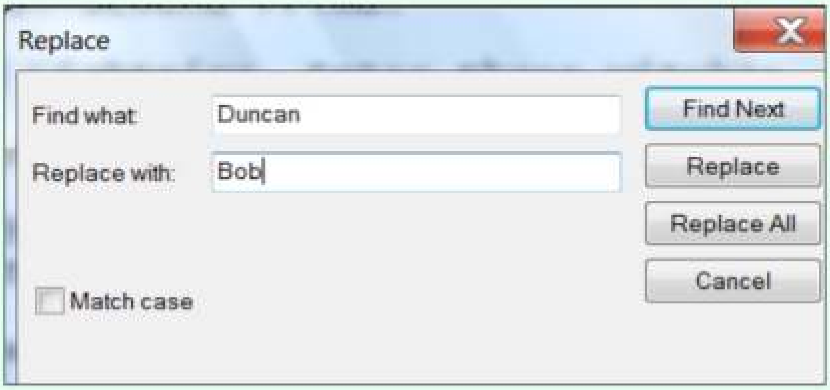

تصویر W-7.9: Replace کا ڈائیلاگ باکس

جب تک 'Cannot find' پیغام حاصل نہ ہو۔

7۔ تلاش پوری ہونے پر 'Find' ڈائیلاگ باکس کو بند کر دیجیے۔

کسی ٹیکسٹ کو بدلنا (Replacing Text0)

نوٹ پیڈ میں کھولی گئی فائل میں آپ کسی ٹیکسٹ کو ڈھونڈ کر اسے بدل بھی سکتے ہیں۔ اس کے لیے درج ذیل کام کیے جا سکتے ہیں:

1۔ Edit مینو میں Replace ہدایت دیجیے۔ اس سے آپ کی اسکرین پر Replace کا ڈائیلاگ باکس کھل جائے گا۔

2۔ اس ڈائیلاگ باکس میں 'Find What' ٹیکسٹ باکس میں بدلا جانے والا لفظ اور 'Replace with' میں وہ ٹیکسٹ ٹائپ کریں، جس سے آپ Find what میں دیا گیا لفظ بدلنا چاہتے ہیں۔

3۔ ضرورت کے مطابق Match Case چیک باکس کو کلک کریں۔

4۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ Find What میں دیا گیا لفظ پوری فائل میں جہاں بھی آئے نئے لفظ سے بدل جائے، تو Replace All پر کلک کیجیے۔ اس سے پرانا لفظ پوری فائل میں نئے لفظ سے بدل جائے گا۔

5۔ Replace بٹن کلک کرنے سے وہ ٹیکسٹ فائل میں جہاں جہاں ہوگا، کرسر وہاں پہنچتا رہے گا۔ آپ ایک ایک کر کے اپنی خواہش کے مطابق پرانے لفظ کو نئے لفظ سے بدل سکتے ہیں۔

6۔ کام پورا ہو جانے پر ڈائیلاگ باکس بند کر دیں۔

فائل کو چھپوانا (Printing a File)

نوٹ پیڈ میں کھولی ہوئی کسی فائل کو آپ اپنے پرنٹر پر چھپوا سکتے ہیں۔ چھپوانے سے پہلے آپ کو کاغذ کا سائز، حاشیہ وغیرہ سیٹ کر لینا چاہیے۔ اس کے لیے 'File' مینو

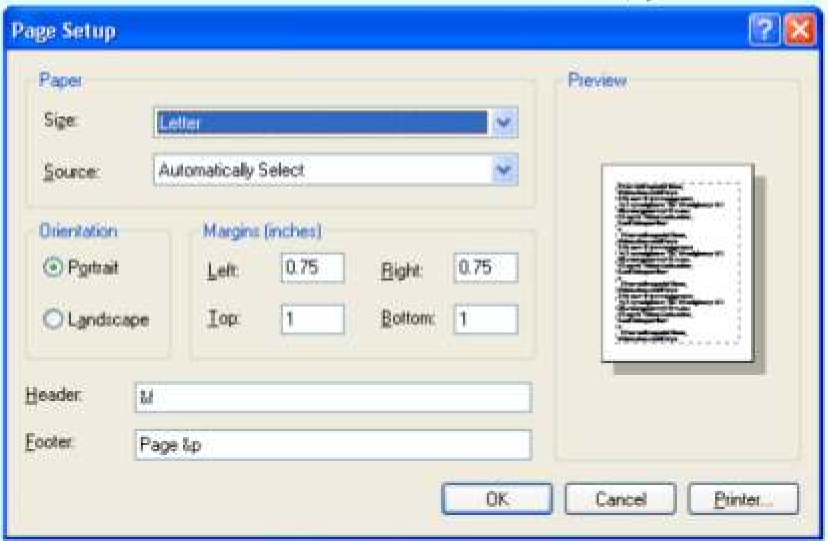

تصویر W-7.10: پیج سیٹ اَپ کا ڈائیلاگ باکس

میں 'Page Setup' ہدایت دیجیے، جس سے آپ کی اسکرین پر تصویر W-7.10 کی طرح پیج سیٹ اَپ کا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔

اس ڈائیلاگ باکس میں 'Paper' حصہ میں 'Size' ڈراپ ڈاؤن لسٹ کے بٹن کو کلک کر کے اسے کھولیے اور اس لسٹ میں سے پیپر کا صحیح سائز کلک کر کے چنیے۔ اسی طرح 'Orientation' حصہ میں 'Portrait' اور 'Landscape' میں سے کسی آپشن کو سیٹ کیجیے۔ جب کاغذ کی اونچائی زیادہ اور چوڑائی کم ہوتی ہے، اسے پورٹریٹ کہا جاتا ہے (جیسا کہ اس کتاب کا ایک صفحہ ہے) اور جب اونچائی کم اور چوڑائی زیادہ ہوتی ہے، تو اسے لینڈ اسکیپ کہا جاتا ہے۔ آپ اپنی سہولت اور پرنٹر کے مطابق کوئی بھی آپشن چن سکتے ہیں۔

اس ڈائیلاگ باکس کے 'Margins' حصہ میں پیج پر چاروں طرف چھوڑے جانے والے حاشیے انچ میں سیٹ کیے جاتے ہیں۔ آپ اپنے پرنٹر کے مطابق حاشیہ سیٹ کر دیجیے۔

اخیر میں 'Ok' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے آپ کے ذریعے کی گئی سیٹنگ لاگو ہو جائے گی اور اگلی بار بدلنے تک لاگو رہے گی۔

فائل کو چھپوانے کے لیے 'File' مینو میں 'Print' ہدایت دیجیے۔ اس سے Print ڈائیلاگ باکس کھلے گا، جس کے بارے میں تفصیل سے آپ کو آگے بتایا جائے گا۔ ڈیفالٹ پرنٹر سے فائل کی ایک کاپی چھاپنے کے لیے ڈائیلاگ باکس میں print بٹن پر کلک کیجیے۔ اس سے آپ کی فائل آپ کے ڈیفالٹ پرنٹر پر چھاپ دی جائے گی۔

نوٹ پیڈ کو بند کرنا (Closing Notepad)

نوٹ پیڈ پروگرام کو بند کرنے کے لیے یا تو اس کی ونڈو کے 'X' بٹن کو کلک کیجیے یا 'File' مینو میں 'Exit' ہدایت دیجیے۔ اگر کوئی فائل کھلی ہوئی ہے اور اس کو محفوظ نہیں کیا گیا ہے، تو پروگرام بند کرنے سے پہلے آپ کو ایک ڈائیلاگ باکس دے کر اسے محفوظ کرنے کا موقع دیا جائے گا اور آپ کے چنے گئے آپشن کے مطابق ہی پروگرام بند کیا جائے گا۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ وتعارف

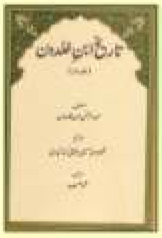

تاریخ ابن خلدون (جلد دوم)

مصنف: عبدالرحمٰن ابن خلدون
مترجم: حکیم احمد حسین عثمانی الہ آبادی، مرتب: محمد صہیب
صفحات: 357، قیمت: 180 روپے، سنہ اشاعت: 2018
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
مبصر: ڈاکٹر محمد مقیم، A-10، ہلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

ابوزید ولی الدین عبدالرحمٰن بن محمد علمی دنیا کا وہ معتبر نام ہے جو ابن خلدون کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کے جد امجد پہلے اندلس کے شہر قرمونہ میں سکونت پذیر ہوئے بعد ازاں ان کا خاندان اشبیلیہ منتقل ہوگیا۔ اشبیلیہ کے زوال کے بعد یہ خاندان تیونس میں آباد ہوگیا اور یہیں ابن خلدون کی ولادت ہوئی۔ ابن خلدون اپنے عہد کے کئی اہم سیاسی عہدوں پر فائز رہے اور سیاسی عمائدین کے مقرب رہے۔ علامہ ابن خلدون ایک لائق اور مدبر منتظم تھے لیکن ان کی شہرت دوام کا باعث ان کی علمی شخصیت اور گراں مایہ تصانیف ہیں۔ انھوں نے بہت سے موضوعات پر قلم اٹھایا اور مختلف علوم وفنون پر متعدد چھوٹی چھوٹی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی سب سے زیادہ شہرت یافتہ کتاب تاریخ ابن خلدون ہے اس میں بھی بقائے دوام کا حامل ان کا 'مقدمہ ابن خلدون' ہے۔

مقدمہ ابن خلدون کو اس قدر شہرت عام اپنے بعض خصائص اور ان مباحث کی وجہ سے حاصل ہے جن پر سیر حاصل گفتگو کرنے میں غالباً علامہ ابن خلدون کو اولیت حاصل ہے۔ اس میں سبھی ممکنہ گوشوں مثلاً اجتماعی، تمدنی، جغرافیائی، اقتصادی، علمی وادبی اور مذہبی پہلوؤں پر نہایت دقت نظری سے سیر حاصل اور بصیرت افروز بحث ہے۔ اسی مقدمے میں علامہ ابن خلدون نے تاریخ کے موضوع اور اس کی فضیلت اور فوائد پر بات کرتے ہوئے حکمت اور فلسفے کو علم تاریخ کی اصل قرار دیا ہے اور اس بات پر اصرار کیا ہے کہ علم تاریخ کا شمار علوم حکمت میں کیا جانا چاہیے۔ مقدمے کے مباحث اور علم تاریخ کے تئیں علامہ کی ذمہ دارانہ روش اور احساس تقدس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تاریخ ابن خلدون کس قدر اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنا بلاشبہ زبان اردو کی عظیم خدمت اور بیش بہا اضافہ ہے۔

علامہ حکیم احمد حسین عثمانی نے 18 جلدوں پر مشتمل اس طویل کتاب کے ترجمے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ تقریباً چودہ جلدوں کا ترجمہ کرکے داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ہمیشہ سے یہ اختصاص رہا ہے کہ اردو کتابوں کی اشاعت وطباعت کے سلسلے میں اس نے سدا بنیادی اور اساسی نوعیت کی کتابوں کو منتخب کیا۔ لہٰذا علامہ حکیم احمد حسین عثمانی نے جن چودہ جلدوں کا ترجمہ کیا تھا، کونسل نے انھیں از سر نو مع تدوین وترتیب شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کتاب کی پہلی جلد 2010 میں شائع ہوئی اور اس قدر قبول عام کو پہنچی کہ 2013 میں پہلی جلد کا دوسرا ایڈیشن بھی آگیا۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کونسل نے تاریخ ابن خلدون کی دوسری جلد بھی اردو دنیا کو پیش کردی۔ تاریخ ابن خلدون اور مقدمہ ابن خلدون کی عظمت اور اہمیت وافادیت ظاہر ہے لہٰذا اس کتاب کا اردو میں ترجمہ ہی مفید تھا لیکن کونسل نے اسے نئے عزائم کے ساتھ جب دوبارہ شائع کیا تو تدوین کا التزام بھی کیا۔ تدوین کا یہ بار گراں محمد صہیب نے اٹھایا اور بخوبی نبھایا بھی۔ تدوین کے دوران محمد صہیب نے جن امور کا لحاظ رکھا ہے۔ مثال کے طور پر چند باتوں کا ذکر کردینا مناسب ہوگا۔

1۔ اصل نسخے اور عربی متن کے درمیان اعلام وسنین کے اختلاف کی نشاندہی۔
2۔ اصل نسخے اور عربی نسخوں میں درج ناموں کے مابین اختلاف کی نشاندہی۔
3۔ ابواب اور فصلیں قائم کیں جس کا التزام غالباً مترجم نے نہیں کیا تھا۔
4۔ عربی اشعار کے ترجمے کے علاوہ مشکل اور کم استعمال میں آنے والے الفاظ کے معانی حواشی میں درج کردیے گئے ہیں۔
5۔ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے معانی کا سمجھنا مشکل تو نہیں لیکن جس معنی کا متقاضی ہے اس کی وضاحت کردی گئی ہے۔
6۔ نیز اصل نسخے میں تذکیر وتانیث کی جو غلطیاں راہ پاگئی تھیں انھیں بھی مرتب نے درست کیا۔
7۔ اصل نسخے کی عبارت میں مترجم کی طرف سے جو اضافے تھے، ان کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔
8۔ جن مقامات پر مترجم کو کسی بنا پر سہو ہوا ہے حواشی میں اس کی بھی وضاحت کردی گئی ہے۔

اس کے علاوہ کئی امور ہیں لیکن محمد صہیب کی کاوشوں اور کتاب کا اختصاص مندرجہ بالا امور سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مرتب کتاب نے تمہید میں علامہ ابن خلدون کے خاندانی حالات، سوانحی اور علمی کوائف نہ صرف ضروری تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے بلکہ مقدمہ ابن خلدون کا مختصر مگر جامع جائزہ اس طور سے پیش کیا ہے کہ علامہ ابن خلدون کے علمی وفکری منہج کی وضاحت کے ساتھ مقدمے کا اختصاص بھی نمایاں ہوجاتا ہے۔ مثلاً علامہ ابن خلدون نے مقدمے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے جو بالترتیب اس طرح ہیں: (1) انسانی آبادی، اقسام اور رقبے (2) دیہاتی آبادی (3) حکومت، خلافت، امامت اور ممالک (4) شہری آبادی (5) روزگار، پیشہ اور صنعت (6) علوم۔ محمد صہیب

نہ صرف اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ علامہ ابن خلدون نے ان چھ ابواب کی تقسیم کن بنیادوں پر کی ہے بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ علامہ ابن خلدون نے دیہاتی آبادی کو شہری آبادی پر کیوں مقدم رکھا ہے۔ علامہ ابن خلدون کے نزدیک روزگار اور صنعتوں کو علم پر مقدم رکھنے کا سبب بھی بتاتے ہیں۔ علامہ ابن خلدون روزگار کو بنیادی اور علم کو کمالی اور اضافی چیز قرار دیتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اضافی چیز کو بنیادی چیز پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ ظاہر ہے انسانی آبادی نے ہمیشہ سے بنیادی چیزوں کو اپنی ترجیحات میں شامل رکھا ہے۔ محمد صہیب نے مقدمے پر گفتگو کرتے ہوئے جن مباحث کو درج کیا ہے اور ان کی تشریح و توضیح کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقدمہ ابن خلدون پر محمد صہیب کی گرفت کتنی مضبوط ہے۔ انھوں نے مقدمے کے تعلق سے جو کچھ بھی لکھا ہے پوری سنجیدگی اور دقیقہ رسی سے لکھا نہ کہ تمہیدی گفتگو کی رسم نبھانے کے لیے۔ محمد صہیب کی تمہیدی گفتگو نہایت مفید اور ہم ایسے طالب علموں کے دل و دماغ پر علامہ ابن خلدون کے علمی جاہ و جلال کو اس طرح سے مستحکم کرتی ہے گویا علامہ ابن خلدون سے ہماری واقفیت ایسی ہے جیسے براہ راست متن کی قرات سے کسی قاری کا رشتہ مصنف اور متن سے استوار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ابن خلدون انسانی معاشرے کے لیے بادشاہ یا حکمراں (سیاسی ادارہ) کی موجودگی کو لازم قرار دیتے ہیں۔ وہ انسانوں اور حیوانوں میں رائج تصور بادشاہت کے فرق کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ یعنی انسانوں میں بادشاہت فکر و سیاست کا تقاضا ہے جب کہ حیوانوں میں فطرت کا۔ اسی طرح سماجی نظام کے استحکام کے لیے عصبیت کی اہمیت اور حکومت کو عصبیت کی انتہا کہنا نیز تمدن کو بدویت اور آبادی کی آخری حد قرار دینا۔ اس کے بعد محمد صہیب یہ بھی بتاتے ہیں کہ علامہ ابن خلدون نے تمدن پر تفصیلی بحث کی ہے اور تمدنی نفوذ کو بھی واضح کیا ہے۔ ان اشاروں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ محمد صہیب نے اہم اور ممتاز مباحث کو درج کرنے کا جو طریقہ اپنایا ہے وہ مکمل مقدمے کو پڑھنے پر اکساتا ہے۔

میں علامہ حکیم احمد حسین عثمانی کو 14 جلدوں کا ترجمہ کرنے پر خراج تحسین پیش کرتا ہوں نیز مرتب کتاب محمد صہیب اور ناشر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو دلی مبارک باد۔ یقیناً یہ ایک محنت طلب اور مشکل کام تھا جس کو محمد صہیب نے بحسن وخوبی انجام دیا ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ محمد صہیب کی یہ علمی اور تحقیقی کاوش اردو دنیا میں پہلی جلد کی طرح سرخرو ہوگی اور قومی کونسل کی بنیادی اور اساسی کتابوں کی فراہمی کا منصوبہ بارآور ہوگا۔

انتخاب سخن (جلد دوم) سلسلۂ ذوق

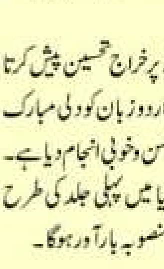

مرتب: مولانا حسرت موہانی

صفحات: 321، قیمت: 155 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی، این 139 بی، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

مولانا حسرت موہانی اردو ادب میں ایک ممتاز شاعر و صحافی کی حیثیت سے مشہور معروف ہیں۔ انھوں نے ملک کو آزاد کرانے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے، لوگ انھیں مجاہد آزادی کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ حسرت موہانی نے ہندوستان کو آزاد کرانے میں اپنی شاعری کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اپنی شخصیت کا اظہار شاعری اور ادبی صحافت اور قومی سیاست کے ذریعے کیا۔ ان کی خدمات کا دائرہ نہ صرف یہ کہ بہت وسیع ہے بلکہ ناقابل فراموش بھی ہے۔ انھوں نے آزاد ہندوستان میں عوامی نمائندگی کی بھی تاریخ رقم کی ہے۔ ان کا رسالہ 'اردوئے معلی' اردو کی ادبی صحافت میں کوہ نور ہیرے کی حیثیت رکھتا ہے۔

حسرت کا ایک لازوال کارنامہ تقریباً دوسو اساتذہ کے انتخاب کلام کی اشاعت بھی ہے جو انھوں نے 'انتخاب سخن' کے نام سے شائع کیا۔ یہ انتخاب گیارہ جلدوں میں تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ انتخابات بیشتر غزلوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں دوسری اصناف کو بہت کم جگہ ملی ہے لیکن جدید دور کے نظم گو شعرا کے انتخاب میں نظمیں بھی شامل کرلی گئیں ہیں۔ یہ انتخابات قلمی و مطبوعہ دیوان، بیاض اور تذکروں کی مدد سے مرتب کیے ہیں۔ ترتیب کے دوران یہ خیال بھی رکھا ہے کہ ہر غزل کے انتخاب میں غزل کی ہیئت برقرار رکھتے ہوئے مطلع و مقطع اور کم از کم تین اشعار ضرور شامل انتخاب ہوں۔ اس کی وجہ سے جہاں ایک طرف یہ نقصان ہوا کہ کمزور اشعار بھی انتخاب میں جگہ پاگئے وہاں یہ فائدہ بھی ہوا کہ اس طرح زیادہ شعری سرمایہ محفوظ ہوگیا۔

'انتخاب سخن' جلد دوم سلسلۂ ذوق کے اول حصے میں ذوق، داغ، رسا اور جگر مرادآبادی اور دوسرے حصے میں رونق ٹونکی، حسن بریلوی، نوح ناروی، نسیم بھرت پوری، بیخود دہلوی، بیخود بدایونی، ظہیر دہلوی، انور دہلوی، مذاق بدایونی، مائل دہلوی، سیماب اکبرآبادی، کیفی اور عزیز حیدرآبادی وغیرہ شعرا کے کلام پیش کیے گئے ہیں۔ انتخاب سخن میں اس بات کا پورا خیال رکھا گیا ہے کہ اس انتخاب کی وجہ سے کسی طرح شاعر کا رنگ سخن اور کلام کی خوبیاں وخامیاں مخفی نہ ہونے پائیں۔ اس سلسلے میں چند باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ انتخاب اس طور پر تیار کیا گیا ہے کہ دیوان کی صورت برقرار رہے۔ مثلاً منتخب غزلوں میں اصلی غزلوں سے اشعار کم ہیں۔ مگر غزل کی حیثیت بجنسہٖ باقی ہے یعنی ایسا نہیں کیا گیا ہے کہ مطلع و مقطع غائب کردیا جائے۔ یا صرف درمیان کے ایک دو شعر کم کردیے جائیں اس مقصد کے لیے زیادہ تر وہی غزلیں منتخب کی گئی ہیں جن میں منتخب ہونے کی حالت میں بھی غزل کی صورت قائم رہے یعنی جس میں کم از کم پانچ شعر قابل انتخاب مل سکے ہیں۔

حتی الامکان مطلع و مقطع ضرور رکھا گیا ہے۔ یہ انتخاب کئی لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک یہ کہ تھوڑے صفحات میں اردو کا تمام قابل قدر شعری سرمایہ ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ انتخاب دیوان اور کلیات کے مطالعے سے بڑی حد تک بے نیاز کردیتے ہیں۔

ان انتخابات کے ذریعے عام لوگوں کی رسائی بھی کلاسیکی ادب تک ہوجاتی ہے۔ ورنہ تمام دواوین، کلیات کا حصول ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ان میں حسرت کے ایسے معاصر شعرا کے انتخابات بھی شامل ہیں جن کا مجموعہ کلام اس وقت تک مرتب نہیں ہوا تھا۔ ایسے شعرا کے کلام کی ابتدائی نوعیت سمجھنے اور ان کے کلام کی تاریخی ترتیب میں ان سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اس سے خود حسرت کی شخصیت اور ذوق شعری پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے یہ انتخاب مرتب کرکے اردو ادب کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس کے ذریعے حسرت نے بہت سے کم مشہور اور گمنام شعرا کو متعارف کرایا ہے۔ بہت سے اساتذہ کو انھوں نے نئی زندگی عطا کی ہے۔ جس وقت حسرت نے یہ انتخاب مرتب کیا اس وقت تک مرزا حاتم، مظہر، سوز، قائم، مصحفی، حسرت "استاد جرأت" اور جرأت جیسے مشہور و معروف شعرا کے دیوان غیر مطبوعہ اور کمیاب ہی نہیں بلکہ نایاب تھے۔ یہ 'انتخاب سخن' بڑی حد تک جامع ہے۔ جس سے اس دور سے متعلق شعرا کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اس انتخاب سے اس دور کے نقادوں کو بڑی مدد ملی ہے اور انھوں نے انھی کی بنیاد پر بہت سے شعرا کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اس سلسلے میں نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے اس انتخاب

کوشائع کیا۔ اس کی اشاعت سے عالمی پیمانے پر اردو قارئین نے اس کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابوں کو شائع کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے۔ 'انتخاب سخن' جلد دوم سلسلۂ ذوق اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ یہ جلد بھی پہلی ہی جلد کی طرح ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ عوام اور خواص میں اپنی شہرت عام اور بقائے دوام کو برقرار رکھے گی۔

ترقی پسند اور ان کے معاصر پینٹر

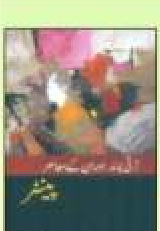

مصنف: زبیر رضوی

صفحات: 247، قیمت: 126 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: خلیق الزماں نصرت، کائنات پبلی کیشنز

فلیٹ نمبر 15، بلڈنگ نمبر 4، سائی نگر کالونی، بھیونڈی (مہاراشٹر)

اردو کے لیے خوش آئند بات یہ ہے کہ اب میر و غالب کے علاوہ، سائنس کمپیوٹر، ٹیکنالوجی، فنون لطیفہ، مصوری وغیرہ کے حوالے سے بھی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ زبیر رضوی کی یہ کتاب بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے کہ مصوری پر اردو میں بہت کم کتابیں دستیاب ہیں۔

سرکاری سطح پر مولانا آزاد یونیورسٹی، جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہے، سے اب ایم سی اے، ایم کام، ایم ایس سی، بی ٹیک اور دیگر انجینئرنگ کے کورس پینٹنگ پر لکھی گئی زبیر رضوی کی یہ کتاب مایہ ناز تحقیق کی حامل ہے۔ زبیر رضوی نے اپنے رسالے میں ادبی مضامین کے علاوہ نئے نئے موضوعات پر مضامین شائع کیے ہیں، جو زبان اردو کا سرمایہ گرانقدر ہے۔ زبیر رضوی جانتے تھے کہ اردو کے صرف ادب کو پڑھانا گویا اپنے قتل نامے پر سر محضر خود ہی دستخط کرنا ہے۔ اردو کو زندہ اور ترقی یافتہ زبان کی طرح پڑھانا چاہیے۔ اس میں دوسرے علوم کی اہم باتوں کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ ترقی پسندی کے زمانے میں اردو سے انقلاب لانے کی کامیاب کوشش کا اثر عوام کے ہر طبقے پر پڑا۔ آرٹ کے ذریعے بھی اس کے فن کاروں نے آج کے مسائل اور حالات کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ کہیں زندگی کی سفاک سچائیوں کو اور اس کے مختلف تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں کو ہمارے احساس تک اس طرح پہنچانے بھی کی کوشش کی گئی ہے جس طرح نثر اور نظم کے ذریعے شاعروں اور ادیبوں نے ان کی تلخ کامیوں کو محسوس کیا ہے اور اس کی کڑواہٹ کو جذب کیا ہے۔ مصوروں نے اظہار صداقت کو ایک برہنہ فنکارانہ انفرادی روپ دیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زندگی اور کائنات کے رموز اسرار کے لیے نہ تو کسی فلاسفی کی ضرورت ہے نہ کسی اور ذریعے کی، انسان ہر لحظہ نیا طور اور نئی برق تجلی سے آشنا ہے۔ ترقی کی برق وشی کے باعث نئے مسائل درپیش ہیں۔ امید و نومیدی، قتل و خوں ریزی، فرقہ ورانہ سامراجیت، منافقت اور بے پناہ مصروفیت، جدید عصری مسائل جن میں آج کا انسان گھرا ہوا ہے اور آرٹ بھی حالات کے اسی تواتر کے ساتھ اپنے اندر زیادہ حقیقت پسند تجربے سمیٹے جا رہا ہے۔ یہ کسی زبان میں نہیں ہوتا ہے اس لیے اس کی اہمیت دنیا کے بڑے ملکوں میں یہاں کی پینٹنگ بڑے شوق سے خریدی اور پسند کی جا رہی ہیں۔ مصوری جو موڈرن آرٹ کے نام سے کی جا رہی ہے، اس کا عالمی مارکیٹ میں اہم مقام ہے۔ مصنف نے کئی حوالوں سے اس بات کو لوگوں کے سامنے رکھا ہے۔ ایک مثال انھوں نے سوامی ناتھن کے صاحب زادے ہرش وردھن کی دی ہے جو ایک کامیاب کلاکار ہے۔ ہرش وردھن نے بتایا کہ ایک زمانہ تھا کہ ان کے والد کے بنائی ہوئی پینٹنگ جو ایک مہینے میں تیار ہوئی انھیں دو سو پچاس روپے میں بیچنا پڑا اور آج ہندوستانی مصوری عالمی مارکیٹ میں کافی اونچے داموں میں بک رہی ہیں۔ جہاں تک نئے آرٹ کو سمجھنے کا تعلق ہے، مصنف نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ اب فن کار کا تعلق براہ راست سماج سے ہو گیا ہے۔ آرٹ کے پسند کرنے والے لوگ آج سماج میں بہت ہو گئے ہیں۔ مشکل سے مشکل آرٹ کو ان لوگوں نے پسند کیا ہے اور اس کی اہمیت کو جانا ہے۔ آرٹ کی صورت حال پیش کرنے کے مختلف ابواب بنائے گئے ہیں۔ ان سب کے چند عنوانات سے آپ خود اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں: (1) عالمی سطح پر ہندوستانی مصوری کی پذیرائی (2) سماجی آگہی (3) مصوری اور سرمایہ کاری (4) کرشی (ایک فن کار) اور ہندوستانی مصوری (5) اسلوب کی نقالی (6) آرٹ فطرت کا مشغلہ ہے۔ حسین (فدا حسین) کی خود اختیار کردہ جلاوطنی (7) تخلیقی اظہار کی آزادی اس کے علاوہ مختلف آرٹسٹوں کے لیے الگ الگ باب بنا کر ان کی تقریر اور قول سے مصنف نے آرٹ کی باریکیوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے جو واقعی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مختلف واقعات کو پیش کیے ہیں جنھیں پڑھنا اردو کے قاری کے لیے بہت ضروری ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اسے پڑھ کر نہ صرف محظوظ ہوں گے، آرٹ کے فن اور فن کار کو جانیں گے۔ اردو میں یہ کتاب ایک نئے موضوع پر ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے چھوٹے موٹے واقعات آپ نے پڑھے ہوں مگر اس میں پوری معلومات ایک جگہ اکٹھا کر دی گئی ہیں۔ ادب کی طرح ان کے یہاں بھی الگ الگ نظریے ہیں اور ان میں کافی اختلاف ہے۔ گوا کے واسودیو ایس گئی توندے کے بارے میں یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ کسی بھی کلشے (Cliche) یا بندھے ٹکے جذباتی ابال کو اپنی مصوری میں جگہ نہیں دیتا ہے۔ زبیر رضوی کی یہ بات بالکل درست ہے کہ انسان کے بیشتر جذبے جیسے غصہ، محنت، بہادری وغیرہ وقتی ابال کے جذبے ہوتے ہیں اور علامتی طور پر اوپری سطح پر آ کر زیر آب ہو جاتے ہیں۔ جیسے جیسے ہم مطالعہ کرتے جاتے ہیں ایسے ایسے حقائق جو عام زندگی کے متعلق ہیں ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ادب میں بھی اس طرح کی دانشوری ہمیں جگہ جگہ ملے گی۔ تحریر ایسی شگفتہ ہے اسے پڑھنے کے بعد اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی ہے، ہاں ہمارے ذہن میں ہی بات ذہنی چاہیے کہ ہمیں آرٹ کے بارے میں بہت کچھ جاننا ہے۔

آخر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کو مبارکباد دیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انھوں نے اردو ادب و شاعری کے علاوہ بھی دوسرے میدانوں کے فن سے ہمیں وقتاً فوقتاً روشناس کرایا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

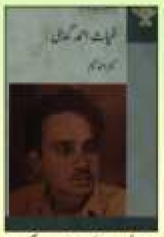

غیاث احمد گدی

مصنف: نسیم احمد نسیم
صفحات: 124، قیمت: 50 روپے
ناشر: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی
مبصر: ابوظہیر ربانی، شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج، لودھی روڈ، نئی دہلی 3

غیاث احمد گدی نے افسانہ نگار کی حیثیت سے زندگی کے جملہ پہلوؤں کا مشاہدہ کیا، قریب سے دیکھا، غم روزگار سے دوچار بھی ہوئے اور پھر انھیں افسانہ بنایا۔

زیر تبصرہ کتاب 'غیاث احمد گدی' ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کی نئی تصنیف ہے۔ افسانوی دنیا میں نسیم احمد نسیم نے غیاث احمد گدی کی فنی اور ادبی حیثیت کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب میں غیاث احمد گدی کی تحریروں کے حوالے سے پانچ ابواب قائم کیے گئے ہیں اور آخر میں تین افسانے 'پہیہ'، 'کبوتری' اور 'ایک خوں آشام صبح' بطور انتخاب شامل ہیں۔

پہلے باب کے تحت غیاث احمد گدی کے حالات زندگی کو ان کے مخصوص ماحول کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ غیاث احمد گدی کی زندگی اور فن کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔ بہت کم ہی ایسے ادیب اور فن کار گزرے ہیں جن کی زندگی بچپن سے جوانی تک مشکلات اور اذیتوں سے دوچار رہی لیکن علم وادب کے شوق نے انھیں ادبی دنیا میں ایک اہم مقام دلایا۔ نسیم احمد نسیم نے کتاب کے حرف آغاز میں لکھا ہے کہ 'ان کا ماحول بھی علم وادب کے لیے موافق نہیں تھا، اس کے باوجود انھوں نے اپنے ذوق اور اپنی تخلیقی قوت اور صلاحیت کی بدولت جو مقام حاصل کیا وہ ہمارے لیے نہ صرف باعث حیرت ہے بلکہ وجہ مسرت بھی ہے'۔

دوسرے باب میں غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے نسیم احمد نسیم نے غیاث احمد گدی کے افسانوں میں آنے والی نسلوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت اور فکر و فن کا اعتراف کیا ہے۔ غیاث احمد گدی کے ہم عصر افسانہ نگاروں مثلاً کرشن چندر، منٹو اور عصمت چغتائی کے ادبی ماحول میں غیاث احمد گدی کا اپنی شناخت قائم کرنا آسان نہیں تھا لیکن یہی وہ ادبی ماحول تھا جس میں انہوں نے اردو کی افسانوی دنیا میں قدم رکھا اور شہرت حاصل کی۔ بعض نقادوں کا یہ کہنا کہ غیاث احمد گدی انتظار حسین سے متاثر تھے، نسیم احمد نسیم اس بات سے متفق نہیں۔ وہ غیاث احمد گدی کو کسی ازم یا رجحان سے متاثر افسانہ نگار نہیں مانتے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ گدی کی پوری زندگی گھریلو اور خاندانی تجربے اور سخت آزمائش میں گذری، چنانچہ یہی گھریلو ماحول نیز ذاتی تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر کہانیاں لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ آگے بھی چلتا رہا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ غیاث احمد گدی کی کہانیاں عمیق تجربات اور گہرے مشاہدات پر مبنی ہیں۔ اگرچہ غیاث احمد گدی جھریا (جھارکھنڈ) کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے افسانوں کو کسی خاص مقام، فرقہ یا مذہب سے نہیں جوڑا جاسکتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کی تنزلی کے بعد افسانوی ادب میں علامتی اور تجریدی افسانے لکھے جانے لگے تھے۔ غیاث احمد گدی نے بھی نئے حالات اور نئے تجربے کے اثرات قبول کیے اور اپنی پہچان الگ بنائی۔ غیاث احمد گدی کے افسانوی مجموعے میں 'بابا لوگ'، 'پرندے پکڑنے والی گاڑی' اور 'سارا دن دھوپ' بے حد مقبول ہوئے۔ مجموعہ 'پرندے پکڑنے والی گاڑی' میں علامتی اور تجریدی رنگ وآہنگ نظر آتا ہے، جس میں گدی کا فن نکھر کر سامنے آتا ہے۔ اس مجموعے کے افسانوں میں 'پرندے پکڑنے والی گاڑی'، 'ڈوب جانے والا سورج'، 'افعی'، 'دیمک'، وغیرہ ناقابل فراموش افسانے ہیں۔ افسانوی مجموعہ 'بابا لوگ' میں شامل افسانے متوسط طبقے کے انسانی مزاج کے المناک پہلو کی عکاسی پر مبنی ہیں۔ ان میں بیشتر افسانے اینگلو انڈین معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ افسانے زندگی کے معاشرتی اور سماجی جبر اور تہذیبی اقدار کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ بقول نسیم احمد نسیم فطری طور پر غیاث احمد گدی کا تعلق محنت کش اور مظلوم طبقے سے تھا، اس لیے وہ اشتراکی نظریے کے حامی نظر آتے ہیں۔ جھریا کی مقامی صورت حال اور کولری میں کام کرنے والے مزدوروں اور محنت کشوں کے طرز زندگی اور ان کے مسائل سے متعلق افسانوں کا بڑا ہی موثر انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ نسیم احمد نے کہانیوں کے حوالے سے انسانی زندگی کے نفسیاتی، نسوانی، اخلاقی، تہذیبی کرداروں کا تجزیہ بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

معاشی جبر اور بیکاری سے متعلق غیاث احمد گدی کی کہانیوں میں 'کالے شاہ'، 'دیپک'، 'زرگری'، 'کیمیا گر' وغیرہ اہم ہیں۔ غیاث احمد گدی کے فن میں تدریجی ارتقاء کی کیفیت موجود ہے۔ بعض کہانیوں میں دھندلکے سی کیفیت پائی جاتی ہے پھر بھی فن پر غیاث احمد گدی کی گرفت مضبوط ہے۔ بعض جگہ قاری کو کہانی بے ربط محسوس ہوتی ہے لیکن غیاث کا کمال ہے کہ کہانی میں جلد سیاق وسباق قائم ہوجاتے ہیں۔ غیاث احمد گدی کی کہانیوں کی تکنیک کی خوبی یہ بھی ہے کہ جب وہ اپنے اردگرد بکھرے واقعات وسانحات سے مواد حاصل کرتے ہیں تو وہیں سے مناسب کردار کا انتخاب بھی کرتے ہیں۔

غیاث احمد گدی کی ناولٹ نگاری کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے تاکہ قاری غیاث احمد گدی کی ناولٹ نگاری سے بھی واقف ہوجائے۔ گدی نے صرف ایک ناولٹ 'پڑاؤ' تخلیق کیا جو خالص علامتی اور استعاراتی ہے۔ نسیم احمد نسیم نے غیاث احمد گدی کو بحیثیت ناولٹ نگار زیادہ اہمیت نہیں دی ہے، لیکن اس ناول کو موضوع، ٹریٹمنٹ اور اسلوب کے اعتبار سے اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ انھوں نے 'پڑاؤ' جیسے ناولٹ کو آج کے انسانوں کے چہرے پر چڑھے ہوئے مکھوٹے اور ماسک کی کہانی بتایا ہے۔

مکتوب نگاری کی اپنی ادبی اہمیت رہی ہے۔ نسیم احمد نسیم نے غیاث احمد گدی کے بعض خطوط کو اس کتاب کی زینت بنایا ہے۔ ان خطوط میں ادب کی جھلک ملتی ہے۔

غیاث احمد گدی کے یہاں فکشن کے علاوہ ڈرامے، اداریے اور مضامین بھی ملتے ہیں جن کا تجزیہ پانچویں باب میں پیش کیا گیا ہے۔ غیاث احمد گدی کے مضامین بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مضامین میں ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور نجی زندگی نیز خاندانی پس منظر کا واضح طور پر اظہار ملتا ہے۔ آخر میں غیاث احمد گدی کے چند رہنما افسانے بھی شامل ہیں جو زیر تبصرہ کتاب کی افادیت میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

کتاب کے مطالعے سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ اہل علم ودانش اس کتاب کی پذیرائی کریں گے۔

مطالعہ معین احسن جذبی

مصنف: صدیقی صائم الدین
صفحات: 176، قیمت: 150، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو شاعری کی دنیا میں معین احسن جذبی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے غزلوں اور نظموں دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی اور کامیاب بھی ہوئے۔ زیر تبصرہ

کتاب 'مطالعہ معین احسن جذبی' صدیقی صائم الدین کے ذوق ادب اور تنقید و تحقیق سے گہرے شغف کا پتہ دیتی ہے۔ کتاب کی ترتیب، تزئین کاری اور مواد کے اعتبار سے مصنف کی یہ کاوش لائق ستائش ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ انھوں نے معین احسن جذبی کے حالات، شخصیت، غزل اور نظم گوئی وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ کتاب کی شروعات ڈاکٹر صدیقی محی الدین، شعبۂ اردو، ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد کے پیش لفظ سے ہوتی ہے۔ بعد ازیں 'آشفتہ بیانی میری' کے ذیل میں مصنف نے کتاب کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے کتاب کی تخلیق کی وجہ بھی بتائی ہے۔ مصنف کا یہ کہنا کہ ''مطالعے کے دوران میرا ان سے غائبانہ تعارف ان کے ایک شعر کے تحت ہوا۔

جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

اور اس شعر نے مصنف کے قلب و ذہن کو اس درجہ مسحور کر دیا کہ جذبی پر تحقیقی کام کرنے کی خواہش ان کے دل میں انگڑائیاں لینے لگیں اور یہی اس کتاب کی تخلیق کی وجہ بھی بنی۔

زیر تبصرہ کتاب کو مصنف نے پانچ ابواب پر منقسم کیا ہے جو بالترتیب معین احسن جذبی حیات اور شخصیت، معین احسن جذبی کی نظم نگاری، معین احسن جذبی کی غزل گوئی، متفرقات و رباعیات اور انتخاب ہیں۔ پہلے اور دوسرے باب کے تحت مختلف ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں جن میں حیات اور شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے خاندانی پس منظر، پیدائش، بچپن، تعلیم، ملازمت، شادی، اولاد، ادب سے وابستگی، تصانیف، ترقی پسند سے وابستگی، اعزازات، وفات، سراپا، لباس، مزاج، عادات و اطوار، دوست و احباب کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ان ذیلی عنوانات کی وجہ سے جذبی کی شخصیت اور حیات بیک وقت نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح نظم نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے رومانی، ترقی پسند اور معاصرین پر لکھی گئی نظموں کا علیحدہ علیحدہ تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ بعد ازیں ان کی غزل گوئی پر بھی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ جذبی کی غزل گوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف نے کہا کہ جس زمانے میں اقبال، غالب اور میر جیسے شعرا کی پیروی کی جاتی تھی اور فانی، جوش، جگر، اصغر، یگانہ، حسرت، اختر شیرانی، فراق گورکھپوری، فیض، مخدوم، سردار جعفری اور مجاز وغیرہ شعرا کرام اپنا کمال دکھا رہے تھے، ایسے وقت میں جذبی کی شاعری نے عوام میں مقبولیت حاصل کی۔ اس بحث سے قطع نظر کہ مندرجہ بالا شعرا کے مقابلے میں جذبی کی مقبولیت کس درجہ تھی مصنف نے اپنے تئیں جذبی کی غزلوں کا جائزہ مختلف ادوار کے تحت لینے کی کوشش کی ہے۔ اس اعتبار سے مصنف کی یہ کاوش لائق ستائش ہے۔ البتہ چوتھا باب جو متفرقات اور رباعیات کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے اس میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ باب فقط چار صفحات پر محیط ہے جو قاری کے لیے کسی صورت میں تشفی بخش نہیں۔ بقیہ ابواب کی طرح اس باب میں بھی رباعیات وغیرہ کا تفصیلاً جائزہ لیا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ بہرحال میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کے ازالے کی کوشش کی جائے گی۔ پانچواں باب جو جذبی کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ہے، کافی مختصر ہے۔ اس باب میں فقط پانچ نظمیں اور چھ غزلیں ہی شامل کی گئی ہیں، اگر انتخاب کرنا ہی تھا تو مصنف کو اس اختصار سے کام لینے کی قطعی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ اس مختصر انتخاب کے ذریعے قاری کے ذہن پر جذبی کی شاعرانہ عظمت کے متعلق منفی اثرات بھی مرتب ہو سکتے ہیں۔

بہرحال مجموعی طور پر صدیقی صائم الدین کی یہ کوشش لائق تحسین ہے۔ کتاب کی طباعت کافی عمدہ اور قیمت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ ''ہو زور قلم اور زیادہ۔''

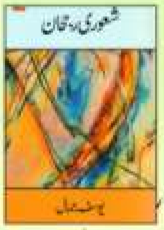

شعوری رجحان

مصنف/ ناشر: یوسف جمال

صفحات: 199، قیمت: 128 روپے، سنہ اشاعت: 2017

مبصر: ڈاکٹر رضاءالرحمٰن عاکف، علامہ اقبال اسٹریٹ، سنبھل یوپی

اس دنیائے ارضی اور چمن ہائے رنگ و بو میں ہر چیز کو نکھارنے سجانے سنوارنے کے طریقے اور ذرائع بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح ہمارے علمائے ادب نے ادب کو سجانے، سنوارنے کے لیے جس فن کو ایجاد کیا اسے ہم 'تنقید' کے نام سے جانتے ہیں۔ بیشک تنقید ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ ہم کسی مضمون، مقالے یا کتاب و ادب پارے کو پرکھ سکتے ہیں۔ اس کے حسن و قبح کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور اس کے معیار کو بلند کر سکتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ دنیا کی دیگر زندہ زبانوں کی طرح اردو میں بھی اس موضوع پر بہت ہی عمدہ و اعلیٰ کتابیں موجود ہیں۔ ایسی ہی ایک کتاب اس وقت راقم الحروف کے پیش نظر ہے جس کا تعارف و تبصرہ نذر قارئین کیا جارہا ہے۔

یہ کتاب تنقیدی نوعیت کے بڑے ہی اہم مضامین کا گلدستہ ہے۔ جن کے عنوانات اس طرح ہیں۔ وزیر آغا کا منفرد ادبی تشخص، آزاد غزل کے ساتھ مخالفین کا رویہ، ڈاکٹر کرامت علی کرامت: بحیثیت شاعر و نقاد، اردو کا کردار قومی یکجہتی کے تناظر میں، حرمت الاکرام کی شاعرانہ عظمت، اردو افسانے کے جدید رجحانات، منظر کاظمی اور لکشمن ریکھا۔ مناظر عاشق ہرگانوی اور آزاد غزلیں، صلاح الدین پرویز کا جنگل، مثلث کا شکار: پریم چند، سرسید احمد خاں، اڑیسہ میں اردو ادیبوں اور شاعروں کے مسائل، آزادی کے بعد میں اردو تنقید، اردو ادب پر رونما ہونے والے عالمی ادب کے اثرات ہیں۔ کتاب کے آخر میں مصنف کی کتاب 'سوکھے جزیرے کی دعا' پر اہل قلم کے تاثرات پیش کیے گئے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر موصوف کے علمی تفوق کی تصدیق ہوتی ہے اور ان کی تصنیفی صلاحیتوں کا ثبوت ملتا ہے۔

یہ کتاب چودہ مضامین پر مشتمل ہے جن میں سات مضامین شخصیات پر ہیں۔ تین ادب کی مختلف اصناف پر لکھے گئے ہیں تو چار مضامین ایسے بھی ہیں جن کے ذریعے مختلف ادوار و علاقوں میں اردو کی حیثیت و نوعیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے تقریباً ہر ایک مضمون اپنے اندر کوئی نہ کوئی خوبی رکھتا ہے اور کچھ تو ایسے بھی مضامین ہیں جو اپنے موضوع پر پوری طرح محیط و مکمل ہیں اور چند مضامین میں متعلقہ موضوع کے مخصوص گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مضامین اپنے اپنے موضوعات پر بڑے ہی اہم ہیں اور ان سے متعلقہ حضرات اور فن و شخصیت نیز اصناف و ادوار پر خاصی معلومات حاصل ہو سکتی ہے۔ بطور مثال اگر سرسید والا مضمون ان کی حیات و خدمات کے مختلف گوشوں سے قاری کو متعارف کراتا ہے تو کچھ مضامین اڑیسہ میں اردو کی صورت حال سے آگاہی فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح چند مضامین شاعری، افسانے، غزلوں اور یکجہتی پر بھی ہیں، جن سے ان کی اہمیت و افادیت اجاگر ہوتی ہے۔ منظر کاظمی اور لکشمن ریکھا، حرمت الاکرام کی شاعرانہ شخصیت، صلاح الدین پرویز کا جنگل، مناظر عاشق ہرگانوی اور آزاد غزلیں۔ اسی نوعیت کے مضامین ہیں۔

آیئے! آپ کے مضامین پر سرسری نظر ڈالیں اور قارئین کو ان سے متعارف کرائیں۔ جیسا کہ سطور بالا میں کہا جا چکا ہے کہ یہ مضامین تنقیدی نوعیت کے ہیں، مگر الگ الگ اصناف سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے چند کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ کتاب کا سب سے پہلا مضمون وزیر آغا پر ہے، جو ان کی نظم، غزل اور تنقید کے تناظر میں تحریر کیا گیا ہے۔ یہ مضمون کافی طویل ہے اور اپنے موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالتا ہے۔ موصوف کے فن پر عمائدین ادب کے رشحات قلم بھی ہیں اور ان کی تنقید و تنقیح بھی۔ وزیر آغا کے کلام کے نمونے بھی ہیں اور مضامین کے اقتباسات بھی۔ اس طرح یہ مضمون اپنے موضوع پر تفصیلی ہونے کے ساتھ

ساتھ مکمل بھی ہے۔ وزیر آغا کی یہی خوبی ہے جس کی بنیاد پر مصنف کتاب کو یہ اعتراف کرنا پڑا:

''وزیر آغا نے انتقاد کی صنف پر بھرپور توانائی کے ساتھ زندگی کی جو روح پھونکی ہے اس سے صنفِ نقد ہمیشہ زندہ و توانا رہے گی۔ انہوں نے فن پاروں سے جن بصیرت افروز جذبوں کا برملا اظہار کیا ہے، اس سے تنقید گلشن ادب میں تادیر لہلہاتی رہے گی۔''

(وزیر آغا کا انفرادی ادبی تشخص ص 29)

آپ کے ایک اور مضمون کا جائزہ لیں۔ یہ مضمون ہے 'منظر کاظمی اور لکشمن ریکھا' اس میں مصنف نے منظر کاظمی کے افسانے 'لکشمن ریکھا' کا جدید افسانوی رجحانات کے آئینے میں جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دیگر افسانے بھی زیر بحث آگئے ہیں اور ان کے اقتباسات پیش کرتے ہوئے کاظمی صاحب کے فن کو منکشف کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ مضمون اپنی نوعیت کا بہترین مضمون ہے اور کاظمی صاحب کے فن کو پوری آب و تاب عطا کرتا ہے، جس کا اعتراف کرتے ہوئے مصنف رقم طراز ہے۔

''منظر کاظمی ادب کی وہ پر بہار شخصیت ہیں، جو اپنے افسانوں میں انفرادی لب و لہجے کی وجہ سے مسلم شناخت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اپنی بھرپور تخلیقیت سے آج کے افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں جداگانہ اور بلند قد و قامت کے حامل ہیں، اور یہ اوصاف جلیلہ بے پناہ محنت اور تیقن سے حاصل ہوتے ہیں۔'' (منظر کاظمی اور لکشمن ریکھا ص 125)

کتاب میں شامل دیگر مضامین میں بھی کم و بیش یہی خوبیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ محدود سطور میں سب کا احاطہ تو کیا نہیں جا سکتا۔ اس لیے ان حوالوں سے ہی ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب کچھ چھوٹی موٹی خامیوں جیسے لفظی غلطیوں (بطور مثال فہرست میں 'وزیر آغا کا منفرد ادبی تشخص' لکھنا اور مضمون کی پیشانی پر 'وزیر آغا کا انفرادی ادبی تشخص' لکھنا) کے باوجود بہترین خوبیوں اور حسن و جمال سے پوری طرح آراستہ ہے۔ قومی کونسل کے تعاون سے شائع ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت بھی مناسب ہے اور کتابت و طباعت بھی معیاری ہے۔ غرض کہ اس کتاب کو شائقین بآسانی خرید کر اپنے ذوق مطالعہ کی تسکین کا سامان فراہم کر سکتے ہیں اور یوسف جمال صاحب کی حوصلہ افزائی کر کے علم دوستی کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ کتاب 'عرشیہ پبلی کیشنز دہلی' کے ساتھ ہی ملک کے دیگر اداروں سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

شاعری

منقبت عظیم

مصنف: ڈاکٹر عظیم امروہوی

صفحات: 240، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: عالمی مرثیہ سنٹر، موسیٰ اپارٹمنٹ، ذاکر نگر، نئی دہلی

مبصر: سراج نقوی، A-101 ایسٹ ایونیو اہنسا کھنڈ۔2 غازی آباد

ڈاکٹر عظیم امروہوی رثائی ادب کا مشہور و معتبر نام ہے۔ انھوں نے مرثیے بھی کہے ہیں اور قصیدے بھی، حمد بھی لکھی ہیں اور نعتیں بھی، نوحے بھی لکھے ہیں اور سلام بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ رثائی ادب پر ان کا تنقیدی اور تحقیقی کام بھی منظر عام پر آ کر اہل ادب سے پذیرائی اور قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ 'منقبت عظیم' رثائی ادب کے لیے ان کی خدمات میں ایک اور اضافہ ہے۔ مجموعی طور پر 'منقبت عظیم' میں کل 95 نظمیں ہیں۔ ان میں ایک حمد، ایک نعت اور باقی منقبتیں اہل بیت کی شان میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بھی بڑا حصہ مولائے کائنات حضرت علی کی شان میں لکھی منقبتوں پر مشتمل ہے۔

'منقبت عظیم' کا مطالعہ کئی اعتبار سے تمام اہل علم و ادب کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ اول تو یہ کہ عصری شاعری میں غزلوں اور عام موضوعات پر نظمیں لکھنے پر ہمارے شعرا کی توجہ زیادہ مرکوز ہے۔ اس کا ایک سبب مشاعروں و ادبی محفلوں کے سامعین کا ذوق سماعت بھی ہے اور کسی حد تک شعرا کی سہل پسندی بھی۔ ایسے میں منقبتی شاعری کا مطالعہ قارئین کو نئے جہان تخیل اور وسعت زبان تک رسائی میں مددگار ہوگا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں کہا گیا کہ منقبت گوئی کا تعلق بزرگان دین کے تعلق سے عقیدت مندی ہے اور ظاہر ہے اس کا انحصار توفیق پر ہے۔ اس لیے مادیت کے اس دور میں ایسی شاعری ایک روحانی غذا کے مترادف بھی ہے۔ جہاں تک غزل اور عام موضوعات پر لکھی جانے والی نظموں کی مقبولیت کا تعلق ہے تو اس صورت حال نے ہمارے دامن شاعری کو اس اعتبار سے تنگ کیا ہے کہ اس میں اب صنائع اور بدائع کا اس طرح استعمال نہیں ہوتا جس طرح مرثیہ، قصیدہ یا منقبت میں ہوتا ہے۔ زبان کا وہ حسن اور کشش جو مذکورہ اصناف شاعری میں ہوتا ہے۔ غزل اور عام موضوعات پر لکھی جانے والی نظمیں اس سے بڑی حد تک محروم ہیں اور اس کا سبب وہ سہل پسندی بھی ہے جس کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حسن زبان اور شعر فہمی کا جو شعور مرثیے، قصیدے، حمد، نعت اور منقبت کے قاری میں ہوتا ہے غزل کے قاری میں اس درجہ نہیں ہوتا۔ اردو کا کوئی طالبعلم یا عام قاری اگر صحیح معنوں میں اس زبان کی لطافت، شیرینی، حسن اور اس کے ہر لفظ میں پوشیدہ معنویت تک رسائی چاہتا ہے تو اسے غزل کے ساتھ ساتھ مذکورہ اصناف کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اس اعتبار سے 'منقبت عظیم' ایک کارآمد اور قابل مطالعہ کتاب ہے۔ اس میں وہ حسن زبان ہے کہ جو اردو کی پہچان ہے۔ عظیم امروہوی نے منقبت گوئی میں جس طرح صنائع و بدائع کا استعمال کیا ہے، جس طرح لفظوں کو فنکارانہ چابکدستی سے برتا ہے، جس طرح تلمیحات، استعاروں و تشبیہات کا ایک دفتر ان کی منقبت میں نظر آتا ہے، جو سلاست، ندرت، روانی، شوکت الفاظ، مضمون آفرینی اور بات سے بات پیدا کرنے کا فن اور ان سب کے ساتھ ساتھ استدلال ان منقبت میں ہے اسے موجودہ اردو غزل کے قاری کے لیے ایک تحفہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ زبان کی یہ خوبیاں آج کی شاعری میں ناپید ہیں۔

اردو میں صنائع لفظی اور صنائع معنوی دونوں ہی کو شاعری میں حسن پیدا کرنے کا ذریعہ مانا گیا ہے لیکن یہ حسن اسی وقت پیدا ہوتا ہے کہ جب ان صنعتوں کا استعمال بے ساختہ اور فطری انداز میں ہو۔ اس سلسلے میں کوئی بھی شعوری کوشش شعر کو بوجھل بنا دیتی ہے۔ عظیم امروہوی کی منقبتیں اس فطری حسن کی آئینہ دار ہیں۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

1: یہ حد ہے محدود تو نہیں ہے یہی دلیل احد ہے تیری
ہے تو حد عقل سے بھی آگے کرے جو انساں خیال تیرا (استدلال)

2: جہاں میں سیرت و کردار یکساں ہے بس اک گھر کا
محمدؐ کا، علیؑ کا، فاطمہؑ، شبیرؑ، شبرؑ کا (صنعت تجنیس)

کسی مختصر تبصرے میں کسی منقبت گو کے شعری اور فنی محاسن پر گفتگو نہ ممکن ہے اور نہ مناسب۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ منقبتوں کا یہ مجموعہ قاری کی روحانی آسودگی و شعری ذوق کی تسکین کا بھرپور سامان فراہم کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں شاعری کے وہ بیشتر لوازمات اور خوبیاں موجود ہیں کہ جو ہماری کلاسیکی شاعری کی پہچان ہیں لیکن آج کی شاعری جن سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ مولائے کائنات کے علاوہ جناب فاطمہ زہرہ، دیگر ائمہ خصوصاً امام آخر الزماں کی مدح میں بھی کئی منقبتیں اس کتاب میں شامل ہیں۔ ٹائٹل دیدہ زیب بھی ہے اور بامعنی بھی۔ طباعت اور کاغذ معیاری ہے۔ قیمت بھی مہنگائی کے اس دور میں کچھ زیادہ نہیں۔ اس لیے در رسول ﷺ و آل رسول سے عقیدت رکھنے والوں اور اردو شاعری میں اس کا روایتی حسن تلاش کرنے والوں کے لیے بھی اس کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

فکاهیه

اتالیق بی بی

مرتب: ڈاکٹر انور حسین خاں

صفحات: 88، قیمت: 50 روپے

ناشر: مرکز ثقافت وتحقیق، علی گڑھ

مبصر: ڈاکٹر مظفر رضا، (پی ڈی ایف)، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

چودھری محمد علی ردولوی کا شمار اردو کے صاحب طرز انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانے، خاکے اور انشائیے انفرادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ادب اور تہذیب کے علاوہ جنس جیسے حساس موضوع بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں اور جس موضوع پر انھوں نے قلم اٹھایا اس میں اپنی انفرادیت کا نقش چھوڑا ہے۔ 'اتالیق بی بی' غالباً ان کی پہلی کتاب ہے اور بقول عبدالماجد دریا آبادی شاید عبدالحلیم شرر کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب مصنف کی زندگی ہی میں بہت کمیاب تھی۔ ڈاکٹر انور حسین خاں صاحب کا اس کتاب کا مسودہ حاصل کر کے اپنے وقیع مقدمے کے ساتھ شائع کرنا محمد علی ردولوی کی روح کو خراج عقیدت تو ہے ہی اردو زبان وادب کی ایسی خدمت ہے جو انھیں سنجیدہ قارئین ادب کے خصوصی شکریے کا مستحق بناتا ہے۔ اس کتاب میں چودھری محمد علی ردولوی نے فکاہیہ انداز میں ایسی بیبیوں کا قصہ بیان کیا ہے جن میں بحث اور کٹ حجتی کا مادہ بدرجۂ اتم ہوتا ہے اور قائل ہونا ان کے لیے کسر شان ہے۔ چودھری محمد علی ردولوی کی یہ تصنیف دو تہذیبوں کے تصادم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انتشار وتشنج کو بیان کرتی ہے۔ اس میں ایک طرف تو مرد انگریزوں کی کورانہ تقلید کے نتیجے میں کلب وغیرہ میں دلچسپی کو دکھایا گیا ہے تو دوسری طرف خواتین کے لیے اس تہذیب سے آمیز نہ ہوسکنا اور گوناگوں توہمات اس سے وابستہ کر کے شوہر سے بدظن ہو جانے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ بحث ومباحثہ اور تکرار کی شکل میں برآمد ہوتا ہے اور خانگی زندگی آدھا تیتر آدھا بٹیر بن کے رہ جاتی ہے۔ اس کتاب میں محمد علی ردولوی نے تفنن طبع کا سامان جمع کر کے خود کو الگ کر لیا ہے۔ وہ نہ تو مواعظ کرتے ہیں اور نہ ہی نفسیاتی تجزیہ کر کے مرض کی تشخیص وتدارک تلاش کرتے ہیں۔ گویا افادی ادب جس کے نعرے بعد میں بلند ہوئے اور جس کا مقصد ادیب کو طبیب بنانا تھا۔ محمد علی ردولوی کی اس تخلیق کا محرک نہیں۔ ان کا اصل کمال ان کے اسلوب اور انشا پردازی میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ صاحب طرز ادیب ہیں اور اپنی تصانیف سے ادب کا کام لینا جانتے بھی ہیں اور چاہتے بھی ہیں۔ ان کے افسانے، انشائیے، خاکے اور خطوط ادب میں اپنے دل آویز اسلوب کی بنا پر خصوصیت کے ساتھ یاد کیے جاتے ہیں۔ اس کتاب میں بھی انھوں نے ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کوئی شخص عورتوں کی زبان ونفسیات سے اس حد تک کیسے واقف ہوسکتا ہے کہ اس سے ایک پورا ادب پارہ تخلیق کر دے نہ کہیں تصنع کا شائبہ ہو نہ دلچسپی مجروح ہو۔ ایسے برجستہ اور برمحل مکالمے جو ذہن پر واقعے کا نقشہ کھینچ دیں ہمیں انیس ورسوا کی یاد دلا دیتے ہیں۔ غالباً میرے اس بیان پر مبالغے کا گمان ہو لیکن جن کی نظر سے یہ کتاب گزری ہے میرے قول کے مصدق ہوں گے۔ اس مختصر تبصرے میں اگر گنجائش ہوتی تو اقتباسات کی روشنی میں محمد علی ردولوی کی طرز نگارش کو زیادہ اچھے انداز سے متعارف کرایا جاسکتا تھا۔

یہ کتاب اپنے عہد کی تہذیب ومعاشرت کا کامیاب مرقع تو ہے ہی لیکن ہمارے عہد میں اس کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ وہ الفاظ جو دھیرے دھیرے ٹکسال سے باہر ہو رہے ہیں ان کو اپنے دامن میں پناہ دیے ہوئے ہے۔ پناہ تو لغت میں بھی مل جاتی ہے لیکن وہاں ان کی حیثیت مردہ جسم کی سی ہوتی ہے جب کہ تخلیقی فن پارے میں یہ زندہ سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک لفظ 'الداون' ہی کو لیجیے قصباتی معاشرت کے امین تو اس لفظ سے واقف ہوں گے لیکن شہروں میں آباد لوگ اگر اپنے بچوں سے دریافت کریں تو شاید ہی وہ اس کے معنی بتاسکیں، حالانکہ اب سے کچھ ہی عرصہ پہلے اس لفظ سے ہمارا ایسا واسطہ تھا کہ اس کے جاننے اور نہ جاننے میں خواندہ وناخواندہ کا فرق حائل نہیں تھا۔ اسی ضرورت کے پیش نظر مرتب نے آخر کتاب میں 'فرہنگ وحواشی' کے عنوان سے عسیر الفہم الفاظ کے معنی دیے ہیں ساتھ ہی فارسی اشعار وقرآنی آیات کا اردو ترجمہ، ضرب الامثال اور محاوروں کا مطلب بھی درج کر دیا ہے جس سے استفادے کا دائرہ زیادہ وسیع ہوگیا ہے۔ طباعت صاف ستھری اور نفیس ہے۔ امید ہے کہ ادب نواز طبقے میں اس کتاب کو پذیرائی ملے گی۔

معلومات عامہ

اقلیتوں کی تعلیم: پالیسیاں، پروگرام اور اسکیمیں، اکثر پوچھے جانے والے سوالات

این سی ای آر ٹی

صفحات: 108، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: نیشنل کونسل آف ایجوکیشن ریسرچ اینڈ ٹریننگ

مبصر: زبیر خاں سعیدی

بیشتر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سہولیات، خدمات اور آسانیاں دستیاب تو ہوتی ہیں لیکن ان تک رسائی اطلاعات نہ ہونے کے سبب ناممکن لگتی ہے، بالخصوص اقلیتوں کے لیے حکومت ہند کی جانب سے جو اسکیمیں چلائی جارہی ہیں ان کے بارے میں صحیح جانکاری لوگوں کے پاس نہیں ہوتیں یا ہوتی بھی ہیں تو وہ ان کو حاصل کرنے کی سعی نہیں کر پاتے۔

زیر تبصرہ کتاب ایک ایسا تصنیفی سرمایہ ہے جس میں اقلیتوں کی تعلیم، پالیسیوں، پروگراموں اور اسکیموں کے تعلق سے مکمل جانکاری دی گئی ہے، یہ اطلاعات نہ صرف کارگر ہیں بلکہ اس کو عام کرنے کے لیے اس کتاب کا حصول بھی بے حد آسان بنایا گیا ہے، محض ایک فون کال سے آپ گھر بیٹھے یہ کتاب حاصل کر سکتے ہیں جس کے لیے آپ کو ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ان لینگویجز، این سی ای آر ٹی کے چیئر پرسن محمد فاروق انصاری سے رابطہ کرنا ہوگا اور یہ کتاب وہ ڈاک سے آپ کے گھر بھجوا دیں گے۔ آپ ان سے ای میل پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔

اس دستاویزی تصنیف کا آغاز مخففات سے ہوتا ہے، عہد حاضر میں ایک طالب علم کو جن مخففات کا سامنا ہوتا ہے ان تمام کے فل فارمس اردو اور انگریزی زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔

اس کے فوراً بعد اقلیت کے تعلق سے سوال جواب کے انداز میں سیر حاصل گفتگو کی گئی جس سے اقلیت کا صحیح مفہوم، دستور ہند میں اس سے کیا مراد ہے، اقلیتوں میں کون کون سے گروہ شمار کیے جاتے ہیں، ان کی کل آبادی کیا ہے اور ان کے لیے کیا کیا فلاحی اقدامات حکومتی سطح پر کیے گئے ہیں اور کیے جارہے ہیں سب مفصل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ تقریباً 36 صفحات میں 51 قسم کے سوالات کا ان میں احاطہ کیا گیا ہے جس میں کثیر آبادی والے اضلاع، اقلیتوں کی فلاح کے لیے وزیر اعظم کا پندرہ نکاتی پروگرام، اقلیتوں کے آئینی حقوق وتحفظات، آئینی دفعات، اقلیتوں کی فلاح کے لیے بنائے گئے ایکٹ، قومی اقلیتی کمیشن کے امور، ریاستی اقلیتی کمیشنوں سے رابطے کے مکمل پتے، سچر کمیٹی کی سفارشات پر توجہ، ان اداروں کی تفصیلات جو اقلیتی طلبا کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں، این سی ای آر ٹی کا رول، مدرسہ تعلیم کی جدید کاری اور اقلیتوں کی تعلیم میں مدد کے لیے سروشکشا ابھیان (SSA) کے تحت کیا کیا انتظامات کیے گئے ہیں اس کی مکمل جانکاری آپ کو اس دستاویزاتی تصنیف سے بآسانی حاصل ہوسکتی ہے۔

اس کے بعد اسکیم کے نام سے ایک نیا باب ہے جس میں پری میٹرک اسکالرشپ، پوسٹ میٹرک اسکالرشپ، میرٹ کم فیس اسکالرشپ، مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن، خواجہ غریب نواز مہارت اسکیم، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے اقلیتی طلبا کے لیے مولانا آزاد نیشنل فیلوشپ، مفت کوچنگ اور مماثل اسکیمیں، نئی اڑان، مولانا آزاد صحت اسکیم، نئی روشنی اسکیم، سیکھو اور کماؤ اسکیم، پڑھو پردیس اسکیم، نئی منزل اسکیم، ترقی کے لیے روایتی فنون/ حرفتوں میں مہارتوں اور تربیت کے فروغ کی اسکیم (USTTAD)، ہماری دھروھر اسکیم، ڈیجیٹل خواندگی کے لیے سائبر گرام اور اقلیتوں کی تعلیم کے لیے دیگر ترقیاتی پروگرام جیسے ساکشر بھارت، جن شکشن سنستھان، نالندہ پروجیکٹ کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔

اس کے بعد ضمیمے کی شکل میں ہندوستان میں اقلیتی آبادی کی تقسیم و مردم شماری 2011، کثیر اقلیتی آبادی والے 90 اضلاع کی فہرست، سماجی و معاشی پیمانے پر قومی اوسط سے نیچے پائے جانے والے اضلاع، بنیادی سہولتوں کے پیمانے پر قومی اوسط سے نیچے پائے جانے والے اضلاع کی فہرست، ریاستی اقلیتی کمیشنوں کے مکمل پتے، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے تسلیم شدہ عربی مدارس/ اداروں کے مختلف نصابات اور ان کی فہرست اور مزید معلومات کے لیے حوالوں کا بھی ذکر ہے۔

ممکن ہے کہ یہ دستاویزات تمام اسکیموں کا احاطہ نہ کر رہی ہوں لیکن جن ماہرین نے مل کر اس کو تیار کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً تمام تر کا احاطہ اس میں شامل ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ہندوستان ایک کثیر ثقافتی، نسلی، مذہبی اور لسانی ملک ہے اور یہ کثرت ہی اس ملک کی قوت ہے، حکومت ہند نے مذہبی اور لسانی دونوں اقلیتوں کے لیے جو تحفظات کیے ہیں اس کا خاطر خواہ فائدہ اس کے ذریعے اٹھایا جا سکتا ہے۔

قوی امید ہے کہ طلبا، اساتذہ، والدین، دیگر متعلقین اور اداروں کے لیے یہ دستاویز مفید ثابت ہوگی۔ کتاب حاصل کرنے کے لیے اس میل آئی ڈی پر رابطہ کیا جا سکتا ہے: mfansarincert@gmail.com

رسائل و جرائد

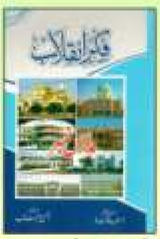

نام مجلہ: فکر انقلاب (مدارس نمبر)

مدیر اعلیٰ: اسعد مختار، مدیر: احسن مہتاب

صفحات: 880، قیمت: 500، اشاعت: 2018

ناشر: آل انڈیا تنظیم علما حق، نئی دہلی

مبصر: ابرار احمد اجراوی، رایام فیکٹری، مدھوبنی، بہار

آل انڈیا تنظیم علما حق کا تحریری ترجمان مجلہ 'فکر انقلاب' اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ ہے، جو یک موضوعی خصوصی شماروں کی سیریز کے تعلق سے ہند و بیرون ہند میں پہچانا جاتا ہے۔ اس کے سابقہ خصوصی دستاویزی شماروں نے علمی و ادبی حلقوں میں تجسس کی لہر دوڑا دی ہے۔ یہ مجلہ ہر سال کسی خاص موضوع یا کسی عبقری شخصیت پر اہل قلم سے مضامین لکھوا کر ضخیم شمارہ شائع کرتا ہے اور اس کی ہند و پاک، بنگلہ دیش اور دیگر ممالک کے اردو داں حلقوں میں بڑے پیمانے پر ترسیل بھی کرتا ہے۔ اس سے پہلے مشاہیر دیوبند پر شائع ضخیم شماروں کو مدارس و مکاتب اور مخصوص دینی و علمی حلقوں میں بنظر استحسان دیکھا گیا ہے۔ مولانا قاسم نانوتوی نمبر، شیخ الہند مولانا محمود حسن نمبر، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نمبر کی بے پناہ مقبولیت کے بعد حالیہ مدارس نمبر کی اشاعت نے بھی مدارس نواز حلقوں میں ریکارڈ ساز مقبولیت حاصل کی ہے۔

اداریہ اور نامور شخصیات کے پیغامات سے زیر نظر شمارے کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس کے تحریری مشمولات کو تین ابواب: باب مدارس، باب تعلیم اور باب تنظیم میں منقسم کیا گیا ہے۔ باب مدارس میں ملک و بیرون ملک کے ان نامور قلم کاروں کے نئے پرانے مقالات و مضامین کو شامل کیا گیا ہے، جو مدارس کی وسیع تر خدمات اور فضلائے مدارس کے مآثر و مفاخر سے مباحثہ قائم کرتے ہیں۔ چوں کہ مدارس کی شبیہ کو مسخ کرنے کی سازش چہار سو ہو رہی ہے، اس لیے ان مضامین میں مدارس کے مثبت زاویوں اور معاشرے کی تعمیر و ترقی میں ان کے نمایاں کردار کو روشنی میں لایا گیا ہے۔ اس باب میں عصر حاضر کے معتبر ناقد حقانی القاسمی کا مضمون تمہید و تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون 'دار العلوم دیوبند، ایثار اور آزادی کی تحریک' میں ام المدارس دیوبند کی علمی، ادبی، صحافتی، سماجی، دعوتی اور تصنیفی و تالیفی خدمات کو نظر میں رکھا گیا ہے اور جد و جہد آزادی اور قومی یک جہتی کے فروغ میں دیوبند کے کردار کو بھی مبرہن کیا گیا ہے۔ مضمون کا انداز تحریر غیر روایتی ہے، جس سے قاری اول وہلہ میں متاثر ہوتا ہے اور پورے مضمون کی خواندگی کے بعد مدارس کے تعلق سے اس کے فکر و نظر کا زاویہ تبدیل ہوتا نظر آتا ہے۔ باب مدارس میں ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، سید محمد شاہد سہارن پوری، نسیم اختر شاہ قیصر، محمد اللہ قاسمی کے مضامین بھی عام ڈگر سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں اور مدارس کی مختلف جہات کا انکشاف کرتے ہیں، اس باب کا ایک اور اہم مضمون رسالے کے نگراں مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی کا ہے، جس میں پڑوسی ملک پاکستان کے اہم اور مرکزی دینی مدارس کے تعلیمی منصوبہ جات، وہاں کے حسن انتظام اور ان کی جدید تعلیمی تکنیک سے ہم آہنگی کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے ہندوستان کے مدارس کو بھی تعلیم کے میدان میں روایت سے نکل کر جدت سے ہم آہنگ ہونے اور تعلیم کے میدان میں نئے عصری تقاضوں پر لبیک کہنے کی دعوت دی گئی ہے۔

مدارس کا تعلق راست طور پر تعلیم و تدریس سے ہے کہ یہ مدارس مردم سازی کے کارخانے اور آدم گری کی فیکٹریاں ہیں، اس لیے باب تعلیم میں مشاہیر اور دانشوران کے اہم مضامین شامل کیے گئے ہیں، یہ مضامین تعلیم کے میدان میں مدارس کی متنوع خدمات کے جائزے پر مبنی ہیں۔ اس باب کے چند مضامین قند مکرر کے طور پر مندرج ہوئے ہیں، کیوں کہ ان کی شمولیت سے غور و فکر اور تعلیم کی جدید کاری کے تئیں نئے مباحث کا در وا ہوتا ہے اور یہ ارباب مدارس اور ان کے ذمے داران کو ان نئے خطوط پر سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ دینی مدارس: اصلاح وقت کی اہم ضرورت (ڈاکٹر محمد عامر طاسین)، دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور: اس کی جامعیت و معنویت اور دور رس نتائج و ثمرات (نور الحسن راشد کاندھلوی)، دینی تعلیم، مدارس اور مستقبل میں درپیش چیلنجز (محمد حنیف جالندھری)، مدارس اسلامیہ کی جدید کاری پر ایک نظر (ڈاکٹر محمد یسین قاسمی)، عربی مدارس کا نصاب تعلیم اور عصری تقاضے (مولانا ندیم الواجدی)، دینی مدارس کے اساتذہ کا سماجی رول (ڈاکٹر وارث مظہری قاسمی)، فارغین مدارس کی صحافتی خدمات (سہیل انجم)، مدارس کے مجلات (حقانی القاسمی)، میڈیا اور دینی مدارس (شکیل شاغل)، ہمارے دینی مدارس: آئینی تحفظات (سید شریف الحسن نقوی)، دینی مدارس میں تکنیکی تعلیم (مولانا اخلاق حسین قاسمی)، مسلم لڑکیوں کی تعلیم اور مدارس دینیہ (عمید الزماں کیرانوی)، مسلمانوں کی تعلیمی حالت اور دینی مدارس کا رول (عبد الحمید نعمانی)، اردو کی ترقی میں مدارس کا حصہ (ڈاکٹر شکیل احمد)، مدارس اسلامیہ سے عنقا ہوتی شفافیت (عابد انور)، انگریزی مضمون (منظر امام) وغیرہ اس باب کے بنیادی اور اہم مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مذکورہ نکتہ دان مدارس کی تحریریں قلب و نظر کو روشنی عطا کرتی ہیں جن میں چل کر منزل تک پہنچا جا سکتا ہے اور مدارس کے مثبت کردار سے واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔

امید ہے کہ رسالے کے مشمولات سے غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا ازالہ ہوگا، مدارس دشمنی اور تعصب کی چادر چاک ہوگی اور اغیار و احباب جو لوگ مدارس کے تعلق سے منفی نظریہ رکھتے ہیں، اس سے ان کی فکر و نظر تبدیل ہوگی اور وہ مدارس کی تعلیمی اور

سماجی خدمات کا اعتراف کرنے میں بخل یا تنگ نظری سے کام نہیں لیں گے۔ ان مدارس نے عصری اور تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے میدان میں بھی اپنا نشان قدم چھوڑا ہے۔ مدارس کے فضلا نے یو پی ایس سی اور ریاستی پبلک سروس کمیشن کے مقابلہ جاتی امتحانات میں بھی عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ قاضی القضاۃ، ڈپٹی کلکٹر اور صدر شعبہ وڈین تک کے عہدوں پر متمکن ہوئے ہیں۔

مدارس اور تعلیم عصر حاضر کا ایک سلگتا ہوا موضوع رہا ہے، اس سے قبل بھی ملک کے کئی اہم رسائل وجرائد اور اخبارات مدارس نمبر شائع کرکے مدارس کے سیاق وسباق سے اپنے قارئین کو متعارف کرا چکے ہیں ہفت روزہ عالمی سہارا نئی دہلی ہفت روزہ نئی دنیا نئی دہلی، روزنامہ قومی تنظیم پٹنہ ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی، اردو دنیا وغیرہ کے مدارس نمبر بھی شائع ہو چکے ہیں، مگر میرے علم ومطالعہ کے مطابق اتنا ضخیم، دستاویزی اور متنوع مدارس نمبر اس سے پہلے شائع نہیں ہوا ہے۔ تقریباً 900 صفحات پر مشتمل فکر انقلاب کے زیر نظر شمارے میں شامل تمام مضامین معتبر اور مشہور اہل قلم کی کاوش ہیں، وہ سرسری نہیں، چشم کشا اور فکر انگیز ہیں اور تاریخی دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ فکر انقلاب کے سابقہ شماروں کی طرح، مدارس نمبر کی بھی علمی حلقوں میں پذیرائی ہوگی اور ارباب فکر ونظر اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور علم دوست حلقہ اس سے مستفید ہوگا۔ ٹائٹل دیدہ زیب اور طباعت وکاغذ بہت معیاری ہے، جو دوسرے مدارس نمبر سے فکر انقلاب کے زیر نظر خصوصی شمارہ کو ممتاز کرتا ہے۔

سہ ماہی ادب سلسلہ

مدیر: محمد سلیم علیگ، مدیر اعزازی: تبسم فاطمہ

جلد: 3، شمارہ: 6، جنوری تا مارچ 2018

صفحات: 96، قیمت: 80 روپے

ناشر: ادب سلسلہ پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: صبیحہ اطہر، 9/322، للتا پارک، لکشمی نگر، دہلی 92

سہ ماہی ادب سلسلہ دہلی سے شائع ہونے والا ایک ایسا خالص ادبی رسالہ ہے جس نے بہت کم مدت میں ہندوستان کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر اپنی مخصوص شناخت حاصل کر لی ہے۔ محمد سلیم علیگ کی ادارت میں شائع ہونے والے اس جریدے کی اہمیت اس لیے بھی بہت زیادہ ہے کیونکہ اس نے اپنی ہر اشاعت میں کسی نہ کسی خاص موضوع پر ڈھیر سارا مواد ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے مہیا کرایا ہے۔

ادب سلسلہ کے زیر نظر شمارے میں بھی ترقی پسند تحریک کے آغاز اور اس کے منشور نیز تحریک کی ضرورت اور اس کے نظریاتی پہلوؤں پر خاصا مواد جمع کر دیا گیا ہے جو یقینی طور پر ادب کے سنجیدہ قارئین اور نئی نسل کے ریسرچ اسکالرز کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اس حوالے سے دیکھیں تو اس شمارے میں ترقی پسند تحریک پر کئی مضامین شریک شمارہ ہیں، جن میں ترقی پسند تحریک کا پس منظر، ترقی پسند افسانہ آغاز وارتقا، ترقی پسند ادبی تحریک کا آزادی کی جدوجہد میں حصہ، ترقی پسند تحریک کا احیا اور اردو ناول پر ترقی پسند تحریک کے اثرات اہم مضامین ہیں جن کے مطالعے سے ادب میں ترقی پسند تحریک کی ضرورت اور اہمیت نیز اس کی سیاسی اور سماجی افادیت کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

ترقی پسند مصنفین کی بنیاد اگرچہ لندن میں 1935 میں پڑ چکی تھی مگر اس کی پہلی کانفرنس 1936 میں لکھنؤ میں منعقد ہوئی جس کی صدارت منشی پریم چند نے فرمائی اور اس کانفرنس میں اس انجمن کے منشور کو بھی طے کر دیا گیا تھا، جس میں خصوصی طور پر ترقی پسند مصنفین کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ ادیب کو ظلم وجبر اور سامراجی اقتدار کے خلاف اپنی آواز بلند کرنی چاہیے یعنی آزادی کے جذبے کے تحت عوام میں اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، دیگر الفاظ میں ترقی پسند مصنفین کو ایسا ادب تخلیق کرنا چاہیے جس میں مقصدیت ہو اور اس کا براہ راست تعلق مظلوم اور مزدور طبقے کے عوام سے ہو۔ اسی کانفرنس میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے خود پریم چند نے فرمایا تھا کہ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، اس طرح کے مضامین ہماری تازہ کار ادبی نسل کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

اسی شمارے میں 'اردو ناول پر ترقی پسند تحریک کے اثرات' کے عنوان سے ایک مضمون شامل ہے جس میں ترقی پسند تحریک کے زمانے میں لکھے گئے اردو ناول کا تذکرہ ہے جو اس تحریک کے منشور اور مقصدیت کے تحت لکھے گئے۔ جس میں قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری اور کرشن چندر وغیرہ کے ذریعے تخلیق کیے گئے ناولوں میں مقصدیت اور ترقی پسند تحریک کے منشور کی تلاش کی گئی ہے کہ آیا ان میں عوامی فلاح وبہبود اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا جذبہ ہے کہ نہیں۔ زیر تبصرہ شمارے میں علی احمد فاطمی کا بھی ایک مضمون شامل ہے جس کا عنوان ترقی پسند تحریک کا 75 سالہ ادبی سفر ہے، حالانکہ ناقدین میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی عمر 75 سال ہے بھی کہ نہیں کیونکہ 1980 میں جدیدیت کے رجحانات سامنے آنے لگے تھے اور شعرا اور ادبا کا ایک بہت بڑا حلقہ پوری شدت سے جدیدیت کی حمایت میں پرچم بلند کیے ہوئے تھا، اسی شمارے میں علی احمد فاطمی نے عاصم شہنواز شبلی، خالد عبادی اور سراج اجملی کے اشعار کا حوالہ دے کر ان میں ترقی پسندیت کی نشاندہی کی ہے حالانکہ یہ شعرا شاید ہی خود کو ترقی پسند کہلوانا پسند کریں کیونکہ یہ سارے لوگ 1980 کے بعد ہی نمایاں طور پر سامنے آئے ہیں۔

اس شمارے میں اسرار گاندھی، نسترن احسن فتیحی، ڈاکٹر افشاں ملک اور تسنیم کوثر کے افسانے شامل ہیں جو اپنے مواد، تکنیک اور ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے لائق مطالعہ ہیں۔ ان افسانوں کے موضوعات اور کردار ہماری روزمرہ زندگی سے حاصل کیے گئے ہیں جن میں عصری شعور وآگہی کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اسی شمارے میں مشرف عالم ذوقی کے دو افسانے قطار میں ایک چہرہ اور گلیشیئر ٹوٹ رہے ہیں شامل ہیں۔ مشرف عالم ذوقی بلاشبہ ہمارے عہد کے ایک اہم افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں جو لازمی طور پر اپنی تخلیقات کے موضوعات کو موجودہ سیاسی اور سماجی تبدیلیوں اور عام آدمی کے روزمرہ کے مسائل ومصائب سے حاصل کرتے ہیں۔ ان کے افسانے پڑھ کر قاری اپنے اردگرد ہونے والی سیاسی اور سماجی اتھل پتھل سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔

غزلوں کے باب میں عالم خورشید، عذرا نقوی اور کہکشاں تبسم کی غزلیں شامل ہیں، میرے نزدیک یہ تینوں تخلیق کار ہماری نئی نسل کے نمائندہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے یہاں غزل کا ایک منفرد اور خوبصورت لہجہ موجود ہے، عالم خورشید نے شاعری میں اپنی راہ الگ بنائی ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں سے آگے نکل چکے ہیں۔

ان شعری نمونوں میں عصری آگہی اور موجودہ سیاسی صورت حالات کا عکس محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ شہناز نبی، اسئی بدر زبیری اور تبسم فاطمہ کی نظمیں بھی کم وبیش اسی تیور کی نظمیں ہیں اور رسالے کے وقار میں اضافہ کرتی ہیں۔ تبسم فاطمہ نے رسالے کے آخر میں ایک اداریہ لکھا ہے جس میں یہ دعوی کیا گیا ہے کی ترقی پسند تحریک کے دوسرے دور کی شروعات ہو چکی ہے، حالانکہ اسی تحریر میں یہ اعتراف بھی کیا گیا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی دھوم 1936 سے 1960 تک رہی ہے اور اب دوسرے دور کی شروعات ہو چکی کیونکہ ملک کی موجودہ فضا میں خوشی کے نغمے نہیں گائے جا سکتے۔ الجھی الجھی علامتوں اور استعاروں کا سہارا لے کر ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔

مجموعی طور پر ادب سلسلہ موجودہ عہد کی تخلیقی فضا میں امید کا سورج لے کر روشن ہوا ہے، جس کے لیے محمد سلیم علیگ ان تھک محنت اور اردو دوستی کے لیے قابل مبارک باد ہیں۔ ■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبر نامہ

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

آٹھواں امیر خسرو میموریل لیکچر

نئی دھلی: شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے اعجاز خسروی کے حوالے سے امیر خسرو توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی اور بحیثیت مقرر پروفیسر اسد علی خورشید ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات فارسی علی گڑھ نے شرکت کی، جن کا استقبال پروفیسر چندر شیکھر نے گلدستے سے کیا اور بطور صدر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے شرکت کی۔ پروگرام کی ابتدا پروفیسر علیم اشرف خان صدر شعبۂ فارسی کے تعارفی کلمات سے ہوئی۔ اس کے بعد پروفیسر اسد علی خورشید نے اعجاز خسروی کے عنوان سے ایک بلیغ خطبہ پیش کیا جس میں انھوں نے اعجاز خسروی کے پانچوں رسالوں پر فرداً فرداً مفصل روشنی ڈالی اور انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ امیر خسرو سے زیادہ مستند شخص کوئی نہیں ہوسکتا، جس نے بلبن سے لے کر تغلق کے عہد تک مشاہدہ کیا۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے اس پروگرام کے انعقاد کے لیے پروفیسر علیم اشرف خان کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے پروفیسر اسد علی خورشید کو بھی بہترین خطبے کے لیے مبارکباد پیش کی، نیز انھوں نے اعجاز خسروی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اعجاز خسروی ایک ایسی تصنیف ہے جس کو سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے اور پروگرام کے آخر میں شعبہ فارسی ذاکر حسین کالج کی استاد ڈاکٹر فرحہ ادیبہ کی کتاب 'افسانہ بھرت پور' کا اجرا بھی ہوا۔ آخر میں شکریے کی رسم پروفیسر راجندر کمار نے ادا کی جبکہ نظامت ڈاکٹر علی اکبر شاہ نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اپریل 2018

'اردو میں غیر افسانوی نثری اصناف' کے موضوع پر منعقدہ سمینار کا منظر

اردو میں غیر افسانوی نثری اصناف

جلگاؤں: شاہین لائبریری جلگاؤں اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے 'اردو میں غیر افسانوی نثری اصناف' کے عنوان سے ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس سمینار کی صدارت مشہور نقاد سلیم شہزاد نے کی۔ پروگرام کا آغاز رفیق پٹوے کی تلاوت قرآن سے ہوا۔ اس کے بعد یاسر عظیم نے نعت پیش کی۔ عبدالغفار نے شمع فروزی سے پروگرام کا افتتاح کیا۔ مبین احمد نے مہمانوں کا استقبال کیا اور ساتھ ہی ان کا تعارف بھی پیش کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اقبال شاہ، ڈاکٹر ہارون بشر، پروفیسر غیاث عثمانی، ایڈوکیٹ حتیش پوار اور اشوک کوتوال بطور مہمان خصوصی موجود تھے۔ سمینار میں ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری نے تذکرہ نویسی، ایم مبین نے سفرنامہ نگاری، ڈاکٹر عظیم راہی نے مکتوب نگاری، خورشید حیات نے تبصرہ نویسی، نورالحسنین نے خاکہ نگاری اور معین الدین عثمانی نے انشائیہ نگاری جیسے موضوعات پر مقالات پیش کیے۔ مشتاق کریمی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ سلیم شہزاد نے صدارتی خطاب کیا۔ مقیم احمد کی جانب سے رسم شکریہ کی ادائیگی پر اجلاس کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' ممبئی، 4 اپریل 2018

ہندوستان میں اردو

بجنور: خلیل میموریل ویلفیئر سوسائٹی کی طرف سے آر۔ بی۔ ڈی۔ ڈگری کالج میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی جانب سے ایک روزہ قومی سمینار 'ہندوستان میں اردو' منعقد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کنور رانی روچی ویرا نے اردو کے تئیں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سمینار کی صدارت اسد رضا نے کی جس میں انھوں نے کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک اردو کے حالات پر تفصیل سے گفتگو کی۔ سمینار کا آغاز پنجاب اردو اکادمی کے سابق سکریٹری ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنے ان الفاظ کے ساتھ کیا کہ دیش کی مضبوطی ترقی اور سالمیت کے لیے اردو زبان کی ترقی ضروری ہے۔ انھوں نے اردو زبان کو روزگار سے جوڑنے کی بات کہی۔ اس سمینار میں ڈگری کالج کی پرنسپل ڈاکٹر وروشی بھاردواج نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اردو ہندی کے رشتے کو جوڑنے اور مضبوط کرنے کی بات کہی۔ سمینار میں ڈاکٹر ذکیہ رفعت، ڈاکٹر شکیلہ، ڈاکٹر سشما، منیشا شرما نے بھی شرکت کی۔ سمینار کے آخر میں ریحانہ فاطمہ نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 25 اپریل 2018

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

سول سروسز میں مسلم طلبہ کی کامیابی میں اضافہ

نئی دھلی: سول سروسز میں اس سال بھی مسلم طالب علموں کی اچھی کارکردگی سے نہ صرف ملت اسلامیہ ہند میں خوشی پائی جارہی ہے بلکہ اس سے مرکزی وزیر برائے

اقلیتی امور مختار عباس نقوی بھی کافی خوش ہیں۔ اپنی رہائش گاہ 7 صفدر جنگ مارگ پر صحافیوں سے بات کرتے ہوئے مسٹر نقوی نے خوشی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ گزشتہ سال کے مقابلے اس سال سول سروسز میں کامیاب مسلم بچوں کا فیصد بڑھا ہے جو خوش آئند ہے۔ انھوں نے کہا کہ گزشتہ سال ملک بھر میں کل 1099 طالب علم سول سروسز کے امتحان میں کامیاب ہوئے تھے جن میں 52 بچے مسلم تھے اور یہ کل 4 اعشاریہ 5 فیصد تھا جبکہ اس سال کے جو نتائج آئے ہیں ان میں کامیابی کا فیصد بڑھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس مرتبہ کل 990 بچے سول سروسز میں کامیاب ہوئے ہیں جن میں 51 مسلم بچے شامل ہیں اور اس مرتبہ یہ 4 اعشاریہ 5 فیصد سے بڑھ کر 5 اعشاریہ 15 فیصد ہوگیا ہے۔ مسٹر نقوی نے کہا مسلم بچوں میں قابلیت ہے، اہلیت ہے، صلاحیت ہے اور اس کی بنیاد پر وہ سول سروسز میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا تعاون صرف یہ ہے کہ ہم نے بھی کچھ بچوں کے لیے مفت کوچنگ کا انتظام کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس مرتبہ ہم نے 126 بچوں کو مفت کوچنگ کرائی تھی جن میں سے تقریباً 12 بچوں نے کامیابی حاصل کی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب'، 2 مئی 2018

روزنامہ 'مسلمان' کے 91 سال مکمل

چننئی: جہاں دنیا بھر میں اخبارات کے کام کمپیوٹر پر ہوتے ہیں، وہیں چنئی سے شائع ہونے والا اردو اخبار 'دی مسلمان' دنیا کا ہاتھ سے لکھا جانے والا واحد اخبار ہے جس کی قیمت صرف 75 پیسے ہے اور اس کی اشاعت کو 91 سال ہوگئے ہیں۔ ایک خبر رساں ادارے کے مطابق ریاست چنئی میں آج بھی ایک ایسا اخبار شائع ہوتا ہے جسے اس جدید دور میں بھی ہاتھ سے تحریر کیا جاتا ہے۔ 'دی مسلمان' اخبار کی اشاعت کا آغاز 1927 میں سید عزت اللہ نے کیا تھا اور آج 90 سال گزرنے کے بعد ان کے پوتے سید عارف اللہ ماضی کی یاد تازہ کرتے ہوئے اخبار کو ہاتھ سے تحریر کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

عارف اللہ 10 برس سے اس اخبار سے منسلک ہیں اور مختلف تعلیمی شعبوں میں 13 ڈگریاں رکھتے ہیں۔ سید عارف اللہ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ خبر کی کاٹ چھانٹ کے علاوہ اخبار کی طباعت و اشاعت اور تقسیم جیسے تمام معاملات خود چلاتے ہیں۔ دو کمروں پر مشتمل دفتر میں کوئی کمپیوٹر وغیرہ نہیں ہے۔ ایک کمرے کو میزبانی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں چھاپہ خانہ ہے۔ اس وقت اخبار کے تین مدیر ہیں جبکہ پہلی اشاعت سے اب تک اخبار کی قیمت میں اضافہ نہیں کیا گیا، آج بھی اخبار کی قیمت صرف 75 پیسے ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 1 مئی 2018

غیر اردو میڈیم کے طلبہ کو اردو سکھانے کے لیے کلاسیز

ممبئی: مخدوم ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی احمد نگر نے 4 سال قبل یہاں کے مسلم طلبہ جو مراٹھی اور انگریزی میڈیم میں زیر تعلیم تھے کو اردو پڑھانے کے لیے گرمی کی چھٹیوں میں خصوصی کلاسیس شروع کی تھیں جو کامیابی سے جاری ہیں۔ ہر سال گرمی کی چھٹیوں میں یہاں اس طرح کے طلبہ کو اردو کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن اب اس کلاس میں ان طلبہ کے علاوہ ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر، اور وکیل جیسے اہم پیشہ جات سے منسلک برادران وطن بھی اردو سیکھ رہے ہیں۔ گزشتہ 2 سال میں اس طرح کے تقریباً 150 تعلیم یافتہ امیدوار اردو سیکھ چکے ہیں جن میں 90 فیصد برادران وطن ہیں۔ امسال بھی 6 سے 30 مئی کے درمیان نیچے پورہ میں واقع رحمت سلطان ہال میں اردو کی یہ خصوصی کلاس چلائی جائے گی جس میں اب تک 12 افراد نے داخلہ لیا ہے جن میں سب سے اعلیٰ تعلیم یافتہ برادران وطن ہیں جو صرف اردو زبان سیکھنا چاہتے ہیں یہ باتیں مذکورہ سوسائٹی کے فعال رکن عابد دو لے خان نے کہیں۔

اس موقعے پر احمد نگر کے ایڈوکیٹ تانبلے نے انقلاب کو بتایا کہ ''مجھے 16 زبانیں آتی ہیں مگر اردو میری پسندیدہ زبان ہے۔ جب سے اردو سیکھی ہے روزانہ اس کی مشق کرتا ہوں اور پڑھنے کے علاوہ بول چال میں بھی اردو کا ہی استعمال کرتا ہوں۔ اس زبان کی مٹھاس کا تو جواب نہیں ہے۔ یہ دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے۔ اردو زبان و ادب کا استعمال کر کے ہم انسانی رشتوں کو مضبوط اور مستحکم کرسکتے ہیں۔'' تانبلے کے بقول ''مراٹھی، گجراتی، ہندی، تمل اور انگریزی ہر زبان کو بہت قریب سے دیکھا اور استعمال کیا ہے مگر اردو کی بات ہی کچھ الگ ہے۔ اس کا استعمال کرتے ہوئے مجھے جو دلی راحت اور سکون ملتا ہے وہ کسی اور زبان میں نہیں ہے۔ مذکورہ ادارے کا مشکور ہوں جس نے مجھے اردو سکھلائی۔''

انجینئرنگ کے طالب علم ادتیہ ویدنیکر کے مطابق ''اسکولی تعلیم کے دور میں ایک مرتبہ شہید بھگت سنگھ کے تعلق سے پڑھتے ہوئے، ایک شعر میری نظروں سے گزرا، سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے، اس شعر نے مجھ میں اردو زبان سیکھنے کا جذبہ پیدا کیا۔ اس وقت سے اردو شعروشاعری کا ایسا جنون سوار ہوا جو اب بھی میری ذات کا حصہ ہے۔ اردو میں شعروشاعری کا جو خزانہ موجود ہے شاید ہی کسی اور زبان میں ادب کا ایسا ذخیرہ ہو۔ اسی لیے اردو سیکھنے اور بولنے کا جہاں موقع ملتا ہے اسے میں نہیں چھوڑتا۔ اسی شوق کی بنا پر میں نے مذکورہ کلاس میں اردو سیکھی اور اب بھی اردو سیکھنے کا سفر جاری ہے۔ اس کلاس میں اردو سکھانے کی ذمے داری احمد نگر کی ایک اسکول کی ہیڈ ماسٹریس نجم السحر کھوکر ادا کر رہی ہیں۔ جبکہ شیخ فیروز (راجو بھائی) بھی اس کلاس کو جاری رکھنے میں پیش پیش ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' ممبئی، یکم مئی 2018

قرآنی آیات پر مشتمل پینٹنگس کی نمائش

نئی دھلی: قومی دارالحکومت کے اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار آرٹس میں قرآنی آیات سے منقش پینٹنگس نمائش کے لیے رکھی گئیں۔ یہ پینٹنگس قطر کے مشہور فن کار حسن الملا کی تھیں، جو قرآنی آیات اور اسمائے عظیم کے استعمال سے اپنے خیالات کو کینوس پر رنگوں کی شکل میں بکھیرنے کے لیے مشہور ہیں۔ آئی جی این سی میں روحانی نمائش کے موضوع پر افتتاحی تقریب ہوئی جس میں انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشن (آئی سی سی آر) کی ڈپٹی ڈائرکٹر نمرتا ایس کمار، قطری سفیر برائے ہند محمد خاطر ابراہیم الخاطر، آئی سی سی آر کے ڈائرکٹر جنرل ریوا گانگولی داس نے حسن الملا کی انوکھے فن پاروں کی ستائش کرتے ہوئے اسے روحانی آرٹ کا شاندار مظہر قرار دیا۔ حسن الملا نے اپنے 25 فن پاروں کا تعارف کرایا اور بتایا کہ میرے اندر کا آرٹسٹ قرآنی آیات کی خوبصورتی اور سمندر کی جادوگری سے بہت متاثر ہے، اس لیے میری کاوشوں میں قرآنی آیات اور سمندری مناظر کا عکس کھل کر نظر آتا ہے، اس کے علاوہ عرب کے تاریخی مقامات، باغات، پہاڑ، سمندر، شہری و ثقافتی لباس کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آرٹ وثقافت دنیا کو قریب لانے میں پل کا کردار ادا کرتے ہیں، ہندوستان اور قطر کے مابین انتہائی قریبی اور دوستانہ مراسم ہیں۔ اس نمائش کا اہتمام کلچرل ولیج فاؤنڈیشن دوحہ میں ہندوستانی سفارت خانے اور ہندوستان میں قطری سفارت خانے کی مدد سے کیا گیا۔ اس موقعے پر دوحہ میں ہندوستانی سفیر پی کمارن نے کہا کہ فن کی نمائش اور اس کا اظہار فنکاروں کے خیالات کو وسعت بخشتا ہے، ہمیں خوشی ہے کہ ہم قطر کے ایک فنکار کی میزبانی کر رہے ہیں اور ان کے آرٹس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ آئی سی سی آر کی ڈائرکٹر جنرل ریوا گانگولی نے حسن الملا کی پینٹنگس سے متاثر ہوتے ہوئے کہا کہ قرآنی آیات اور قدرتی نظاروں کو کچھ اس طرح پرویا گیا ہے کہ ہر تصویر اپنے اندر گہرائی رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں اسلامی پس منظر پر مشتمل اس شاندار کاوش سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 مئی 2018

دھلی:

غالب شیکسپیئر جیسے ہیں: ہیما مالنی

نئی دھلی: ممبر پارلیمنٹ ہیما مالنی نے بستی حضرت نظام الدین کا دورہ کیا۔ یہاں انھوں نے درگاہ حضرت نظام الدین اور حضرت امیر خسرو کی زیارت کی۔ عرس محل، چونسٹھ کھمبا

کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ غالب سے انھوں نے خاص تعلق کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دور حاضر میں غالب کے بارے میں غالب اکادمی کی لائبریری اور میوزیم سے بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے اردو سیکھی تھی۔ انھوں نے اردو میں لکھ کر دکھایا اور کہا کہ مزید مشق کی ضرورت ہے، اردو بہت میٹھی زبان ہے۔ انھوں نے غالب کے کلام میں اپنی دلچسپی دکھائی۔ انھوں نے کہا کہ غالب دنیا کے بڑے شاعروں میں سے ہیں۔ برطانیہ میں جیسے شیکسپیئر ہیں، ویسے ہمارے یہاں غالب ہیں، لیکن وہاں شیکسپیئر کے لیے بہت کچھ ہوا ہے، لیکن ہمارے یہاں بہت کم کام ہوا ہے۔ غالب اکیڈمی کی طرف سے ان کی خدمات میں دیوان غالب کا ہندی ایڈیشن اور شرح دیوان غالب پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اپریل 2018

شعری نشست

نئی دھلی: آل انڈیا اردو ہندی ایکتا ٹرسٹ کے زیر اہتمام بھرت نگر نیو فرینڈس کالونی میں ایک ادبی شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت مولانا عتیق الرحمن قاسمی اور نظامت فرید قریشی نے کی۔ مہمانان خصوصی کے طور پر سیماب سلطانپوری، منیر ہمدم، ڈاکٹر حنیف ترین، ڈاکٹر رام لوچن اور ڈاکٹر عفت زریں نے شرکت کی۔ اس موقعے پر تمام مہمانان وشعرائے کرام کی گلپوشی استقبالیہ کمیٹی کے ارکان نے کی۔ نشست میں ہیپ سنس کے ڈائرکٹر محمد عارف نے شمع روشن کی۔ اظہار خیال کرتے ہوئے مہمانان نے کہا کہ اردو ہندی کا یہ سنگم وقت کی اہم ضرورت ہے کیونکہ یہ ہماری تہذیب وتمدن کی شناخت ہے۔ اردو کے شاعر ہوں یا ہندی کے کوی، یہ سب پیار ومحبت کا پیغام اپنی شاعری کے ذریعے عوام تک پہنچا کر گنگا جمنی تہذیب کو مضبوط کر رہے ہیں۔ جن شعرا نے اپنے کلام سے نوازا، ان میں جاوید قمر، مجاز امروہوی، قاسم شمسی، امیر امروہوی، احمد علوی، معین قریشی، سراج طالب، ڈاکٹر بسمل عارفی، سیف الدین سیف، جاوید مشیری، الیس یوظفر، کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اخیر میں ٹرسٹ کے چیئرمین فریدی قریشی وائس چیئرمین کرشنا شرما دامنی اور کنوینر ذاکر حسین نے مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مئی 2018

اردو شاعری پر مذاکرہ

نئی دھلی: ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کالج کے شعبہ اردو میں اردو شاعری پر مذاکرے کا اہتمام کیا گیا، جس میں این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ شاعر اپنے احساسات وجذبات کو لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔ وہ سماج میں ہونے والے چیلنجوں کو محسوس کرتے ہیں اور شعر کے ذریعے اپنی بات کہتے ہیں۔ انھوں نے طلبہ کو مشورہ دیا کہ وہ ایمانداری سے پڑھائی پر توجہ دیں اور سیاست سے پرہیز کریں۔ مذاکرے کے مہمان خصوصی ڈاکٹر مشتاق عالم قادری نے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جی کے اروڑہ کو مبارکباد دی۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر جی کے اروڑہ گنگا جمنی تہذیب کے مثال ہیں۔ ان کی بدولت اس کالج میں اردو پھل پھول رہی ہے۔ کالج کے پرنسپل نے پروفیسر ارتضیٰ کریم اور مشتاق عالم قادری کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کے آخر میں شعبہ ہندی کی ڈاکٹر چترا رانی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر شبیر عالم اور دھرم ویر سنگھ نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اپریل 2018

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام ہمہ لسانی محفل

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی دہلی کے زیر اہتمام ہمہ لسانی محفل کا پروگرام ساہتیہ اکادمی میں منعقد کیا گیا، جس میں چار زبانوں کے تخلیق کاروں نے اپنے اپنے تخلیقی رپورتاژ، افسانے، غزلیں اور نظمیں پیش کیں۔ مشہور و معروف ہندی ادیب منیش کمار سنگھ نے اپنی تخلیق 'سفارش' کہانی کو پڑھ کر سنایا، جس میں ایک سچے قلم کار کی سماجی تبدیلی کی خواہش کا ذکر تھا۔ شری تاسی شارپا اور ڈاکٹر وسبھا کماری نے نیپالی اور میتھلی زبان کی نظموں کو ہندی ترجمے کے ساتھ پڑھا۔ شری شارپا کی نظموں میں پولیس پیشے کا درد اور گورکھا سماج کے تعلق سے ہندوستانی معاشرے کے عام رویوں کو بخوبی پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر وسبھا کی نظم خواتین من کے درد کے ساتھ اس کی مثبت شعور کا اظہار کرنے کے بارے میں تھی۔ آخر میں اردو زبان کے مشہور و معروف شاعر نعمان شوق نے اپنی نظموں اور غزلوں سے سب کا دل جیت لیا۔ جدید زندگی کے تغیرات اور چیلنجز کو ان میں خوبصورتی کے ساتھ ظاہر کیا گیا تھا۔ پروگرام کی نظامت اور آخر میں اظہار تشکر اکادمی کے خصوصی ایگزیکٹیو افسر ڈاکٹر دیویندر کمار دویش نے کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اپریل 2018

فارسی سرٹیفکٹ کورس کا اہتمام

نئی دہلی: ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی میں فارسی کلاسوں کے نئے سیشن کا افتتاحی اجلاس عمل میں آیا۔ پروگرام کا افتتاح مرکز تحقیقات فارسی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر احسان اللہ

شکر اللہی نے کیا۔ انھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ بنیاد سعدی ایران کے زیر اہتمام ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی فارسی شائقین کے لیے فارسی سرٹیفکٹ کورس کا اہتمام کرتا ہے جو سطح اول اور سطح دوم پر مشتمل ہے۔ تین ماہ کے اس کورس میں یہاں طلبہ کو فارسی لکھنا بولنا اور پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہفتہ میں ایک کلاس سطح اول اور دوم میں کامیاب طلبہ کے لیے گفتگو پر مشتمل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شکر اللہی نے کہا کہ ہندوستانی طلبہ کے لیے فارسی زبان سیکھنا زیادہ آسان ہے کیونکہ ہندوستانی زبانوں میں فارسی الفاظ کی بڑی شمولیت ہے۔ اس موقعے پر ایران کلچر ہاؤس کے ڈپٹی کلچرل کاؤنسلر حجۃ اللہ عابدی نے کہا کہ ہندوستان میں فارسی زبان کے اثرات کو یہاں کی ثقافت وتہذیب کے مختلف شعبوں میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوایران کے ثقافتی وتہذیبی روابط صدیوں پرانے ہیں۔ ہندوستان میں فارسی زبان کوئی اجنبی زبان نہیں ہے۔ فارسی زبان ہندوستان میں آٹھ سو سال تک حکومت کی دفتری زبان رہی ہے۔ فارسی کے استاد ڈاکٹر کلیم اصغر نے کہا کہ ہندوستان میں پچاس فی صد فارسی الفاظ کی شمولیت ہے۔ اس پروگرام میں فارسی کلاسوں کے استاد ڈاکٹر عزیز مہدی، خانم فاطمہ رجبی اور مہدی باقر نے بھی فارسی کلاسوں کے تعلق سے اپنے تجربات پر مبنی اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر گزشتہ سیشن میں سطح اول اور سطح دوم کے کامیاب طلبہ کو ڈاکٹر شکر اللہی اور حجۃ اللہ عابدی کے ہاتھوں سرٹیفکیٹ تقسیم کیے گئے۔ پروگرام کی نظامت علی ظہیر نقوی نے انجام دی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 اپریل 2918

آندھرا پردیش:

مادری زبان کا تحفظ

کرنول: اردو زبان کی ترقی وتحفظ ہم سب کی اولین ذمے داری، مادری زبان کی ترقی ہماری ترقی، مادری زبان کا تحفظ ہمارا تحفظ ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر شیخ محمد نعمان صاحب نے کیا۔ الفلاح ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی ادھونی کے زیر اہتمام کے وی فنکشن ہال ادھونی میں جلسہ تقسیم اسنادات ومشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر صدر نشین اردو اکادمی آندھرا پردیش ڈاکٹر شیخ محمد نعمان مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک رہے۔ انھوں نے حاضرین جلسہ وطلبا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہماری مادری زبان اردو ہے، مادری زبان کا تحفظ ہمارا تحفظ اور مادری زبان کی ترقی ہماری ترقی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آنے والی نسل کو بھی اردو زبان سے آراستہ کرنے کے لیے اپنے نونہالوں کو اردو زبان سیکھنا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادھونی شہر میں اردو گھر قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

روزنامہ '......' 12 اپریل 2018

اترپردیش:

مہ جبیں نجم غزال کو استقبالیہ

علی گڑھ: میسور سے تشریف لائیں عالمی شہرت یافتہ افسانہ نگار ڈاکٹر مہ جبیں نجم غزال نے کہا کہ محترمہ راشدہ خلیل نے 'بزم ادب خواتین' تشکیل دے کر جس طرح

تعلیم نسواں اور خواتین ادب کو پروان چڑھایا اس کے لیے وہ ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔ وہ علی گڑھ کی باوقار علمی و ادبی تنظیم 'بزم ادب خواتین' کے زیر اہتمام اپنے ہی اعزاز میں بزم کی سرگرم رکن محترمہ ناہید فیصل کی رہائش گاہ پر منعقدہ ایک خصوصی استقبالیہ تقریب سے خطاب کررہی تھیں۔ مہمان ممتاز افسانہ نگار ڈاکٹر مہ جبیں نجم غزال کا تعارف پیش کرتے ہوئے بزم ادب خواتین کی سکریٹری محترمہ آصف اظہار علی نے کہا کہ ڈاکٹر مہ جبیں نجم غزال اردو کی ایسی ممتاز افسانہ نگار ہیں جن کی شہرتیں ممالک کی سرحدوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتیں اور انھیں ساری اردو دنیا میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ محترمہ غزال کی پانچ کتب شائع ہوکر شرف قبولیت حاصل کرچکی ہیں اور ان کو حاصل ہونے والے اعزازات وانعامات کی طویل فہرست ہے۔ مجموعی ادبی خدمات کے لیے آپ کو محمود ایاز ٹرسٹ کی جانب سے ملنے والا 'بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ' خصوصی طور پر اہمیت کا حامل ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 اپریل 2018

آج کی شام بیٹیوں کے نام

میرٹھ: بزم شاہین مشاعرہ کمیٹی اور میلہ نوچندی کمیٹی نگر نگم، میرٹھ کے مشترکہ زیر اہتمام 'آج کی شام بیٹیوں کے نام' عنوان سے پٹیل منڈپ، میلہ نوچندی، میرٹھ میں ایک آل انڈیا شاعرات کے مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف شاعرہ ڈاکٹر انجنا سنگھ سینگر نے کی اور شمع افروزی کی رسم سنیتا ورما میئر نگر نگم، میرٹھ اور وینا وادھوا نائب صدر کینٹ بورڈ، میرٹھ نے مشترکہ طور پر ادا کی۔ جبکہ سابق وزیر اترپردیش سرکار شاہد منظور نے مہمانان خصوصی اور اکرام بالیان ممبر نگر نگم، میرٹھ اور اسراس سیفی صدر ضلع میرٹھ سماجوادی پارٹی نے مہمان ذی وقار کی حیثیت سے شرکت کی۔ ابتدائی نظامت عارف نسیم نے کی جبکہ مشاعرے کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر فرقان سردھنوی نے بخوبی انجام دیے۔ آخر میں کنوینر مشاعرہ شاہین پروین نے بھی شاعرات اور مہمانوں وسامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 اپریل 2018

'حیات اللہ انصاری کی ادبی وصحافتی خدمات' کے موضوع پر سمینار و اعزازی تقریب کا منظر

'اردو تحقیق: سمت و رفتار' کے موضوع پر دو روزہ سمینار

حیات اللہ انصاری کی ادبی وصحافتی خدمات

لکھنؤ: ترقی پسند ادیب کی شناخت رکھنے والے حیات اللہ انصاری ہی وہ شخص تھے، جنھوں نے اردو میں جدید افسانہ نگاری کی بنیاد ڈالی تھی۔ افسانوی ادب میں کئی جگہوں پر تو حیات اللہ انصاری کو پریم چند پر بھی سبقت حاصل ہے۔ 1940 کی دہائی میں ان کی معرکۃ الآرا تخلیق 'آخری کوشش' پریم چند کے افسانہ 'کفن' پر بھاری ہے۔ ان خیالات کا اظہار خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر فخر عالم اعظمی نے کیا۔ وہ فرنگی محلہ چوک کے مدرسہ حیات العلوم کے ہال میں 'حیات اللہ انصاری کی ادبی وصحافتی خدمات' کے موضوع پر سمینار و اعزازی تقریب میں صدارتی خطاب کر رہے تھے۔ سمینار کا انعقاد نجیب النساء میموریل ٹرسٹ لکھنؤ و اکادمی آف ماس کمیونیکیشن لکھنؤ نے مشترکہ طور پر کیا تھا جس کے کنوینر محمد راشد خان ندوی تھے۔ ڈاکٹر اعظمی نے کہا کہ حیات اللہ انصاری کی حقیقت نگاری مبالغہ آرائی سے پاک تھی۔ جو مشاہدہ، فکر اور تخیل ان کے یہاں ملتا ہے، وہ اوروں کے یہاں شاید ہی دیکھنے کو ملے۔ مہمان خصوصی اور یو پی اردو اکادمی کے سکریٹری ایس رضوان نے اردو کی خدمات اور حیات اللہ انصاری کے حوالے سے تفصیلی روشنی ڈالی۔ افسانہ نگار محسن خاں نے حیات اللہ انصاری کے حوالے سے کہا کہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے روزنامہ 'قومی آواز' کے بانی مدیر کی حیثیت سے جس دیانت داری، دلیری و بے باکی سے بااصول صحافت کی جو اعلیٰ وارفع روایت انھوں نے قائم کی وہ اردو صحافت کے سفر میں ہمیشہ مشعل راہ رہے گی۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مئی 2018

داغ دہلوی، رامپور اور حیدرآباد

رامپور: رامپور رضا لائبریری کے آڈیٹوریم میں داغ دہلوی، رام پور اور حیدرآباد موضوع پر منعقد سمینار میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر فاطمہ بیگم نے توسیعی لیکچر پیش کیا اور صدارت پروفیسر عراق رضا زیدی سابق صدر شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے کی۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر محمد ارشاد ندوی کی تلاوت قرآن سے ہوا۔ فاطمہ بیگم نے اپنا لیکچر پیش کرتے ہوئے کہا کہ داغ دہلوی کی زندگی کو تین حصوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ 25 سال دہلی میں 30 سال رام پور میں اور 18 سال حیدرآباد میں۔ اپنی شاعری کے ذریعے پوری انسانیت وزندگی کے ہر پہلو کو سامنے رکھا۔ ڈائرکٹر رضا لائبریری پروفیسر سید حسن عباس نے کہا کہ داغ دہلوی دہلی سے رام پور آئے اور رامپور سے حیدرآباد گئے اس پر گزشتہ سال اپریل میں لیکچر ہوچکا ہے۔ اسی کڑی کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ داغ نے رامپور کے حوالے سے جو شعر کہے ہیں وہ سب آج تک پڑھے جاتے ہیں اور لوگوں کو یاد بھی ہیں۔ پروفیسر عباس نے داغ دہلوی کی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے پروفیسر فاطمہ بیگم کا مکمل تعارف بھی پیش کیا۔ پروگرام کی صدارت کر رہے پروفیسر عراق رضا زیدی نے کہا کہ جب شاہ جہاں نے اپنا لقب شاہ جہاں رکھا تو سارے لوگ پریشان ہوگئے کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے لیکن شاہ جہاں نے کہا کہ ہمارا ہندوستان ہی جہان ہے اسی لیے داغ نے بھی اپنی ملی جلی زبان کو ہندوستانی کہا۔ پٹیالہ میں اردو زبان کو فروغ دینے میں داغ کا اہم رول رہا ہے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے کی اور آخر میں سب کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 اپریل 2018

بہار:

اردو تحقیق: سمت و رفتار

آرہ: سنسکرت، فارسی اور پشتو تینوں زبانیں اپنی نہاد میں ایک ہیں اور اردو ان تینوں زبانوں، خطہ جنوبی ایشیا کے سات ملکوں اور ثقافتوں کو جوڑتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ویر کنور سنگھ یونیورسٹی کے وگیان آڈیٹوریم میں اردو تحقیق کی سمت و رفتار کے موضوع پر بین الاقوامی سمینار کے افتتاح کے موقعے پر افغانستان کے سابق سفارت کار اور جنوبی ایشیا کی زبانوں اور ثقافتوں کے مشہور اسکالر پروفیسر ڈاکٹر عبدالخالق رشید نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ سنسکرت کے مشہور ویاکرن داں پانی کی مادری زبان پشتو تھی۔ لکھنا لفظ سنسکرت، اردو، ہندی اور خطہ کی دوسری زبانوں میں پشتو سے آیا۔ وہ سمینار کے افتتاحی اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کر رہے تھے۔ اس سے قبل ویر کنور سنگھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر دھرمندر تیواری نے علمی وادبی کاموں میں انسانیت کو نصب العین بنانے اور انسانوں کو جوڑنے کے کام کرنے پر زور دیا، جبکہ پروفیسر توقیر عالم اور پروفیسر طلحہ رضوی برق نے اپنے خطابات میں یونیورسٹیوں میں تحقیق کے گرتے معیار پر اظہار تشویش کیا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر برق اور نظامت ڈاکٹر حسین احمد کر رہے تھے۔ کلمات تشکر صدر شعبہ اردو و فارسی ڈاکٹر محمد توقیر خان نے پیش کیے۔ سمینار کے پہلے اجلاس میں پروفیسر منظر حسین، ڈاکٹر محمود اقبال اور پروفیسر جاوید حیات نے مختلف موضوعات پر اظہار خیالات کیے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر نسیم احمد، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور احمد جاوید کر رہے تھے۔ پروفیسر نسیم احمد نے اپنے صدارتی خطاب میں جامعات میں اردو تحقیق کے گرتے معیار پر اظہار تشویش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 اپریل 2018

جھار کھنڈ:

ادارہ اہل قلم کی ماہانہ طرحی نشست

جھریا: گذشتہ 17 اپریل کو ادارہ 'اہل قلم' جھریا کی ایک طرحی نشست ادارے کے سکریٹری جناب ڈاکٹر اقبال حسین کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی جس کی صدارت اردو کے مشہور و معروف شاعر و سہ ماہی رنگ کے مدیر اعلیٰ جناب شان بھارتی نے کی اور نظامت کے فرائض جناب امتیاز بن عزیز نے انجام دیے۔ اردو کے نامور شاعر و ادیب جناب مظہر امام کی غزل سے منتخب مصرعہ 'وقت کی پالکی سے اتر جاؤں گا' کو مصرع طرح بنایا گیا۔ جس پر

شعرا حضرات نے طبع آزمائی کی اور اپنی بہترین کاوشوں سے سامعین حضرات کو محظوظ کیا۔ اخیر میں مشہور افسانہ نگار غیاث اکمل، ڈاکٹر یونس فردوسی، تطہیر احمد اور ریاض انور نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر اقبال حسین، سکریٹری، اہل قلم، جھریا، 18 اپریل 2018

مہاراشٹر:

اردو شاعری نے میری نیا پار لگائی ہے

ممبئی: ہندی فلموں کی معروف گلوکارہ شروتی پاٹھک نے کہا ہے کہ انھیں شاعری سے کافی لگاؤ ہے اور وہ اردو شاعری سے عشق کرتی ہیں کیونکہ اردو شاعری کی وجہ سے ان کے کریئر کی کشتی آگے بڑھی ہے، اس کا اظہار انھوں نے ایک ملاقات کے دوران کیا اور اردو ادب اور مشہور شعرائے کرام سے اپنی انسیت ظاہر کی ہے۔ ہندی فلموں کی معروف گلوکارہ شروتی پاٹھک نے چند سال میں کافی شہرت حاصل کی ہے اور انھیں فلم فیئر ایوارڈ میں بہترین گلوکارہ کے درجہ میں نامزد کیا گیا جبکہ اسکرین ایوارڈ میں بھی ان کی نامزدگی ہوئی تھی، ان کا کہنا ہے کہ ''اردو شاعری کی وجہ سے میں نے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں، میری کوشش ہوتی ہے کہ بہتر ادب کا مطالعہ کیا جائے اور غیر ضروری مطالعہ سے گریز کروں اور یہ ہی میری زندگی کا نصب العین رہا ہے۔'' شروتی پاٹھک نے مزید کہا کہ اکثر سفر کے دوران وہ اردو کے مشہور شاعر مرزا غالب، فیض احمد فیض یا ساحر لدھیانوی کے کلاموں کا مطالعہ کرتی ہیں اور اس کی وجہ سے انھیں سکون ملتا ہے۔ دراصل ان شعرائے کرام کی شاعری میں موجودہ دور اور معاشرے کی حقیقت اور دنیا کی جھلک نظر آتی ہے، ایک ایک لفظ موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ 36 سالہ شروتی پاٹھک کا پہلا البم 'لے کے پہلا پہلا پیار 2004' میں ریلیز ہوا، لیکن انھیں شہرت 2008 میں فلم فیشن میں 'مرجاواں' سے حاصل ہوئی تھی اور انھیں فلم فیئر اور اسکرین ایوارڈز کے لیے نامزد کیا گیا جبکہ انھوں نے کئی فلموں کے نغمے بھی لکھے ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 اپریل 2018

اعزاز و اکرام:

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چانسلر اور منی پور کی گورنر ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے کہا کہ جس دور میں جامعہ مشکل حالات سے دوچار تھا اس وقت مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ جامعہ کو بچانے کے لیے اگر مجھے کاسہ اٹھا کر گدائی بھی کرنی پڑی تو اس سے بھی گریز نہیں کروں گا۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کی اب تک کی سبھی خدمات منفرد اور لازوال ہیں۔ اس کے بانیان نے برطانوی حکمرانوں کے خلاف آزادی کا بگل بجا کر ان کی نیندیں حرام کردی تھیں۔ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، رویندر ناتھ ٹیگور اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی کتنی ہی عظیم ہستیوں نے جامعہ کو ایک قومی ادارہ بنانے کے لیے کوششیں کیں، ہم ان تمام ہستیوں کو سلام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد سے خطاب کر رہی تھیں۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر مرکزی وزیر ڈاکٹر ہرش وردھن نے شرکت کی۔ مہمانان خصوصی ڈاکٹر ہرش وردھن اور چانسلر و منی پور کی گورنر ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ کے ہاتھوں 4694 طلبہ کو ڈگریاں تفویض کی گئیں۔ اپنے خطاب میں ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے وزیر اعظم نریندر مودی کے ڈیجیٹل بھارت اور اسکل بھارت کے خواب کو پورا کرنے کے لیے کافی تعاون دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس اسکیم کے تحت جامعہ نے اپنی لائبریری کو ڈیجیٹل کیا ہے تاکہ ملک کے کسی بھی حصے میں طلبہ لائبریری سے استفادہ کرسکیں۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی ڈاکٹر ہرش وردھن نے کہا کہ اس ادارے کا تحریک آزادی میں نمایاں کردار رہا ہے جس نے قومیت اور ملک کی تعمیر و ترقی میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ بھارت سرکار میں سائنس، ٹکنالوجی، جنگلات و ماحولیات، موسمیاتی تبدیلی اور زمینی سائنس کے وزیر ڈاکٹر ہرش وردھن نے کہا کہ اس یونیورسٹی کے بانیان بابصیرت اور عظیم لوگ تھے جنھوں نے آزادی کی لڑائی میں حصہ لینے کے علاوہ اس کے گیسو کو سنوارنے کے لیے جامعہ ملیہ جیسی عظیم دانش گاہ کی بنیاد رکھی اور اس کو اپنے خون جگر سے سینچا۔ اس اجلاس میں، 2017 کے کامیاب 4372 طلبہ کو ڈگری، ڈپلومہ اور 322 کو پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا گیا۔

اس موقعے پر 165 طلبہ کو اپنے متعلقہ مضامین میں نمایاں مقام حاصل کرنے پر تمغہ دیا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ یہ ہم سب کے لیے فخر کی بات ہے کہ جامعہ ملک کی واحد ایسی یونیورسٹی ہے جو ملک کی تینوں افواج، بری، فضائی اور بحری کے جوانوں اور افسروں کے لیے آن لائن گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کے پروگراموں کا انعقاد کر رہی ہے۔ واضح رہے کہ اس جلسے میں خاص طور پر ماسٹر آف لاء (ایل ایل ایم) کی ٹاپر طالبہ سمیرا امتیاز کو ڈاکٹر غلام ای واہن متی گولڈ میڈل اور پچاس ہزار روپے نقد سے نوازا گیا۔ یہ انعام ہندوستان کے سابق اٹارنی جنرل غلام ای واہن متی کے اہل خانہ نے ان کے نام سے شروع کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اپریل 2018

خالد مرزا مولانا مظہر الحق یونیورسٹی کے وائس چانسلر نامزد

پٹنہ: گورنر کم چانسلر مسٹر ستیہ پال ملک نے یونیورسٹی ایکٹ 1976 میں ملے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے مولانا

مظہر الحق عربی اور فارسی یونیورسٹی پٹنہ کے لیے پروفیسر ڈاکٹر خالد مرزا کو وائس چانسلر مقرر کیا ہے۔ چانسلر نے اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے تقرر کے لیے تشکیل سرچ کمیٹی کی سفارشات کے پیش نظر ریاستی حکومت سے مشورہ کرکے پروفیسر ڈاکٹر خالد مرزا کو وائس چانسلر ماموز کیا۔ یہ اطلاع راج بھون کی پریس ریلیز میں دی گئی ہے۔ نو ماموز وائس چانسلر کے عہدے کی مدت تین برسوں تک ہوگی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 اپریل 2018

عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ

نئی دہلی: بائیسویں 'عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ، دوحہ قطر' جیوری کی میٹنگ علی گڑھ میں ٹیلی کانفرنس کے

ذریعے منعقد ہوئی جس میں اردو کے ممتاز فکشن نگار سید محمد اشرف کو یہ ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا جو ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، طلائی تمغہ اور سپاس نامہ پر مشتمل ہے۔ جیوری کے چیئرمین پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایوارڈ کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ سید محمد اشرف کی تحریروں میں سماجی دردمندی اور گہری انسانی کیفیات کی عکاسی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے معاشرے کے گزراں منظر ناموں سے کردار اٹھائے اور ان کے سماجی اور نفسیاتی مسائل کو نہایت سلیقے کے ساتھ قارئین کے احساس کا حصہ بنایا۔ سید محمد اشرف کے فکشن میں جہاں ایک طرف روایتی سماجی ڈھانچوں کی شکست اور برسوں پرانی زنگ آلودہ قدروں کے زوال آمادہ سحر کا ماتم نظر آتا ہے، وہیں نئے مسائل اور ان کی پیچیدگی کی ترجمانی بھی موجود ہے۔ سید محمد اشرف نے اپنے فکشن میں ہجرت اور بے زمینی کے جن مسائل کو موضوع بنایا ہے وہ واضح طور پر پرانے اور نئے زمانے کے درمیان گرفتار انسان کی کشمکش سے عبارت ہیں۔ عالمی فروغ اردو ادب، دوحہ قطر کا یہ پروقار ادبی ایوارڈ ہر سال ایک پاکستانی اور ایک ہندوستانی ادیب کو دیا جاتا ہے۔ ہندوستان ایوارڈ یافتگان میں آل احمد سرور، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، کالی داس گپتا رضا، جوگیندر پال، سریندر پرکاش، نثار احمد فاروقی، سیدہ جعفر، جاوید اختر، صلاح الدین پرویز، عبدالصمد، گلزار، رتن سنگھ، شموئل احمد، مشرف عالم ذوقی، نند کشور وکرم وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ پینل آف ججز کا اجلاس جیوری کے چیئرمین اور اردو کے ممتاز نقاد و دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی (اسکائپ پر) صدارت میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں منعقد ہوا۔ اس برس ایوارڈ کی تقریب دوحہ قطر میں 22 نومبر کو منعقد ہوگی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 اپریل 2018

ظہور احمد چوہان کو اردو صحافت ایوارڈ

مالیرکوٹلہ: انجمن فروغ ادب پنجاب کی جانب سے صحافی ظہور احمد چوہان کو ان کی بے لوث اور غیر جانبدارانہ صحافتی خدمات کے اعتراف میں 'اردو صحافت ایوارڈ' پیش کرکے انھیں سرفراز کیا گیا۔ موصوف کو یادگاری نشان اور توصیفی سند دے کر اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔ موصوف کی صحافت کے میدان میں گراں قدر خدمات اور ایماندارانہ عکس کا بھی ذکر کیا گیا۔ انجمن فروغ ادب پنجاب نے ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ظہور احمد چوہان طویل عرصے سے ہند سماچار گروپ جالندھر کے لیے بطور نامہ نگار گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 اپریل 2018

جمیل فاطمہ زیبا آئی اے ایس کے امتحان میں کامیاب

حیدر آباد: آئی اے ایس امتحان میں کامیاب ہونے والی جمیل فاطمہ زیبا کہتی ہیں کہ ہماری کامیابی درحقیقت ہمارے خاندان کے بھرپور تعاون کا نتیجہ ہے اور میں اس نتیجے پر اللہ کا شکر بجالاتی ہوں۔ قوم و ملت کو علم کی روشنی کی ضرورت ہے اور آپ اپنے بچوں میں اس روشنی کو تلاش کریں۔ ان کے اندر چھپی صلاحیتوں کو اجاگر کریں۔ اچھی تعلیم کے لیے محنت و لگن کا دروازہ آپ کھولیں۔ بس آپ کے تعاون سے بچوں میں جو اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے وہی دراصل کامیابی کی کنجی اور دلیل کے ساتھ مثال بن جاتی ہے۔ آپ اس پر عمل کریں۔ کامیابی آپ کے ساتھ ہوگی۔ جمیل فاطمہ زیبا کی اس کامیابی پر حیدر آباد کے عمائدین شہر نے انھیں مبارکباد دی ہے۔

روزنامہ 'تاثیر' پٹنہ، 12 مئی 2018

اجرا:

مآثر رحیمی

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام فارسی کی معروف تصنیف مآثر رحیمی (مصنف: عبدالباقی نہاوندی) حواشی ڈاکٹر حسن بیگ، لندن کی رسم اجرا کا انعقاد ہوا۔ اس موقعے پر استقبالیہ کلمات کے دوران فارسی ادبیات کے ماہر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی خدمات اور کارناموں سے ہندوستان کے لوگ بخوبی واقف ہیں۔ مآثر رحیمی اپنے عہد کے لیجنڈ کے حالات و واقعات پر مبنی کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ سید منصور علی سہروردی مرحوم نے کیا ہے، حواشی نگاری کے لیے ڈاکٹر حسن بیگ نے ان تمام مقامات کی سیر کی ہے، کتاب میں جن مقامات کا ذکر آیا ہے۔ مآثر رحیمی پر حاشیہ آرائی کے لیے ڈاکٹر حسن بیگ نے عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ اس موقعے پر کتاب کے حاشیہ وضمیمہ نگار ڈاکٹر حسن بیگ نے کہا کہ مآثر رحیمی فارسی کی معروف تصنیف ہے۔ عبدالرحیم خان خاناں دور اکبری کے وہ واحد دانش ور ہیں، جنھوں نے اپنی سوانح لکھوائی۔ مآثر رحیمی تاریخ ہندوستان کی طرز پر لکھی ہوئی کتاب ہے، لیکن اس کا اصل مقصد سوانح بیرم خان، عبدالرحیم خان خاناں اور ان کے اجداد و اخلاف کی تاریخ کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ رکھنا ہے۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے کہا کہ مآثر رحیمی مسلم ہندوستان کی بہت ہی اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب جس شخصیت پر ہے وہ شخصیت مغلیہ عہد کا بڑا نام ہے۔ پروگرام کے صدر اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ یہ خوشی کا موقع ہے کہ انگلینڈ میں رہ کر بھی ڈاکٹر حسن بیگ اپنی تہذیب و تاریخ سے الگ نہیں ہو سکے۔ انھوں نے مآثر رحیمی کی حاشیہ آرائی اور ان کی اشاعت کے لیے وقت نکالا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 مئی 2018

بولتے حرف

لکھنؤ: قومی ایکتا فورم کے زیر اہتمام شاداب کالونی میں ایک ادبی جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں ملک کے مشہور و معروف شاعر جناب رہبر جون پوری کے نویں شمارے کی کتاب 'بولتے حرف' کی رسم اجرا شہر کے بڑے ہی پروقار اور معزز حضرات کے ذریعے عمل میں آئی۔ جلسے کی صدارت امریکہ سے تشریف لائے ڈاکٹر عبداللہ نے اور نظامت ملک زادہ پرویز نے کی۔ جلسے کا آغاز کرتے ہوئے مشہور شاعر واصف فاروقی نے کہا کہ رہبر جون پوری کا نام اور کام ان دونوں اعتبار سے شعر و ادب کے رہبر ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ ان کے اشعار میں سماجی بدحالی اور ناکامی کے موضوعات پر کافی گفتگو کی گئی ہے۔ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے پروفیسر خان محمد عارف نے کہا کہ رہبر جون پوری کی کتاب اردو زبان کی صلاحیت اور وقار کو اور بڑھا دیتی ہے۔ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے ارشد اعظمی نے رہبر جون پوری کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ رہبر جون پوری ان چند شعرا میں سے ایک ہیں جن کے اشعار میں نئی نسل کی اصلاح کے ساتھ ساتھ دین اور دنیا کے اہم موضوعات سے تعارف کرایا گیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 اپریل 2018

ڈاکٹر نصیرالدین ازہر کی مرتب کردہ کتاب 'شاہد علی خاں- ایک فرد، ایک ادارہ' کے اجرا کا منظر

شاہد علی خان- ایک فرد، ایک ادارہ

نئی دهلی: ڈاکٹر نصیرالدین ازہر کی تحریر کردہ کتاب 'شاہد علی خان- ایک فرد، ایک ادارہ' کی رسم اجرا معروف دانشور پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر شمیم حنفی و دیگر کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ بستی حضرت نظام الدین میں واقع غالب اکادمی میں منعقدہ رسم رونمائی تقریب کا اہتمام گلستان اردو، 124/A5، مین مارکیٹ، اوکھلا، جامعہ نگر نے کیا تھا۔ اس موقعے پر کتاب کے مصنف ڈاکٹر نصیرالدین ازہر نے تمام مہمانان کے گلدستہ پیش کرکے استقبال کیا۔ ڈاکٹر زمرد مغل، خواجہ محمد شاہد، پروفیسر احمد محفوظ نے کتاب کے مصنف کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کی خوبیاں بیان کیں۔ انھوں نے کہا کہ شاہد علی خاں کی خوبیاں نئی نسل کے لیے بیش قیمتی نمونہ ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور صدر پروگرام پروفیسر شمیم حنفی نے شاہد علی خاں کی اچھی صحت کے ساتھ لمبی عمر کی دعائیں دیں اور کہا کہ خاں صاحب ہمیشہ رہنمائی کرتے ہیں۔ ان کے شیدائی ہر عمر کے لوگ ہیں، خاں صاحب نے 30 سال سے زائد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں خدمات انجام دی ہیں۔ اختتام پر شاہد علی خاں نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں کتاب لکھنے کے لائق نہیں ہوں کہ کوئی شخص میری شخصیت پر کتاب لکھے۔ میرے بار بار انکار کے بعد بھی ڈاکٹر نصیرالدین نے کتاب مرتب کی، میں ان کا اور ان کی ٹیم کا بے حد شکر گزار ہوں۔ تقریب کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر ناظمہ جبیں نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 مئی 2018

المجمع العلمی العربی الهندی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے عربی زبان میں شائع ہونے والے علمی، ادبی و تحقیقی مجلّہ المجمع العلمی العربی الهندی کے سرسید نمبر کا اجرا وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ اس میگزین کا شمار ہندوستان سے نکلنے والے عربی زبان کے قدیم ترین ادبی جرائد میں ہوتا ہے، جو 1976 سے آج تک شعبۂ عربی سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس تحقیقی رسالے میں ہندو بیرون ہند کے معروف عربی اسکالرس کے ادبی، تحقیقی وتنقیدی مقالات شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس ادبی میگزین کے مختلف مواقع پر ہندوستان کی تاریخ ساز شخصیات پر خصوصی شمارے بھی شائع کیے گئے ہیں۔ چنانچہ سرسید کی یوم پیدائش کی دوصد سالہ تقریبات کے ضمن میں یونیورسٹی نے جہاں اردو اور انگریزی زبانوں میں اس عظیم شخصیت پر خصوصی نمبر شائع کیے، وہیں شعبۂ عربی نے بھی سرسید علیہ الرحمہ کی حیات و خدمات اور ان کے افکار ونظریات پر مشتمل عربی زبان میں ایک خصوصی نمبر شائع کیا، تاکہ عرب دنیا بیسویں صدی کے اس عظیم مصلح کی گراں قدر ملی، علمی، تحقیقی اور تعلیمی کاوشوں سے واقف ہو سکے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 20 اپریل 2018

ارضیاتِ غالب

لکھنؤ: اردو کا مستقبل بہت محفوظ ہے اور اکثریتی فرقے کے بھائی اس کے محافظ ہیں۔ یہ کہنا ہے وزیر مملکت محسن

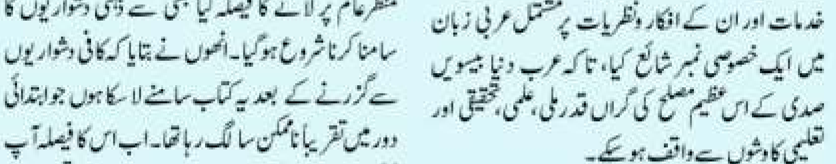

رضا کا جو ایک تقریب کے دوران بحیثیت مہمان ذی وقار مخاطب تھے۔ اپنے خطاب کے دوران محسن رضا نے گنگا جمنی تہذیب پر زور دیتے ہوئے کہا کہ لکھنؤ علم و ادب کے ساتھ ساتھ اس مشترکہ تہذیب کا بھی گہوارہ رہا ہے۔ اپنی تصنیف 'آم نامہ' کے ذریعے لمکا ورلڈ ریکارڈز میں جگہ بنانے والے شاعر سہیل کاکوروی کی کتاب 'ارضیات غالب' کی رسم اجرا کے موقعے پر خطاب کرتے ہوئے محسن رضا نے کہا کہ غالب کی شاعری گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے والی شاعری تھی اور سہیل کاکوروی کی شاعری میں بھی گنگا جمنی تہذیب کی صاف عکاسی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ رسم الخط دیوناگری اور زبان اردو ہو تبھی ملک میں گنگا جمنی تہذیب فروغ پائے گی۔ 'ادبی سنستھان' لکھنؤ کے زیر اہتمام پریس کلب میں منعقد تقریب میں 'ارضیاتِ غالب' کی رسم اجرا بدست محسن رضا، پدم شری پروفیسر آصف زمانی، چیئرپرسن اترپردیش اردو اکادمی، پروفیسر شافع قدوائی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر علی خان، انیس انصاری، ولایت جعفری، سریندر وکرم، سنتوش والمیکی، حسن کاظمی، اویس سنبھلی، ترن پرکاش، ایڈوکیٹ انور حبیب علوی وغیرہ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اپنے افتتاحی خطاب میں سہیل کاکوروی نے کہا کہ غالب کی زمین میں غزل کہنا ہمیشہ مشکل رہا ہے اس لیے جب میں نے اس طرح کی کتاب منظر عام پر لانے کا فیصلہ کیا تبھی سے ذہنی دشواریوں کا سامنا کرنا شروع ہو گیا۔ انھوں نے بتایا کہ کافی دشواریوں سے گزرنے کے بعد یہ کتاب سامنے لا سکا ہوں جو ابتدائی دور میں تقریباً ناممکن سا لگ رہا تھا۔ اب اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ غالب کی ارضیات پر شاعری انتہائی مشکل ہے بنسبت میر، ذوق، داغ وغیرہ کے مگر سہیل کاکوروی نے اس زمین پر شاعری کرکے عظیم کارنامہ انجام دیا ہے اور اتنی خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچایا کہ کبھی کبھی مجھے خود یقین نہیں آتا تھا کہ یہ شاعری سہیل کاکوروی کی ہے یا غالب کی۔ مہمان خصوصی پدم شری پروفیسر آصف زمانی نے کہا کہ میں نے 'ارضیات

غالب' کا ابھی زیادہ مطالعہ نہیں کیا لیکن جتنا پڑھا اور یہاں اس کتاب کے بارے میں معززین اور مہمانوں نے جو گفتگو سنی اس سے صاف ظاہر ہے کہ کتاب کے شاعر سہیل کاکوروی نے اس کتاب کو لکھنے میں پورا حق ادا کیا اور کتاب کو اسم با مسمیٰ بنا دیا۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 اپریل 2018

دان دھرم

بھیونڈی: صنوبر ٹریننگ ہال، نزد باغ فردوس مسجد، وی پی ناکہ میں اردو ہندی کے معروف ادیب ایم مبین کی ادبی خدمات کے اعتراف و اعزاز میں ایک اعزازی نشست کا اہتمام بھیونڈی کی معروف ادبی تنظیم بزم توفیق الادب کے صدر خان فخر عالم نے کیا۔ اس پروگرام میں ان کی 54 ویں کتاب، بچوں کے ڈراموں کے مجموعہ 'دان دھرم' کا اجرا عمل میں آیا، ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں بزم اور بھیونڈی کی سرکردہ شخصیات کا دستخط شدہ سپاس نامہ انھیں پیش کیا گیا۔ اس پروگرام کی صدارت معروف شاعر فہمی سہسرامی نے کی۔ معروف ناقد خلیق الزماں نصرت نے ایم مبین کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا، آج کے دور میں بے غرضی کے ساتھ ہی زبان و ادب کا کام کرنا ممکن ہے اور جو بنا کسی مفاد اور غرض کے زبان اور ادب کا کام کرتا ہے وہی بہتر طور پر ادب کا کام کر پاتا ہے۔ اس کی مثال آج ایم مبین کی 54 ویں کتاب کا اجرا ہے۔ بلال گجراتی، برکت اللہ انصاری اور خان فخر عالم کے ہاتھوں یہ سپاس نامہ صاحب اعزاز ایم مبین کو پیش کیا گیا۔ ایم مبین کی 54 ویں کتاب 'دان دھرم' بچوں کے ڈراموں کے مجموعہ کا اجرا رضوان مسٹر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس پروگرام کی نظامت ساز الہ آبادی نے کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 6 اپریل 2018

اردو کا زندانی ادب

سکندر آباد: ادب ہمیشہ انقلاب اور بغاوت کے بطن سے جنم لیتا ہے اور ایسا ہی ادب پائیدار ہوتا ہے، اگر ہم

دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ ہر ادب نے بغاوت سے ہی اپنے وجود کو مضبوط کیا ہے، ترقی پسند ادب اس کا منہ بولتا ثبوت ہے، ادبیات عالم کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہر ملک کے ادب کی جڑ انقلاب اور بغاوت میں پوشیدہ ملے گی، مذکورہ خیالات کا اظہار ایم ایس انٹر کالج کے منیجر متین بھٹنا گر نے کیا، وہ راج محل بینکٹ ہال میں منعقدہ تقریب رسم اجرا کے موقعے پر خطاب کر رہے تھے، بتا دیں کہ فخر الدین علی احمد کمیٹی کے جزوی تعاون سے شائع ڈاکٹر محمد فاروق خان کی کتاب 'اردو کا زندانی ادب' کا اجرا کرتے ہوئے منیجر متین بھٹنا گر نے کہا کہ ادب کے ذریعے جہاں ایک طرف تاریخ محفوظ کی جاتی ہے وہیں دوسری طرف اس کے گزرے ہوئے زمانے کی نفسیات کا پتہ چلتا ہے، انھوں نے کہا کہ یوں تو تاریخ بہت لکھی جاتی ہے مگر جیل میں لکھا جانے والا ادب اور تاریخ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد فاروق خان نے جیل میں لکھے گئے ادب سے اس تاریخ کو یکجا کر کے ایک ایسی کتاب تحریر کی ہے جس سے ملک و قوم پر اپنی جان قربان کرنے والے سپوتوں کی محبت کا پتہ چلتا ہے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل ڈاکٹر محمد فاروق کی کتاب نشان غالب، انقلاب، اردو ادب، بغاوت، اور اردو ادب کی تاریخ جیسی اہم کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، آخر میں ڈاکٹر محمد فاروق نے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 اپریل 2018

دوحہ میں مضامین ڈاٹ کام کے اینڈ رائڈ ایپ کا اجرا

دوحہ: اپنی نوعیت کی ہندوستان کی منفرد اور معروف

ویب سائٹ اب گوگل پلے میں بھی دستیاب ہے۔ مضامین ڈاٹ کام نے دو سال پورے کر لیے ہیں۔ اس موقعے پر پلازا ان ہوٹل دوحہ قطر میں اینڈ رائڈ ایپ کو باضابطہ لانچ کیا گیا۔ اس تقریب میں قطر میں مقیم ہندوستان، پاکستان اور دیگر ممالک اردو کے شائقین نے شرکت کی۔ دوحہ قطر کی معروف و مشہور سماجی اور علمی شخصیات، سدرہ ہوسپٹل کے شعبۂ تحفظ اطفال کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ندیم ظفر جیلانی، حسن عبدالکریم چوگلے، سلیمان مجوہرات اینڈ واچز کے چیئرمین عظیم عباس اور ایم ایس بخاری بھی شریک پروگرام رہے۔

مضامین ڈاٹ کام کے اس ایپلی کیشن کا اجرا ہندوستان سے آئے مہمان ماہر قانون اور نلسار یونیورسٹی آف لا کے وائس چانسلر ڈاکٹر فیضان مصطفیٰ کے ہاتھوں سے ہوا۔ انھوں نے اپنے افتتاحی خطاب میں مضامین کی ترقی و کامیابی اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ عظیم عباس نے کہا کہ اب مستقبل ٹیکنالوجی اور آن لائن کا ہے اور مضامین ڈاٹ کام کا یہ قدم خوش آئند ہے۔ دوحہ قطر کی معروف شخصیت حسن عبدالکریم چوگلے نے بھی مضامین کی کوششوں کو سراہا۔ مضامین ڈاٹ کام کے بانی و ڈائرکٹر خالد سیف اللہ اثری نے مضامین ڈاٹ کام کے بانی و ڈائرکٹر عرفان وحید کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ عرفان وحید کی ہی کوششوں سے آج مضامین ڈاٹ کام اپنی کامیابی کی منزلیں تیزی سے طے کر رہا ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ مضامین ڈاٹ کام نے اس تقریب میں مضامین قطر کے نام سے اپنے قطر کی یونٹ کا بھی باضابطہ اعلان کیا۔ مضامین قطر کی ورکنگ کمیٹی کے اراکین فی الحال خالد سیف اللہ اثر، عبدالرحمٰن ششی، رفعت جہاں، قمر جبیں عثمانی، امۃ العلیم فاطمہ، رمیض احمد تقی ہیں۔ اس موقعے پر مضامین ڈاٹ کام کی طرف سے قطر میں برسوں سے موجود درجنوں فعال اردو ادبی و ثقافتی تنظیموں کی خدمت میں مومنٹو پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اپریل 2018

دعائیں کام آتی ہیں

امروھہ: بزم زندہ دلان امروہہ کی جانب سے مشہور و معروف شاعر نور امروہوی کے شعری مجموعہ 'دعائیں کام آتی ہیں' کی رسم اجرا کی تقریب آئی ایم کالج امروہہ میں منعقد ہوئی جس کی صدارت عالمی مرثیہ سینٹر کے چیئرمین ڈاکٹر عظیم امروہوی نے کی۔ نظامت کے فرائض سید شیبان

قادری نے انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز حافظ شمیم نے تلاوتِ قرآن پاک سے کیا جبکہ نعتِ پاک کا نذرانہ نورامروہوی نے پیش کیا جس کے بعد نورامروہوی کے شعری مجموعہ دعائیں کام آتی ہیں کی رونمائی ڈاکٹر عظیم امروہوی، ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی، ڈاکٹر جمشید کمال، عبدالقیوم راعینی، سید شیبان قادری، ڈاکٹر ناصر امروہوی وغیرہ کے ہاتھوں کی گئی۔ اس کے بعد نورامروہوی کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں یادگاری نشان پیش کیا گیا اور تمام مہمانان کو پھول پیش کرکے ان کا استقبال بھی کیا گیا۔ اس موقعے پر بولتے ہوئے ڈاکٹر عظیم امروہوی نے کہا کہ نورامروہوی امریکہ میں اردو زبان کے نمائندے بھی ہیں، ترجمان بھی ہیں، پاسبان بھی ہیں، سپاہی بھی ہیں اور سفیر کبیر بھی ہیں۔ وہ لب و لہجے کی شیرینی بانٹ کر اہل امریکہ کے دل جیت رہے ہیں اور انھوں نے غیر معمولی مقبولیت اپنے مزاج کی مٹھاس سے حاصل کی ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' 15 اپریل 2018

سنچیان

علی گڑھ: ملک کے ممتاز ناٹک و ناول نویس اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق پروفیسر اصغر وجاہت کی کتب کے

مجموعہ 'سنچیان' کا اجرا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے کلچرل ایجوکیشن سینٹر کے زیر اہتمام منعقدہ ایک شاندار پروگرام میں اے ایم یو کے شعبۂ اردو کے سینئر استاد اور ممتاز افسانہ نگار پروفیسر طارق چھتاری کے بدست عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت بھی پروفیسر طارق چھتاری نے کی۔ اس مجموعے کی ترتیب و ادارت کے فرائض دہلی یونیورسٹی کے ہندو کالج کے ڈاکٹر پلو نے انجام دیے ہیں جبکہ یہ مجموعہ دہلی کے معروف ناشر نئی کتاب نے شائع کیا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر آصف نقوی کی دو کتب کا بھی اجرا کیا گیا۔ کلچرل ایجوکیشن سینٹر کے کوآرڈینیٹر پروفیسر ایف ایس شیرانی نے پروفیسر اصغر وجاہت اور دیگر مہمانان کا خیر مقدم کیا۔ پروفیسر عارف رضوی نے پروفیسر اصغر وجاہت کے ساتھ گزارے اپنے بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے اے ایم یو سے وابستہ اپنے تجربات بیان کیے۔

اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر طارق چھتاری نے کہانی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اصغر وجاہت کے فن کو سراہا۔ نظامت کے فرائض پروفیسر سراج اجملی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر پروفیسر اصغر وجاہت کی کتب کی نمائش لگائی گئی جس میں ان کی متعدد نایاب کتب بھی رکھی گئی تھیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 اپریل 2018

یادیں فقط تمھاری

سکندرآباد: ضلع مجسٹریٹ ڈاکٹر روشن جیکب نے مسٹر ہرونش سنگھ کے ذریعے تصنیف کی گئی شاعری پر مشتمل کتاب 'یادیں فقط تمھاری' کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ انتظامی سروس میں رہتے ہوئے ادب میں دل چسپی رکھنا بھی قابل تعریف کام ہے، انھوں نے اس موقعے پر کلکٹریٹ کے ملازمین اور افسران کی موجودگی میں یہ بھی کہا کہ یہ ایک اتفاق ہی ہے کہ میرے اسٹینو مکیش نروکار اور پیش کار ہرونش سنگھ دونوں کی شاعری ہے اور دونوں ہی کے شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس موقعے پر کہا کہ شاعری نے انسان کو زیادہ ذمے دار بنایا ہے جس کا اثر ہر شخص کی سرگرمی پر ہے، ایک ذمے دار انسان خودکار طریقے سے ہی ایک اچھا شہری اور اچھا ملازم بھی ہوتا ہے، قابل ذکر ہے کہ ہرونش سنگھ کی کتاب 'یادیں فقط تمھاری' سمنویہ پبلشنگ غازی آباد کے ذریعے شائع کی گئی ہے جس میں مکیش نروکار نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے، اس موقعے پر کلکٹریٹ کے دیگر ملازمین موجود رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 اپریل 2018

پرواز

علی گڑھ: سینٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شعبۂ اردو اے ایم یو علی گڑھ کی جانب سے معروف افسانہ نگار سلام بن رزاق کی علی گڑھ آمد پر ایک توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت شہرۂ آفاق فکشن نگار پدم شری پروفیسر قاضی عبدالستار نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اکرم شروانی کے افسانوی مجموعے 'پرواز' کی رسم اجرا بدست پروفیسر ڈاکٹر محمد زاہد، پروفیسر صغیر افراہیم اور سلام بن رزاق عمل میں آئی۔ صاحب کتاب کے فن و شخصیت پر گفتگو کی۔ ان کا یہ افسانوی مجموعہ 'پرواز' سولہ افسانوں پر مشتمل ہے جس کی خوبی یہ ہے کہ تمام کہانیوں میں شگفتگی، روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ ان کی بیشتر کہانیاں بامقصد ہیں اور ان میں معاشرے کے اندر پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے کا بالواسطہ پیغام بھی ہے مگر اشاروں کنایوں میں پیش کیا جانے والا پیغام فنِ افسانہ نگاری کو مجروح نہیں کرتا ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 14 اپریل 2018

لہولہو دھنک

جلگاؤں: اقرا ایچ جے تھیم کالج، جلگاؤں کے وسیع و عریض کیمپس میں اردو زبان کے مشہور و معروف شاعر مرحوم صابر زاہد کے شعری مجموعہ 'لہولہو دھنک' کی رسم رونمائی ممبر آف پارلیمنٹ ایڈوکیٹ عبدالمجید میمن کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس پروگرام کی صدارت مفتی عتیق الرحمٰن (شہر و ضلع قاضی شریعت، جلگاؤں) نے کی۔ پروگرام کا آغاز مولانا عبدالاحد ملی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ مشتاق کریمی نے اس اہم شعری مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ صابر زاہد نے اردو شاعری میں غزل در غزل جیسے نئے کامیاب تجربات کیے۔ موصوف نے غزل در غزل کے بارے میں حاضرین مجلس کو تفصیل سے بتایا کہ کس طرح مرحوم صابر زاہد نے ایک بڑی بحر کی غزل سے چار غزلیں اور کئی قطعات نکالنے کا دشوار کن کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ انھوں نے اس کتاب کے ٹائٹل 'لہولہو دھنک' پر بھی روشنی ڈالی اور حاضرین کے روبرو اس کا مطلب بھی بڑے ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا۔

ممبر آف پارلیمنٹ ایڈوکیٹ عبدالمجید میمن نے اس موقع پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ شعری مجموعہ اردو ادب میں اہم اضافہ ہی نہیں بلکہ اردو داں طبقے کو غزل در غزل جیسے نئے تجربے سے روشناس کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ اپنے صدارتی خطبہ میں مفتی عتیق الرحمٰن نے مرحوم صابر زاہد کے مجموعہ کلام کی اشاعت پر اہالیان جلگاؤں سمیت ان کے اہل خانہ کو مبارکباد پیش کی اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا کی کہ خداوند کریم اس مجموعہ کلام کو مرحوم صابر زاہد کی مغفرت کا ذریعہ بنائے۔ (آمین)

رسم رونمائی کی اس تقریب میں ڈاکٹر عبدالکریم سالار نے اقرا ایجوکیشن سوسائٹی اور الفیض فاؤنڈیشن، جلگاؤں کی جانب سے 50 کتابیں نیز عبدالغفار ملک نے عبدالرزاق ملک ٹرسٹ اور انجمن تعلیم المسلمین، جلگاؤں کی جانب سے 50 کتابیں خریدنے کا اعلان کیا نیز مجید سیٹھ زکریا نے بھی 25 کتابیں خریدنے کا اعلان کیا۔

پریس ریلیز: ارتکاز صابر، جلگاؤں، 20 اپریل 2018

وفیات:

پنڈت رام ناتھ شرمارمن

امروہہ: شہر امروہہ کی گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کی نمائندہ تنظیم ادبی سنگم کے بانی پنڈت رام ناتھ شرمارمن کا ہلدوانی میں 79 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کا تعلق امروہہ کے محلّہ چوک کے ایک تہذیب یافتہ خاندان سے تھا اور بادشاہ پور انٹر کالج میں بطور آرٹ ٹیچر ملازمت کی۔ سبکدوش ہونے کے بعد وہ ہلدوانی میں قیام پذیر تھے۔ 2007 میں ان کا مجموعہ کلام 'صدائے دل' منظرعام پر آیا تھا جس کا اجرا ہندوستان کی مشہور شخصیات پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی اور ڈاکٹر عظیم امروہوی کے دست مبارک سے عمل میں آیا تھا۔ مرحوم غزل کے علاوہ نعت ومنقبت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ تقریباً 20 سال قبل انھوں نے امروہہ کی ادبی شخصیات کی مدد سے 'ادبی سنگم' کی تشکیل کی تھی اور کئی سال تک اس کے صدر بھی رہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 اپریل 2018

حیدر طباطبائی

فرینکفرٹ: پاکستان کے روزنامہ 'جنگ' کی ویب سائٹ پر دی گئی ایک اطلاع کے مطابق اردو ادب کے

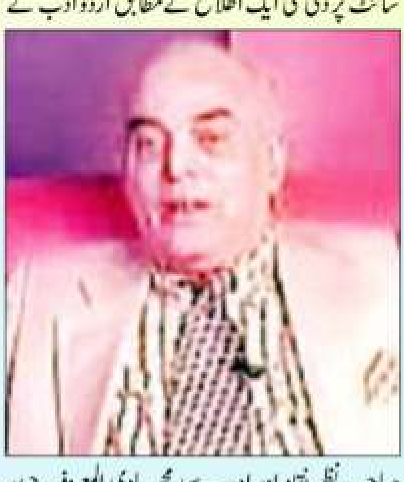

صاحب نظر نقاد اور ادیب سید محمد ہادی المعروف حیدر طباطبائی کا لندن میں انتقال ہوگیا۔ حیدر طباطبائی ترقی پسند دانشوروں کی اگلی صف میں سے تھے۔ آپ کی ذہانت، اردو ادب سے گہری وابستگی نے کئی نسلوں کے ذہن کو سنوارنے میں اہم کردار کیا۔ حیدر طباطبائی کی قد آور شخصیت اردو ادب میں بے مثال تھی۔ حیدر طباطبائی مرحوم نے 'آئین سخنوری' جیسی بے مثال کتاب اور 'شہرزاد' جیسے ادبی جریدے سے اردو ادب کو نوازا، آپ کی ادبی کاوشوں نے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ حیدر طباطبائی کا لکھنؤ کے ایک علمی اور ادبی خانوادے سے تعلق تھا۔ وہ 1974 میں ترک وطن کر کے لندن چلے گئے تھے اور بعد میں انھوں نے انگلینڈ کی شہریت بھی حاصل کر لی تھی۔ حیدر طباطبائی اپنی بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور ادبی گفتگو کی وجہ سے اردو کے حلقوں میں بہت مشہور تھے۔ ان کے غم کی خبر ملنے کے بعد ہندوستان کے ادبی حلقوں میں بھی غم واندوہ کی لہر چھاگئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اپریل 2018

پروفیسر داؤد کشمیری

ممبئی: معروف ادیب، مدرس، تنقید نگار اور مقالہ نگار پروفیسر داؤد کشمیری کا 16 اپریل کو نصف شب کے بعد جنوبی ممبئی کے ایک مقامی صابوصدیق اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی خواہش کے مطابق بعد نماز فجر جنوب وسطی ممبئی کے ناریل واڑی قبرستان میں انھیں سپرد خاک کردیا گیا۔ ان کے پسماندان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ مرحوم داؤد کشمیری کے آبا و اجداد کا تعلق ریاست جموں وکشمیر سے رہا، لیکن آزادی سے قبل ان کے دادا نے میدانی علاقے پنجاب کا رخ کیا اور پھر ان کے والد ممبئی چلے آئے، 1960 کے عشرے میں داؤد کشمیری نے درس و تدریس شروع کی اور مہاراشٹر ودربھ کے امراوتی شہر میں معلم بن گئے۔ ممبئی میں جنوبی ممبئی کے مسلم داؤدی بوہرہ فرقے کے برہانی کالج میں خدمات انجام دیں اور اداکار منوج کمار کے مکالمے اور اسکرپٹ بھی تیار کرتے رہے۔ داؤد کشمیری کی حیات اور ادبی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ ایک تحقیقی مقالہ برائے ایم فل مقالہ نگار ثوبیہ قمرالزماں انصاری نے پروفیسر صاحب علی کی نگرانی میں مکمل کیا۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 17 اپریل 2018

انجم جونپوری

جونپور: ہندوستان کے مشہور شاعروں میں سے ایک انجم جونپوری طویل علالت کے بعد 17 اپریل کو انتقال کرگئے۔ واضح رہے کہ شہر کے اجمیری محلّہ کے رہنے والے مفتی مہندی حیدر عرف انجم نے شاعری کی دنیا میں 1972 میں باندہ شہر میں منعقد آل انڈیا مشاعرے میں اپنی غزل پڑھی تھی۔ ان کے اشعار کتنے اثر انداز تھے۔ ایک کے بعد 100 سے زائد ملک و بیرون ملک کے مشاعروں میں اپنی موجودگی درج کرائی۔ انھوں نے

اپنے استاد کیف بھوپالی سے شاعری کی سیکھ لی تھی۔ اس دوران فراق گورکھپوری، علی سردار جعفری، وامق جونپوری، خمار بارہ بنکی اور کیفی اعظمی جیسے شاعروں سے ان کے تعلقات تھے۔ انجم جونپوری کے دادا مفتی خان بہادر حیدر حسین 1913 سے 1938 تک شہر کے بلدیہ کونسل اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین رہے۔ ان کے بیٹے مفتی الطاف حیدر ٹرانسپورٹ محکمہ میں ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر تعینات تھے۔ 1971 میں خود انجم جونپوری ٹرانسپورٹ محکمہ میں ٹیکنیشین کے عہدے پر تعینات ہوئے تھے اور پوروانچل کے کئی اضلاع میں انھوں نے اپنی خدمات پیش کیں لیکن شاعری سے ان کا تعلق اتنا گہرا تھا کہ انھوں نے 2002 میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور صرف اردو شاعری کے لیے ہی مکمل وقت دینے لگے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اپریل 2008

سعید انجم

نئی دھلی: یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا کے اردو صحافی سعید انجم کا 23 اپریل کو انتقال ہوگیا۔ وہ 43 برس کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ مرحوم کو کینسر کا مرض لاحق تھا۔ دوپہر میں ایک بجے مرحوم نے داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے اہل خانہ کے ساتھ ان تمام احباب کو الوداع کہا جن سے وہ بے پناہ محبت کرتے تھے۔ تدفین کے لیے جسد خاکی ان کے آبائی وطن لے جایا گیا۔ سعید انجم 1975 میں بہار کے مردم خیز علاقے ارریا میں 29 مارچ کو پیدا ہوئے تھے۔ گریجویشن کے بعد 2000 میں 23 نومبر کو وہ یو این آئی کی اردو سروس سے وابستہ ہوئے اور آخر دم تک ادارے کی خبر نگاری کے شعبے کو اپنی خدمات سے نوازتے رہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 24 اپریل 2018

مدیحہ گوہر

لاہور: اسٹیج اور ٹی وی کی معروف فنکارہ اور حقوق انسانی کی سرگرم کارکن مدیحہ گوہر کا 25 اپریل کو لاہور میں انتقال

ہوگیا۔ وہ پچھلے تین برس سے سرطان سے نبرد آزما تھیں۔ 1956 میں پیدا ہونے والی مدیحہ گوہر کی پرورش ایک علمی اور ادبی ماحول میں ہوئی۔ ان کی والدہ خدیجہ گوہر خود بھی قلم کار تھیں۔ ان کے ناول "The Coming Season'd yield" کا اردو ترجمہ 'امیدوں کی فصل' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مدیحہ کی بہن فریال گوہر ادب، آرٹ اور کلچر میں اپنا خاص مقام رکھتی ہیں اور شوہر شاہد محمود ندیم پاکستانی میڈیا کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ مدیحہ نے 1978 میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا، پھر مزید تعلیم کے لیے لندن چلی گئیں اور یونیورسٹی آف لندن سے تھیٹر کے فن میں ماسٹرز کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اپریل 2018

فضیل جعفری

ممبئی: اردو کے ممتاز جدید نقاد و ادیب، شاعر اور صحافی پروفیسر فضیل جعفری 30 اپریل کو انتقال کر گئے۔ وہ 81 برس

کے تھے۔ پروفیسر فضیل جعفری 22 جولائی 1936 کو الہ آباد کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنا تدریسی کام اورنگ آباد سے شروع کیا اور کوئی دس برس وہاں پڑھایا پھر 1970 میں وہ برہانی کالج (ممبئی) سے وابستہ ہوئے۔ وہ دوبارہ مشہور روزنامہ انقلاب (ممبئی) کے مدیر بنے اور کچھ مدت وہ بطور ایڈیٹر ہفت روزہ بلٹز (اردو) سے بھی متعلق رہے۔ موصوف انگریزی کے ایک میگزین 'ون انڈیا ون پیپلز' کے ایڈیٹر کے طور پر بھی کام کر چکے ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے چٹان اور پانی، افسوس حاصل کا، کمان اور زخم، صحرا میں لفظ اور رنگ شکستہ شائع ہو چکے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 مئی 2018

خراج عقیدت:

سلیم عنایتی کے لیے تعزیتی نشست

کانپور: کانپور کی ادبی و سماجی شخصیت مشہور رضا خاں جو سلیم عنایتی کے نام سے معروف تھے ان کا گذشتہ 29 اپریل کو اچانک انتقال ہوگیا۔ ان کے قابل قدر ان فراموش کردہ ادبی و سماجی معاملات کے اعتراف میں ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ادارہ علم و فن ماہنامہ خرام، ادبی منچ اور روی مسیح فاؤنڈیشن کی جانب سے جلسہ تعزیت کا انجمن مسلم یتیم خانہ کے کانفرنس ہال میں انعقاد کیا گیا جس کی صدارت سلیم عنایتی کے دیرینہ رفیق سبھاش تینجا نے فرمائی۔ سید ابوالحسنات حقی صاحب نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ سلیم عنایتی ہم میں سے ایک تھے لیکن ہم میں سے ایک الگ شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ان اخلاقی اقدار کے پاسدار اور امین تھے جو اب ہمارے بیچ سے ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ دوسروں کی خوشی کے لیے تکلیف برداشت کر سکتے تھے لیکن حرف شکایت زبان پر لانا خلاف شرافت سمجھتے تھے۔ مولانا قاسم حبیبی نے کہا کہ جو دنیا میں آیا ہے اسے جانا ہے لیکن سلیم عنایتی ان لوگوں میں سے تھے جو ذہن و دل میں بسے رہتے تھے۔ اخلاق حسین چشتی نے کہا کہ سلیم عنایتی کانپور کی ادبی، سماجی اور ثقافتی محفلوں میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ زبیر احمد فاروقی نے کہا کہ میری ایک چھوٹی سی شکایت پر انھوں نے تذکرہ شعرائے کانپور کی تالیف کی جس کے لیے سلیم عنایتی ادبی دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یاد کیے جائیں گے۔ ان سے ان کی شخصیت کے اس پہلو کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے چھوٹوں کے لیے کتنا جذبۂ احترام رکھتے تھے۔ رام پور سے تشریف لائے سلیم عنایتی کے چھوٹے بھائی مکرم عنایتی نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ اس موقعے پر دوسرے شرکا نے تعزیتی اظہار پیش کیا۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 6 مئی 2018

سید سجاد حیدر یلدرم کا 75 واں یوم وفات

علی گڑھ: سید سجاد حیدر یلدرم کے 75ویں یوم وفات کے موقعے پر پروفیسر صغیر افراہیم صدر شعبۂ اردو اے ایم یو نے ان کے فن و شخصیت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ سید سجاد حیدر یلدرم کی ولادت 1880 میں کانڈیر ضلع جھانسی میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام خان بہادر سید جلال الدین حیدر تھا۔ انھوں نے 1892 میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کی نویں جماعت میں داخلہ لیا۔ وہ نومبر 1898 میں اسٹوڈنٹ یونین کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ 15 مئی 1900 کو انھوں نے علی گڑھ میں انجمن اردوئے معلی قائم کی اور اس کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے۔ 1901 میں انھوں نے ایم اے او کالج سے امتیازی نمبروں سے بی اے کیا اور ایل ایل بی میں داخلہ لیا۔ 1910 میں ایم اے او کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر منتخب ہوئے۔ 26 مارچ 1921 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار ہوئے اور آٹھ سال تک اس عہدے پر کام کرتے رہنے کے بعد 13 جنوری 1929 کو اس عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ ساتھ ہی شعبۂ اردو اے ایم یو کے اعزازی صدر شعبہ بھی رہے۔ ان کی شادی سید نذر الباقر کی صاحب زادی نذر زہرا بیگم سے ہوئی۔ ان کے یہاں 20 جنوری 1926 کو ایک بیٹی کی ولادت ہوئی جو اردو ادب کی ایک بڑی فکشن نگار قرۃ العین حیدر کے نام سے پہچانی گئیں۔ سید سجاد حیدر یلدرم کی وفات 12 اپریل 1943 میں لکھنؤ میں ہوئی۔ سجاد حیدر یلدرم نے افسانوی ادب کے رائج فنی اور فکری ضابطوں سے کسی قدر الگ ہٹ کر اردو افسانے کی راہ نکالی۔ افسانے کی یہ نئی راہ بڑی حد تک ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں سے مبرا دلی جذبات، کیفیات اور احساسات کی ترجمان بنی۔ وہ اپنے مسرور کن افسانوں کے ذریعے مرد اور عورت کو سماج میں ایسی محبت کا حق دلانا چاہتے تھے جو فطری ہونے کے ساتھ ساتھ رسم و رواج کے بندھنوں سے آزاد ہو۔ ان کی خاص بات یہ ہے کہ وہ ترکی زبان کی نفاست، کشش، شیرینی اور خیالات کی رعنائی کو بہت پسند کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہی شادابی اور وارفتگی اردو زبان میں بھی پیدا ہو جائے تاکہ اس کا حسن ایک نئے اسلوب کے اضافے

سے اور بھی نکھر سکے۔ ان کا پہلا انشائیہ نما افسانہ 'مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ' انگریزی افسانے کا ترجمہ ہے جو 1900 میں ماہنامہ 'معارف' میں شائع ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اپریل 2018

منیر نیازی

امروھه: بزمِ زندہ دلانِ امروہہ کی جانب سے مشہور و معروف شاعر منیر نیازی کے یومِ ولادت پر میٹنگ کا انعقاد دفتر محلہ ترپولیہ میں کیا گیا جس کی صدارت تنظیم کے سرپرست ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے اور نظامت سید شیبان قادری نے کی۔ اس موقعے پر منیر نیازی کے فن پر گفتگو کی گئی اور انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ منیر نیازی 9 اپریل 1926 کو ہندوستان کے ضلع ہوشیار پور پنجاب میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور وہاں وہ کئی اخبارات و ریڈیو اور بعد میں ٹیلی ویژن سے وابستہ رہے۔ انھیں بہت جد وجہد بھری زندگی گزارنی پڑی۔ 26 دسمبر 2006 کو لاہور میں اس البیلے شاعر کا انتقال ہوگیا۔ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ اردو میں ان کے نصف درجن شعری مجموعے شائع ہوئے جن میں تیز ہوا، تنہا پھول، جنگل میں دھنک، دشمنوں کے درمیان شام، سفید دن کی ہوا، سیاہ شب کا سمندر، ماہ منیر، چھ رنگین دروازے وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کلیات منیر کی بھی اشاعت ہوئی جس میں ان کا مکمل کلام شامل ہے۔ پنجابی میں بھی ان کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے تھے۔ منیر کے لب ولہجے میں کڑواہٹ ضرور ہے لیکن وہ سب کچھ شعری پیرائے میں بیان کردیتے ہیں اور کچھ بھی نہیں چھپاتے۔ شاید انھیں چھپانا آتا بھی نہیں۔ ڈاکٹر ناصر امروہوی نے کہا کہ منیر نیازی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کے یہاں احتجاج کی آواز بہت بلند ہے۔ اس کے علاوہ ان کی آواز اپنے ہم عصروں میں سب سے الگ، سب سے جدا اور سب سے منفرد ہے جسے سیکڑوں صداؤں کے درمیان بھی پہچانا جاسکتا ہے کیونکہ ان کی لفظیات سب سے جدا ہیں۔ سید شیبان قادری نے کہا کہ منیر نیازی سرتاپا شاعر تھے۔ وہ صاحب اسلوب تھے، ہزاروں شاعروں کی بھیڑ میں ان کا کلام پہچانا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 12 اپریل 2018

■

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر .... بتاریخ ....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام: ....

پتہ: ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

سماجی تحقیق
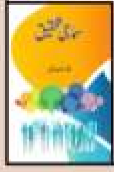
مصنفہ: عذرا عابدی
صفحات: 490
قیمت: 215 روپے

تاریخ ابنِ خلدون (جلد دوم)

مصنف: عبدالرحمٰن ابن خلدون
مترجم: حکیم احمد حسین عثمان الہ آبادی
مرتب: محمد صہیب
صفحات: 357، قیمت: 180 روپے

فلکیاتی بستہ

مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 73
قیمت: 65 روپے

اصلاح الاصلاح

مصنف: ابراحسنی گنوری
مقدمہ: شمس رمزی
صفحات: 129
قیمت: 85 روپے

تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات
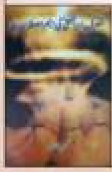
مصنف: شمیم طارق
صفحات: 411
قیمت: 185 روپے

خلا میں ہندوستانی پروگرام کی جھلکیاں

مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 50
قیمت: 50 روپے

جتنے دور اتنے پاس
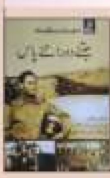
مصنف: دھیریندر سنگھ جفا
صفحات: 289
قیمت: 140 روپے

انتخابِ سخن (جلد سوم) سلسلۂ مومن

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 326
قیمت: 155 روپے

محمود ایاز کی تحریریں

مرتب: اکرم نقاش
صفحات: 619
قیمت: 275 روپے

شب خون کا توضیحی اشاریہ (جلد اول و دوم)
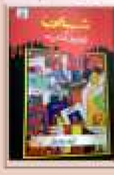
مرتب: انیس صدیقی
صفحات: 1374 مکمل سیٹ
قیمت: 580 روپے مکمل سیٹ

کلیات ماجدی (شخصیت) جلد چہارم

ترتیب و تدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی
صفحات: 527
قیمت: 230 روپے

عروجِ فن کلیات خلیل الرحمٰن اعظمی
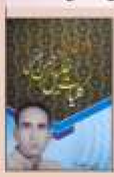
مرتب: ہما مرزا
صفحات: 260
قیمت: 145 روپے

صرف تمھارے لیے

مصنف: ڈاکٹر سمتیندر رانا ڈگ
مترجم: ماہر منصور
صفحات: 139
قیمت: 85 روپے

دنیائے افسانہ

مصنف: محمد عبدالقادر سروری
صفحات: 131
قیمت: 85 روپے

مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات

مصنف: محمد حسن
صفحات: 373
قیمت: 168 روپے

کلیاتِ بانی

مرتب: پروفیسر گوبند پرشاد
صفحات: 383
قیمت: 180 روپے

انتخابِ سخن (جلد دوم) سلسلۂ ذوق

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 321
قیمت: 155 روپے

شاعری کی تنقید

مصنف: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 327
قیمت: 155 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/05/2018**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, June-2018, Vol.20, Issue:06
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیشکش

خاکہ پر ایک دستاویزی شمارہ جس میں خاکہ کے فن اور روایت، اردو کے اہم اور نمائندہ خاکہ نگاروں
پر مضامین کے علاوہ رفتگاں اور قائماں پر اہم ادبی خاکے بھی شائع کیے گیے ہیں۔

صفحات: 422 قیمت: 50 روپے

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025